معاشرتی علوم

برائے سی۔ٹی کلاسز

ناشر

ایس۔ایس۔پبلیکیشنز۔ ۳۸۔ اُردو بازار۔ لاہور

برائے

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ۔ لاہور

امانت دیانت صداقت شرافت
پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور

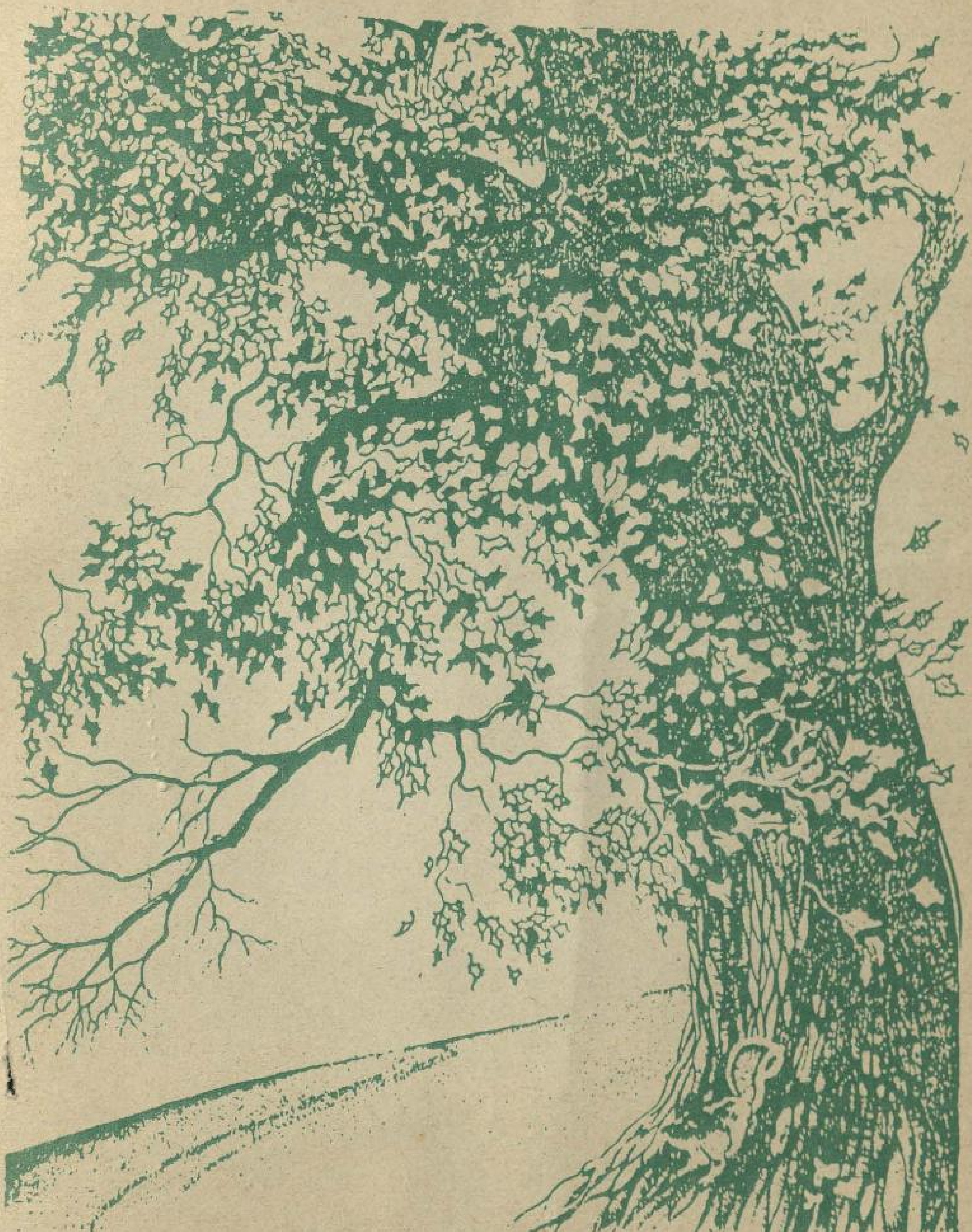

درخت ہماری شان ہیں   پاکستان کی آن ہیں

تدریسِ
معاشرتی عُلوم

برائے

سی۔ٹی کلاس

ناشر

ایس۔ ایس۔ پبلیکیشنز۔ ۲۸۔ اُردو بازار۔ لاہور

برائے

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ۰ لاہور

جُملہ حقوق بحق پنجاب ٹیکسٹ بُک بورڈ لاہور محفوظ ہیں

تیار کردہ :- پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ — لاہور

نظرِثانی شدہ قومی ریویو کمیٹی، وفاقی وزارت تعلیم (شعبۂ نصاب) حکومت پاکستان
اسلام آباد

مصنفین
ڈاکٹر محمد اقبال ظفر
ڈاکٹر خواجہ نذیر احمد
ڈاکٹر مشتاق احمد گورایا
ملک امیر الدین احسن

نگران
مسعود صدیقی
سینئر ماہر مضمون پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور

ناشر : خلیفہ عبدالمجید بھٹی

مطبع : جیم پرنٹرز، تھارنٹن روڈ۔ لاہور

ناشر:- ایس۔ ایس۔ پبلیکیشنز۔ ۳۸۔ اُردو بازار۔ لاہور

فہرست مضامین

پہلا باب ۱

تربیتی اداروں کے ماحول کی اسلام سے ہم آہنگی

دوسرا باب ۹

ضابطہ اخلاق برائے اساتذہ

(حصہ اول)

تیسرا باب ۱۶

برصغیر میں اشاعت اسلام

چوتھا باب ۳۴

برصغیر میں برطانوی نوآبادیاتی نظام

پانچواں باب ۴۳

تحریک پاکستان

چھٹا باب ۶۶

پاکستان میں تمدنی زندگی

ساتواں باب ۱۰۱

برصغیر پاک و ہند

آٹھواں باب ۱۲۳

اسلامی معاشرہ

(ب)

نواں باب

تائڈین بیداری و آزادی ملت اسلامیہ ۱۳۲

دسواں باب

عالم اسلام ۱۴۸

گیارھواں باب

بین‌الاقوامی تنازعات ۱۵۳

(حصہ دوم)

پہلا باب

معاشرتی علوم کی تعریف ، وسعت اور توضیحات ۱۶۹

دوسرا باب

مقاصد تدریس معاشرتی علوم ۱۷۹

تیسرا باب

طریقہ ہائے تدریس معاشرتی علوم ۱۸۷

چوتھا باب

سبقی خاکے ۲۴۶

پانچواں باب

اکتسابی جائزہ ۲۶۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا باب

تربیتی اداروں کے ماحول کی اسلام سے ہم آہنگی

تعلیم و تربیت ایک عمدہ اور مہذب ماحول میں ہی ممکن ہو سکتی ہے ۔ کیونکہ تربیت کا انحصار ماحول کی نوعیت پر ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض افراد ماحول سے زیادہ اثر قبول کرتے ہیں ۔ اور بعض کم ۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں ارشاد فرمایا ہے ”ہر نومولود فطرت سلیم لے کر پیدا ہوتا ہے، مگر اُس کے والدین اُسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں“۔ ماحول کی اثر پذیری پر اِس سے عمدہ مثال اور کیا دی جا سکتی ہے ۔

ہر نظریاتی قوم اپنے افراد کو اپنے نظریہ سے آگاہ کرنے کی آرزومند ہوتی ہے ۔ ایک نظریاتی مملکت میں ایسی تعلیم، جس کی اساس ہی کوئی نہ ہو ممکن ہی نہیں ۔ اسلام میں نظریاتی تعلیم کی اہمیت کا اندازہ اِس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جونہی کوئی مسلمان بچہ پیدا ہوتا ہے تو پہلا کلمہ جس سے اُس کے کان آشنا ہوتے ہیں وہ خداوند تعالیٰ کی کبریائی کا اعلان (اذان) ہے ۔ جس دین میں نومولود کے لیے نظریاتی تبلیغ کا یہ انداز ہو، اس قوم کے معلمین اور زیر تربیت افراد کی اسلامی تعلیم و تربیت کی ضرورت و اہمیت ظاہر ہے ۔

اساتذہ کے تربیتی ادارے وہ تربیت گاہیں ہیں جو نظریاتی تعلیم کے ضمن میں اہم مراکز کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ ان اداروں کو اسلامی تعلیمات اور قومی نظریۂ حیات کی جیتی جاگتی تصویر ہونا چاہیے ۔ کیونکہ اِسلام میں تعلیم محض فراہمیٔ معلومات سے عبارت نہیں، بلکہ اس میں تربیت بھی شامل ہے ۔ جسے کردار سازی یا سیرت سازی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ گویا زیر تربیت اساتذہ اپنے آپ کو صرف افکار و معلومات تک ہی محدود نہ رکھیں بلکہ اسلامی اخلاق و اعمال اور ایمان و ایقان کا بھی حامل بنائیں ۔

تربیتی اداروں کی تنظیمی ہیئت دوسرے تعلیمی اداروں سے زیادہ مختلف نہیں ہوتی ۔ البتہ تدریسی و تربیتی اعتبار سے ان اداروں کا اپنا الگ تشخص ہوتا ہے ۔ یہ تشخص جن عناصر یا عوامل سے تشکیل پاتا ہے ان میں سربراہ ادارہ، نصاب، اساتذہ، طلبا، مسجد، کتب خانہ اور متعدد تربیتی و اداراتی سرگرمیاں شامل ہیں ۔ تنظیمی ہیئت و ساخت میں مناسب رد و بدل کے ساتھ ساتھ تمام تر پروگراموں کی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تعمیر و تشکیل نا گزیر ہے ۔ معمولی سی تراش خراش یا محض عربی و اِسلامیات کے مضمون کے اضافے سے صورت حال میں مؤثر تبدیلی کی توقع عبث ہے ۔ ان مذکورہ بالا عوامل کی توضیح و

تشریح نیچے ملاحظہ فرمائیے ۔

۱۔ سربراہ ادارہ :

ادارے کے سربراہ کی حیثیت اس کے سرپرست کی سی ہوتی ہے ۔ اساتذہ و طلبا اس کے معاون ہوتے ہیں ۔ اگر سربراہ ایک علم دوست ، منتظم ، اسلامی نظریات کا حامل اور صاحب کردار ہوگا تو سارا ماحول علمی، عملی و دینی لحاظ سے پاکیزہ اور ارفع شکل اختیار کرے گا ۔ بصورت دیگر تلامذہ گونا گوں علمی، اخلاق اور عملی مصائب کا شکار ہوکر رہ جائیں گے ۔

سربراہ کے تقرر میں تقدم (seniority) اور انتظامی صلاحیت کو پیش نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے ماضی کا اخلاق ، علمی اور تعلیمی پس منظر نگاہ میں رکھا جائے ۔ اور یہ دیکھا جائے کہ آیا وہ صاحب سیرت و کردار اور علم دوست بھی ہے یا نہیں ۔ اور مزید یہ کہ ایک نظریاتی مملکت میں ایک سربراہ کے لیے ایمان و ایقان کی جس کیفیت سے سرشار ہونا ضروری ہے وہ اس سے کہاں تک بہرہ ور ہے ۔ نیز یہ کہ اسلامی علوم کے سلسلے میں اس کا مبلغ علم کیا ہے ۔

گویا سربراہ کے لیے معیار انتخاب، علم دوستی، اسلامی سیرت و کردار، وطن دوستی اور انتظامی قابلیت قرار پانا، یعنی وہ ایک صحیح مسلمان اور سچا پاکستانی ہو ۔ ایسے سربراہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ گاہے نماز کی امامت کا منصب سنبھالنے میں بھی عار محسوس نہ کرے ۔ یہ طرز عمل اساتذہ و طلبا میں نماز کا شوق فروزاں کرے گا ۔

۲۔ نصاب :

نصاب وہ شاہراہ ہے جس پر چل کر طالب علم اپنی منزل مقصود تک پہنچتا ہے ۔ یہی وہ محور ہے، جس کے گردا گرد اساتذہ و طلبا کا تمام تر تعلیمی عمل رواں دواں رہتا ہے ۔ بلاشبہ نصاب عمل میں مرکز و مدار کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ نظریاتی فضا کے بناؤ بگاڑ میں اہم کردار ادا کرتا ہے ۔ قومی نظریۂ حیات اور اسلام کی اخلاق تعلیمات کی روشنی میں مدون کیا جانے والا نصاب زیر تربیت افراد کی درستگی و اصلاح کا باعث بنے گا ۔ اور ان امور سے صرف نظر کرکے تشکیل دیا جانے والا نصاب بگاڑ پر منتج ہوگا ۔ بظاہر علوم و فنون بڑے معصوم اور راست باز نظر آتے ہیں، مگر جب ماہرین ان کے حقائق علمیہ کی تشریح و تعبیر کرنے لگتے ہیں تو ان کی ساری معصومیت ختم ہوکر رہ جاتی ہے ۔ اور یہ ایک یا دوسرے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرنے لگتے ہیں ۔ آج کل جدید علوم یورپ اور امریکہ اور روس و چین کے نقطۂ نظر کے مبلغ بنے ہوئے ہیں ۔ اسلام حقائق علمیہ کا دوست ہے، مگر وہ اس وجدانی سانچے کا دشمن ہے جس میں حقائق علمیہ کی اصلی صورت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے ۔ گویا اسلام غیراسلامی انداز فکر و نظر کو مستحسن نہیں سمجھتا ۔ بلکہ ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے ۔

اسلام کا اپنا مرکزی تصور، مخصوص نظریۂ حیات اور خاص زاویۂ فکر و نظر ہے ۔ وہ اپنا مخصوص

وجدانی سانچہ رکھتا ہے اور ہر علم و فن کو اسی سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھنا پسند کرتا ہے ۔ اس بارے میں وہ بالکل واضح اور دو ٹوک بات کرنے کا قائل ہے ۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ سراپا حق اور مکمل خیر و برکت ہے ۔ باقی سب نقطہ ہائے نظر سہو و خطا اور ضرر کے امکان سے خالی نہیں ۔ اور بعض تو بالکل اس کی عین ضد واقع ہوئے ہیں ۔ اس لیے اسلام کا تقاضا ہے کہ جملہ علوم و فنون کو تعلیمات الہیہ کے انوار سے منور کیا جائے ۔ حقیقت یہ ہے کہ خدائے ذوالجلال کے رنگ و نور سے بڑھ کر اور کوئی رنگ بہتر نہیں ہو سکتا ۔ " صبغة الله ومن احسن من الله صبغة " (القرآن)

اب سوال یہ ہے کہ نصاب کو اسلامی تعلیمات سے کیسے ہم آہنگ کیا جائے ۔ اس سلسلے میں بعض حقائق کا پیش نظر رکھنا مفید ہے ۔

١- جملہ علوم و فنون کو اسلامی خطوط پر استوار کیا جا سکتا ہے ۔ ان میں سے بعض کو اسلامی تشکل دینے میں ذرا دقت کا سامنا کرنا پڑے گا اور بعض بآسانی تبدیل کیے جا سکیں گے ۔ مثلاً عمرانی اور لسانیاتی علوم کو اسلامی بنانے کا دائرۂ عمل فطری علوم کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع تر ہے ۔ بقول *سید قطب مرحوم عمرانی علوم اسلام میں بڑی نازک اہمیت کے حامل ہیں، مگر سائنسی اور انسانیاتی علوم بھی کم اہم نہیں ۔ البتہ نوعیت کے لحاظ سے انہیں کم و بیش اسلامی تعلیم کے مطابق بنانے کی کوشش کی جائے گی ۔

٢- مضامین کو اسلامی بنانے کے متعدد انداز اور مختلف طریقہ ہائے کار ہیں، جو بعض مضامین کے لیے زیادہ موزوں ہیں اور بعض کے لیے کم ۔ حوالہ دینا ، پس منظر دکھانا ، باہمی ربط (correlation) اور تکمل (integration) مقابلہ و موازنہ تلخیص (inference) اور اطلاق (application) وغیرہ کئی تدابیر استعمال کی جا سکتی ہیں ۔

٣- موضوع اور مواد کو اسلامی رنگ دینا زیادہ تر اُستاد کا کام ہے ۔ اگر معلم کا اپنا رویہ حکیمانہ اور ہمدردانہ نہ ہو تو خالص اسلامی موضوع بھی بے اثر اور بے نتیجہ ہو سکتا ہے ۔ اصل صورت حال اُستاد کے ہاتھ میں ہے، جسے وہ موقع محل کی مناسبت سے حسب مقصد مؤثر طور پر استعمال کر سکتا ہے ۔

٤- مختلف مضامین کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کی کئی منازل ہیں ۔ بعض مضامین کا ڈھانچہ (framework) مکمل طور پر اسلامی تعلیمات کے مطابق تیار کرنا ہوگا اور اس کے تمام بنیادی تصورات و قیاسات (assumptions) اسلامی ہوں گے ۔ بعض مضامین میں اسلامی تصورات دیگر تصورات کے ساتھ ساتھ پیش کرنے ہوں گے ۔ اور ملخص تیار کرنے کے مرحلے میں احساسات اور نظریات کا خیال رکھا جائے گا ۔ گویا کہیں معمولی سی ترمیم، کہیں اضافہ اور کہیں بنیادی تبدیلی سے کام لیا جائے گا ۔ گویا

* مصر کے عظیم عالم اور دانشور ۔

سارا انداز بدلنا ہوگا ۔ مثلاً جدید علوم و فنون انسان کو بطور "حیوان" پیش کرنے پر فخر محسوس کرتے ہیں حالانکہ قرآن حکیم بنی آدم کو معزز و مکرم انسان کی حیثیت سے پیش کرتا ہے ۔ انسان اور حیوان میں ظاہر مماثلتوں کے پیچھے شاہ ولی اللہ رحمت اللہ علیہ کی طرح بنیادی امتیازات کا پتہ لگانا معلم اور مصنف کتاب کا کام ہے ۔

متذکرہ بالا غور طلب امور اور حقائق کے ساتھ ساتھ نصابات کو اسلام کی تعلیمات کے مطابق بنانے کے لیے کچھ عمومی اصول بھی مد نظر رکھے جائیں ۔ یہ اصول ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں ۔

عمومی اصول

۱۔ علوم و فنون کا نقطۂ آغاز اسلامی ہو نہ کہ مغربی ۔ مغربی سائنس اپنی ابتدا مادے سے کرتی ہے اور اسے خدا کا درجہ دے دیتی ہے جب کہ اسلام میں مادہ خدا کی تخلیق اور اس کی قدرت کی علامت ہے ۔

۲۔ علوم و فنون کو تعلیم ، اسلام کی اس کے بنیادی اصولوں اور عقیدوں کے حوالے سے پیش کیا جائے ۔ مثلاً توحید ، رسالت ، آخرت ، وحدت آدم ، حق و باطل کے اسلامی تصورات کو اجاگر کرکے موزوں زیر بحث پر نظر ڈالی جائے جہاں کہیں تضاد نظر آئے اسے رفع کیا جائے ۔

۳۔ ہر علم و فن کا ایک فکری ڈھانچہ ہوتا ہے جس میں کچھ اساسی تصورات، قیاسات اور عقلی و روحانی روئیے شامل ہوتے ہیں جن کا اسلامی تعلیمات کے مطابق ہونا ضروری ہے ۔

۴۔ علوم و فنون کے پس منظر میں مسلمان علماء و فضلاء کے علمی و سائنسی کارناموں کو شامل کیا جائے ۔ تاکہ قوم کے نوجوان اپنے ثقافتی ورثے سے آشنا ہوں اور ان میں ملی تشخص اور قومی اعتماد کے مثبت جذبات ابھر سکیں ۔

یہ ہیں چند عمومی اصول جنھیں اپنائے بغیر نصابات کو اسلامی نہیں بنایا جا سکتا ۔ وہ نفسیات ہو یا فلسفہ نظم و نسق ہو یا سائنس ہو ، تاریخ ہو یا دینیات ان تمام میں اسلام کا نقطۂ نظر جھلکنا چاہیے ۔ یہ کام خاصا مشکل ہے اور مہارت طلب بھی مگر اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ۔

۳۔ اساتذہ :

استاد کو تعلیم و تربیت میں بڑا اہم مقام حاصل ہے ۔ استاد طالب علم کے لیے مثالی حیثیت رکھتا ہے ۔ اگر یہ اسلامی سیرت کا عکاس ہوگا تو تعلیمی ماحول کو اسلام کی ضیا پاشیوں سے منور کرنے میں کامیاب ہوگا ۔ بصورت دیگر بہتر نتائج کی توقع رکھنا عبث ہے ۔

پہلی ضروری بات یہ ہے کہ تربیتی اداروں کے لیے ایسے اساتذہ بھرتی کیے جائیں جو پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ ساتھ اسلامی ذوق اور اسلامی کردار کے حامی ہوں ۔ جن اصحاب میں یہ پہلو کمزور ہوں انھیں ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں کہ وہ اپنے ذوق اور کردار کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھال سکیں ۔

اساتذہ سے تقاضا کیا جائے کہ اپنے اپنے مضمون کی اسلامی تعلیمات اور اسلامی تصورات کے حوالے سے تنظیم نو کریں ۔ ہر استاد اسباق کی پیش کش میں اسلامی تصورات اور اسلامی نقطۂ نظر کو دیانت داری اور سلیقہ مندی کے ساتھ منعکس کرے ۔ موقع و محل کے مطابق قرآنی آیات ، احادیث ، اسلامی روایات اور علماء اسلام کے اقوال و نظریات پیش کرے ۔ تاریخی پس منظر کے طور پر اپنے مضمون میں ملت اسلامیہ کے علمی کارناموں کا ذکر کیا جائے ۔

شعائر اسلامی کی پابندی بشمول سربراہ ادارہ سب اساتذہ کے لیے لازمی قرار دی جائے ۔ سارا سٹاف نماز باجماعت ادا کرے اسی طرح صیام رمضان کا احترام کیا جائے ۔

اساتذہ کرام کے اخلاق و عادات کا خصوصی خیال رکھا جائے ۔ ان کے آپس کے تعلقات اور طلبا کے ساتھ روابط میں اسلامی اخلاق کی پاسداری کی جائے ۔ اخوت و مروت ، تقویٰ ، طہارت ، فرض شناسی ، دیانت ، امانت اور حسن سلوک میں اعلیٰ اقدار کی تحسین اور حوصلہ افزائی کی جائے ۔

اساتذہ کی مضمون وار سوسائٹیاں قائم ہوں جن میں علمی و ادبی طور تحقیقی مضامین پڑھے جائیں ۔ کوشش کی جائے کہ اسلامی موضوعات کو مؤثر نمائندگی ملے بہرحال جو بھی موضوع ہو اسے اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے اچھے مضامین مرتب کر کے طبع کیے جائیں اور نیشنل بک فاؤنڈیشن ایسے اداروں سے اس سلسلہ میں رابطہ قائم کیا جائے ۔

۴۔ طلبا :

تعلیمی و تربیتی اداروں کے زندہ و متحرک ماحول کی زندہ علامت اس کے طلبا ہیں ان کی اسلامی تربیت پر جتنی زیادہ توجہ دی جائے اتنی ہی کم ہے ۔

طلبا و طالبات کے علم و اخلاق رویہ و کردار کو اسلامی خطوط پر استوار کیا جائے ۔ ان میں اسلامی جذبے کی سچی روح پھونکی جائے اسلامی عقائد راسخ کیے جائیں ۔ ان کا زاویہ فکر و نظر اسلامی بنایا جائے اور یہ استاد کے ذاتی رویے سے ہی زیادہ مؤثر طور پر پیدا کیا جا سکتا ہے ۔

طلبا کو اسلامی ادب (Literature) پڑھنے کے لیے فراہم کیے جائیں اور ان کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی جائے ان میں اتنا اعتماد بھر دیا جائے کہ وہ نجی اور عام محفلوں میں اسلامی تعلیمات پر فخر کیا کریں اور غیر اسلامی افکار و نظریات سے ہرگز مرعوب نہ ہوں، غیروں سے کھلے دل سے استفادہ کریں مگر جھوٹے نقال نہ بنیں ۔ ان کی تخلیقی قوت و فکر کو اجاگر کیا جائے ۔

الغرض ہمارا طالب علم علمی لحاظ سے اسلام کی سچی تصویر بن جائے اور یہ کام مختلف عملی مشاغل کے ذریعے سرانجام دیا جا سکتا ہے ۔

۵۔ مسجد :

مسجد اسلام کا روحانی و معاشرتی مرکز ہے ۔ تعلیمی ادارے میں شاندار مسجد کی موجودگی

لازمی ہے - دراصل مسجد ہی ہماری اجتماعی زندگی کی علامت ہے - ہمیں پھر سے قرون اولیٰ کی طرح مسجد کا مقام بحال کرنا چاہیے -

تعمیر مسجد کے سلسلے میں یہ خیال پیش نظر رکھا جائے کہ اس کا محل وقوع ایسا ہو کہ ادارے کے وابستہ افراد اس سے بخوبی استفادہ کر سکیں -

مسجد کا کردار بڑا اہم ہے یہ تعلیمی ادارے کے پروگرام کو متوازن رکھ کر زیادہ با معنی بنا سکتی ہے - لہذا تعلیمی اداروں کو چاہیے کہ مسجد کا بھرپور استعمال کریں - گاہے بگاہے یہاں محفل ذکر و فکر منعقد کی جائے - قومی تہواروں میں یہیں طلباء طالبات جمع ہو کر تلاوت کلام پاک کریں - روزانہ جتنی نمازیں ممکن ہوں سب مسجد میں اجتماعی طور پر پڑھی جائیں اور مسجد میں بھی گاہے بگاہے متعدین علماء کی تقریروں کا اہتمام کیا جائے - تربیتی اداروں کے ہوسٹلوں میں نماز کا نظام قائم کیا جائے اور اسلامی سرگرمیاں تشکیل دی جائیں -

٦- کتب خانہ :

لائبریری کی حیثیت انجمن فضلاء کی سی ہے - ادارے کے عملے اور طلبا کو اس انجمن سے بہت زیادہ فیض پہنچ سکتا ہے - جس طرح دل تمام جسم کو خون پہنچاتا ہے اسی طرح لائبریری بھی تعلیم و تربیت کے ادارے کے نظام عروق میں خون دوڑاتی ہے -

افسوس یہ ہے کہ ہمارے اداراتی کتب خانے صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں اکثر و بیشتر دینی کتب کے اعتبار سے تشنہ ہوتے ہیں جن میں اسلامی ادب خاص طور پر قرآن حکیم، تفاسیر اور مجموعہ ہائے احادیث اور مسلمانوں کے اہم علمی کارنامے نہ ہونے کے برابر ہیں - اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ لائبریریوں کی اسلامی اور پاکستانی نقطہ نظر سے تنظیم نو کی جائے - آبا و اجداد کے قیمتی علمی سرمایہ کو ان تربیتی اداروں کی رکنیت بنایا جائے قرآن ، حدیث ، تفسیر ، اسلامی قانون اور قدیم اہم اسلامی و ثقافتی سرمائے کے ساتھ ساتھ عصر حاضر میں اسلامی ملکوں خصوصاً مصر ، شام ، ایران ، ترکیہ ، انڈونیشیا ، ملایا ، نائجیریا اور سعودی عرب وغیرہ میں پیدا شدہ علمی لٹریچر کو بھی مناسب مقام دیا جائے - موجودہ صورت میں ہمارے تعلیمی کتب خانے یورپ و امریکہ کے تو نمائندہ کہلاتے ہیں مگر اسلام اور اسلامی ممالک سے ان کا رابطہ بڑا کمزور اور ڈھیلا ڈھالا ہے - اس صورت حال کو درست کرنے کی ضرورت ہے -

لائبریری طلبا و اساتذہ کو علمی غذا دیتی ہے جس قسم کی فکری غذا مہیا کی جائے گی اس قسم کے افکار ان کے دل و دماغ میں جنم لیں گے - کوئی زندہ قوم اپنے جوانوں اور بچوں کو محض غیر اقوام کے افکار و عقائد کے حوالے نہیں کر سکتی - استفادہ کرنا فرض ہے، مگر اپنے دینی افکار اور قومی نظریات کے پس منظر میں اس سے ہٹ کر مغرب کی تقلید مفید ہے اور نہ پسندیدہ -

۷- مشاغل و تحریکات :

مشاغل و تحریکات تعلیمی زندگی کی جان ہیں ۔ اسلامی فضا قائم کرنے میں ان سے کافی مدد لی جا سکتی ہے۔ اسلامی موضوعات پر مقابلے، بحث و مباحثے، ورکشاپس اور کانفرنسیں تربیتی اداروں کا مستقل فیچر ہوں ۔ وقتاً فوقتاً مقامی، صوبائی اور قومی سطح پر ان کا اہتمام بے حد ضروری ہے ۔ طلبا و اساتذہ تقاریر، ڈراموں اور اجتماعی یا گروہی مباحثوں کے ذریعے اسلامی حقائق و مسائل اجاگر کر سکتے ہیں ۔ ان سے معاشرے کی بہبود کے لیے علمی خدمت لی جا سکتی ہے ۔ تعلیم بالغاں اور اپنی مدد آپ کا ہفتہ منا کر اور اس طرح کے دوسرے پروگرام کرکے خاصا کام کیا جا سکتا ہے ۔

طلبا و اساتذہ کی علمی و ادبی انجمنیں اور سرکل قائم کیے جائیں ۔ جہاں اسلامی علوم و فنونؒ کے تعارف اور ان کی ترقی و ترویج کی سبیل نکالی جا سکتی ہو، جو لوگ نمایاں خدمات سرانجام دیں ان کی اداری، صوبائی اور قومی سطح پر تحسین کی جائے ۔

تربیتی اداروں کے طلباء کو مشہور دینی درسگاہوں میں لے جایا جائے خاص طور پر جب دورۂ حدیث جاری ہو۔ اس طرح دینی درسگاہوں کے اساتذہ کو مختلف مواقع پر تربیتی اداروں میں دعوت دی جائے اور ان سے استفادہ کیا جائے ۔

تربیتی اداروں کو اسلامی بنانے کی حکمت عملی اسی صورت میں کامیاب اور بارآور ہو سکتی ہے جب معاشرے کی مجموعی فضا اس کے لیے بھی سازگار اور معاون ہو ۔ تعلیم و تعلم کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی تحریک کو محض تربیتی اداروں تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ معاشرے کے دیگر اداروں کو بھی اسلامی خطوط پر استوار کرنے کا عمل تیزتر کر دیا جائے۔ جب تک ہماری اجتماعی زندگی اسلامی سانچے میں نہیں ڈھل جاتی تربیتی اداروں کی اسلامی فضا نامکمل اور غیرمؤثر رہے گی ۔

سوالات

۱- اسلامی نقطہ نظر سے علم اور تربیت کا فرق ظاہر کیجیے ۔

۲- تربیتی اداروں میں نظریاتی تعلیم کی اہمیت کیا ہے، واضح کیجیے ۔

۳- تربیتی اداروں کے ماحول کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کن عوامل کو مد نظر رکھا جائے ۔ ان عوامل کا آپس میں کیا تعلق پایا جاتا ہے ؟ وضاحت کیجیے ۔

۴- آپ کے نزدیک ماحول کو اسلامی بنانے والے مختلف عوامل میں سب سے اہم عامل کون سا ہے - وجوہات بیان کیجیے ۔

۵- تربیتی اداروں کے سربراہ کے لیے معیار انتخاب کیا ہو؟ مجوزہ معیار کا زیر تربیت افراد کی تعلیم سے کیا تعلق ہے ؟ واضح کیجیے ۔

۶- کن مشاغل و سرگرمیوں کو اپنا کر تربیتی اداروں کے ماحول کو اسلامی بنایا جا سکتا ہے ؟

طلبا کے حوالے سے جواب دیجیے ۔

۷- نصابات کو اسلامی بنانے کے لیے کن کن حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تشریح کیجیے ۔

۸- وہ کون سے عمومی اصول ہیں جن کی روشنی میں نصابات کو اسلامی بنایا جا سکتا ہے ؟ واضح کیجیے ۔

۹- درج ذیل کی ماحولیاتی اہمیت پر نوٹ لکھیے :

(الف) مسجد ۔ (ب) لائبریری ۔

دوسرا باب

ضابطہ اخلاق برائے اساتذہ

ضابطۂ اخلاق سے مراد وہ عملی اصول ہیں جو کسی پیشے سے متعلق افراد کے فرائض، تعلقات اور طرز عمل کا معیار مقرر کرتے ہیں - ہر پیشے کے لیے ایک ضابطہ اخلاق ضروری سمجھا جاتا ہے - لیکن ایسے اعلیٰ پیشوں کے لیے جن کی بنیاد طویل عرصہ کی خصوصی ذہنی تربیت پر ہو، اور جن پر عوامی بہبود کا دارو مدار بہت زیادہ ہو، ان کے کارکنوں کے لیے ضابطہ اخلاق کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے - ضابطہ اخلاق کارکنوں کے سامنے ایک مثالی طرز عمل پیش کرتا ہے - جس کی روشنی میں وہ عوام کی بہتر خدمت سرانجام دے سکتے ہیں - اور اس کے ذریعے اپنے مفادات اور فن کے وقار کی حفاظت کر سکتے ہیں - ضابطہ اخلاق ان کی اہلیت اور کارکردگی کا ضامن بنتا ہے - ان میں اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے خلوص اور لگن پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے اور خود اعتمادی اور عزت نفس کا احساس پیدا کرتا ہے -

اساتذہ کے لیے پیشہ ورانہ ضابطہ اخلاق کی بحث سے پہلے ضروری ہے کہ ان کی پیشہ ورانہ حیثیت کا تعیین کیا جائے - عرف عام میں معاش کے حصول کا ہر ذریعہ پیشہ کہلاتا ہے - لیکن ماہرین نے پیشے کے لیے چند خصوصیات ضروری قرار دی ہیں، جو درج ذیل ہیں :

۱- اس کے لیے اعلیٰ اقتصادی تعلیم کی ضرورت ہے -

۲- عملی میدان میں اس کے لیے مناسب طرز عمل اور طریق کار اعلیٰ مہارت کا متقاضی ہے -

۳- معاشرہ اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے -

۴- یہ معاشرے کے لیے انتہائی قابل قدر خدمات سرانجام دیتا ہے -

۵- اسے اختیار کرنے کے لیے خصوصی سند یا باقاعدہ لائسنس کی ضرورت ہوتی ہے -

۶- یہ متعلقہ افراد کے لیے قابلیت، کارکردگی اور طرز عمل کا معیار متعین کرتا ہے -

۷- قانون سازی اور معاشرتی اثر و رسوخ سے اپنے پیشہ ورانہ تحفظ کا اہتمام کرتا ہے -

۸- اس سے متعلق افراد اپنی پیشہ ورانہ اصلاح کے لیے انجمن سازی کرتے ہیں -

اگر پیشہ تدریس کو مندرجہ بالا خصوصیات کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو یہ ان میں سے اکثر معیارات پر پورا اترتا ہے - ہر معاشرے کی انتہائی اہم خدمت سرانجام دیتا ہے، معاشرہ اسے قدر کی نگاہ سے

دیکھتا ہے، اسے اختیار کرنے کے لیے خصوصی سندات درکار ہیں ۔ معلمین کی اپنی پیشہ ورانہ انجمنیں قائم ہیں، اور معلمی کے لیے قابلیت، کارکردگی اور طرز عمل کے معیار متعین ہیں ۔ انھیں وجوہات کی بنیاد پر موجودہ دور میں فن تدریس ایک اعلیٰ پیشے کی حیثیت حاصل کر چکا ہے ۔

تعلیم و تعلم کا عمل ہرکس و ناکس کی سمجھ میں نہیں آ سکتا ۔ جس طرح طب، قانون، انجینیئرنگ اور اسی قبیل کے دیگر اہم معاملات میں عوام متعلقہ ماہرین کی رائے پر انحصار کرتے ہیں ۔ اسی طرح بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں انھیں اساتذہ کی ماہرانہ اہلیت پر اعتماد کرنا پڑتا ہے، چونکہ اساتذہ ہی کو آئندہ نسلوں کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینا ہے، اس لیے خود ان پر بھی اپنی راہ کے نشان واضح ہونے چاہییں، تاکہ وہ تحریصات اور لغزشوں کا شکار نہ ہوں اور ان سے ایسے افعال سرزد نہ ہوں جن سے ان کے پیشے کا وقار مجروح ہو ۔ ان کی پیشہ ورانہ حیثیت متقاضی ہے کہ ان کے لیے خود ان کا منظور کردہ ضابطہ اخلاق موجود ہو تاکہ ان کے سامنے ایک مثالی طرز عمل موجود رہے، جسے اپنا کر وہ عوام کی بہتر خدمت اور طلبا کی بہتر رہنمائی کر سکیں ۔

اساتذہ کا ضابطہ اخلاق در اصل ایسے اخلاق اصولوں کے باضابطہ بیان کا نام ہے، جو انھیں فنی راہنمائی مہیا کرتا ہے اور معاشرے میں ان کا کردار اور طرز عمل متعین کرتا ہے ۔ ان کے اور طلبا، والدین، معاشرہ کے ارکان، محکمہ تعلیم کے منتظمین اور فنی شرکائے کار کے مابین تعلقات اور باہمی حقوق و فرائض کے راہنما اصول بیان کرتا ہے ۔ ایسے ضابطہ کی تدوین کے سلسلے میں درج ذیل اصولوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے :

۱- ضابطہ اخلاق کے عام اصول، دفعات اور شقیں بدیہی اور واضح ہونی چاہییں ۔ تاکہ اخلاق اور غیر اخلاق طرز عمل کے درمیان تمیز ہو سکے ۔

۲- اس میں ایسے اصول اور مفروضات نہیں ہونے چاہییں جن پر اساتذہ کے درمیان وسیع اتفاق رائے نہ پایا جاتا ہو ۔

۳- اس میں شخصی اور پیشہ ورانہ اقدار کا خاکہ درج ہو، اور ان اقدار کا ذکر اس طرح کیا جائے کہ اساتذہ انھیں اپنے لیے ناگزیر سمجھنے لگیں ۔

۴- حقیقت پسندی پر مبنی ہو تاکہ اساتذہ ایثار اور سرگرمی سے اس پر عمل کر سکیں ۔

۵- اس میں تمام اصول بیان کر دیے جائیں جن سے متعلقہ افراد کے باہمی اشتراک و تعاون کی حدود معلوم ہو سکیں ۔

۶- اس میں صرف اخلاق اصول ہی بیان نہ کیے جائیں بلکہ ان افعال و اعمال کی بھی نشان دہی کی جائے جو ان اصولوں کا لازمی تقاضا ہیں ۔

۷- ضابطہ کی ہر شق ایسی ہونی چاہیے جس پر تعزیری کارروائی ہو سکے ایسا طرز عمل جس پر سزا

دینا ممکن یا موزوں نہ ہو اسے ضابطہ اخلاق میں شامل نہ کیا جائے۔

۸- بہتر معاشرتی خدمت کو ہر اصول کا معیار قرار دیا جائے اور اسے اساتذہ کے شخصی مفادات پر مقدم سمجھا جائے۔

۹- اس میں اساتذہ کے حقوق و فرائض کی حدود واضح طور پر متعین کی جائیں۔

۱۰- ضابطہ اخلاق میں نظریہ پاکستان کو بنیادی حیثیت دی جائے۔

۱۱- اسے ہر لحاظ سے مکمل ہونا چاہیے تاکہ فنی اخلاق کا کوئی پہلو نظر انداز نہ ہو جائے۔

۱۲- ضابطہ اخلاق میں پیشہ ورانہ آزادی کی ضمانت موجود ہونی چاہیے اور اس میں اساتذہ کی ترقی اور نشو و نما کے مواقع کی واضح نشاندہی کی جائے۔

۱۳- اسے لچکدار ہونا چاہیے تاکہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے تحت اس میں ترمیم و اصلاح ہو سکے پیشہ وارانہ ضابطہ اخلاق کی تدوین و نفاذ کے سلسلے میں یہ امر پیش نظر رہنا چاہیے کہ اسے حکومت یا اس کا کوئی ادارہ مشتہر یا نافذ نہ کرے، ورنہ اس کی افادیت ختم ہو جائے گی اور اس کی حیثیت محض سرکاری قواعد و ضوابط کی بن کر رہ جائے گی لہذا اخلاق ضابطہ کو قانونی ضابطہ سے اپنے تعزیری عمل اور دائرہ نفاذ کے معاملے میں الگ رہنا چاہیے۔

پیشے کی خصوصیات میں یہ بات شامل ہے کہ اس کے کارکنوں کی ایک پیشہ ورانہ تنظیم قائم ہو۔ چنانچہ اساتذہ کی پیشہ ورانہ نشو و نما کے لیے ضروری ہے کہ پیشہ ورانہ بنیادوں پر اساتذہ کی تنظیمیں قائم ہوں پھر ان تنظیموں کے اتحاد سے کل پاکستان بنیادوں پر اساتذہ کی ایک نمائندہ قومی تنظیم قائم کی جائے جو ہر سطح کے تعلیمی اداروں کے اساتذہ پر مشتمل ہو۔ ہر تنظیم اساتذہ کے معاشی اور معاشرتی تحفظ کے علاوہ ان کی علمی اور فنی برتری کے لیے بھی کوشاں رہے یہ تنظیم ضابطہ اخلاق کا ایک جامع مسودہ تیار کرے اور اسے تمام اساتذہ تک پہنچانے کا مؤثر انتظام کرے اور اُنھیں اس کی پابندی پر آمادہ کرنے کی مسلسل اور بھر پور کوشش کرے تاکہ عدم واقفیت اور لاعلمی کی بناء پر ضابطہ کی خلاف ورزی کا امکان کم سے کم تر ہو جائے۔

ضابطہ اخلاق کے نفاذ کے لیے اساتذہ کی قومی تنظیم دیانتدار، متقی، اعلیٰ تعلیم یافتہ، صاحب فراست اور صاحب کردار افراد پر مشتمل ایک نفاذ اخلاق کمیٹی یا عدالت اخلاق تشکیل دے جب کبھی کسی استاد کے بارے میں اشتباہ پیدا ہو کہ اس کا طرز عمل ضابطۂ اخلاق کے مطابق نہیں تو یہ عدالت اس کی تحقیق کرے اور الزام ثابت ہو جانے کی صورت میں اصلاح عمل کے مناسب اور مؤثر تدابیر اختیار کرے۔ البتہ جب ضابطہ اخلاق کی کسی شق کی شدید خلاف ورزی ہو اور متعلقہ فرد اصلاح احوال سے اجتناب کرے تو یہ عدالت یا کمیٹی متعلقہ افسران سے مناسب کارروائی کی سفارش کر سکتی ہے۔

ضابطہ اخلاق کے سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اس کا مسودہ کبھی بھی حتمی

اور آخری نہیں ہو سکتا بلکہ وقت کے تقاضوں کے تحت اس میں ترمیم و اصلاح کا کام جاری رہنا چاہیے - چنانچہ ضابطہ کے نفاذ کی طرح ترمیم و اصلاح کا یہ کام بھی اساتذہ کی مجوزہ قومی تنظیم کے سپرد ہونا چاہیے -

پاکستان میں تاحال اساتذہ کے لیے کوئی متفقہ اور جامع مسودہ تیار نہیں ہوا، البتہ مختلف مواقع پر چند جزوی کوششیں کی گئی ہیں، لیکن اکثر اساتذہ اس سے بے خبر ہیں - سب سے پہلی کوشش ادارہ تعلیم و تحقیق جامعہ پنجاب کے طلبا نے ۱۹۶۳ء میں کی - انھوں نے باقاعدہ تحقیق کے بعد اساتذہ کے لیے ضابطہ اخلاق کی اہمیت و افادیت واضح کی - ۱۹۶۵ء میں اسی ادارے سے فارغ التحصیل افراد کی تنظیم انجمن فاضلین نے پاکستانی اساتذہ کے لیے ضابطہ اخلاق کا ایک مبسوط مسودہ تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی - چنانچہ ۱۹۶۷ء میں اس کمیٹی کی طرف سے یہ مسودہ اخبارات میں شائع کرنے کے علاوہ اساتذہ کی مختلف انجمنوں کو بھی ارسال کیا گیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ اساتذہ، والدین، ماہرین تعلیم اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی آراء اور تجاویز کی روشنی میں اس مسودے کو آخری شکل دی جائے - لیکن عدم دلچسپی اور بے حسی کا یہ عالم ہے کہ قومی اہمیت کے اس کام کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی - نتیجتاً ضابطہ اخلاق کے اس مسودے کو حتمی شکل نہ دی جا سکی - اس کے بعد تنظیم اساتذہ پاکستان نے ارکان تنظیم کے نفاذ کے لیے ایک مختصر اور مجمل سا خاکہ تیار کیا - ضابطہ اخلاق کی تیاری کے لیے بیان کردہ اصولوں اور مذکورہ بالا ہر دو مسودوں کو پیش نظر رکھکر ذیل میں اساتذہ کے لیے ضابطہ اخلاق کا خاکہ پیش کیا جا رہا ہے -

ضابطہ اخلاق کا خاکہ

ہم اسلامی جمہوریہ پاکستان کے اساتذہ یقین رکھتے ہیں کہ :

(الف) پاکستان میں تعلیم کا مقصد ایسے افراد تیار کرنا ہے جو نظریہ پاکستان کے مطابق پاکستان میں اسلامی نظریہ حیات کی ترویج اور تحفظ کے ضامن ہوں، اپنے ملک کی حفاظت کر سکیں، اسے مضبوط بنائیں اور اس کی تعمیر و ترقی میں دن رات کوشاں رہیں -

(ب) قومی مقاصد کی تکمیل اور ملکی استحکام کے لیے تمام افراد کو حصول تعلیم کے یکساں اور موزوں مواقع میسر ہوں -

(ج) عمل تعلیم کی موزونیت، اساتذہ کے عزائم، ان کی تربیت اور طرز عمل کی آئینہ دار ہوتی ہے -

(د) جو افراد پیشہ معلمی اختیار کرتے ہیں، ان پر یہ ذمہ داری از خود عائد ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے طرز عمل کو اس پیشے کی مثالی روایات کے مطابق بنائیں - چنانچہ اپنے طرز عمل کی رہنمائی کے لیے ہم پاکستانی اساتذہ مندرجہ ذیل ضابطہ اخلاق اختیار اور نافذ کرتے ہیں - ہم میں سے ہر اُستاد :

۱- اپنی زندگی کو احکام الٰہی کے مطابق ڈھالے گا اور ان امور سے بچنے کی کوشش کرے گا جو

اللہ کی ناراضی کا باعث ہیں۔

۲۔ پاکستان کے اساسی نظریہ کے تحفظ اور ترویج کے لیے پوری پوری کوشش کرے گا۔

۳۔ معیار تعلیم کو بلند کرنے، نئی نسل کی اسلامی خطوط پر تربیت کرنے اور پاکستان میں اسلامی جمہوری معاشرے کے قیام کے لیے عام افراد، طلبا، والدین، رفقائے کار اور انتظامیہ کا تعاون حاصل کرے گا۔

۴۔ اپنے فرائض منصبی محنت، لگن، خلوص اور دیانت داری سے سرانجام دے گا۔ اور ان کی ادائیگی میں کسی قسم کا تساہل یا کوتاہی نہیں کرے گا۔ اوقات اور اصولوں کی پابندی کے لیے اپنے اندر ضبط نفس پیدا کرے گا۔

۵۔ پیشہ ورانہ ترقی کی تحقیقی کاوشیں کرے گا اور تعلیم و تدریس کے میدان میں نئے نئے تجربات کرکے انھیں منظر عام پر لائے گا۔ تاکہ دیگر اساتذہ بھی ان سے مستفید ہو سکیں۔

۶۔ اپنے اخلاق و کردار اور طرز عمل کو معلمی کے معروف اور اعلیٰ روایات کے مطابق بنانے کی کوشش کرے گا۔

۷۔ طلبا، لواحقین اور اپنی ذات کے حقوق کے تحفظ کا لحاظ رکھتے ہوئے معاشرے کی متنوع سرگرمیوں میں حصہ لیتا رہے گا۔

۸۔ بوقت ضرورت طلبا کے سامنے اختلافی مسائل کا ذکر، حکمت عملی اور غیر جانبداری سے بے لاگ انداز میں کرے گا۔

۹۔ معاشرہ کی ضروریات اور امکانی مواقع کا لحاظ رکھتے ہوئے تعلیم کی اشاعت کے لیے سرگرم عمل رہے گا تاکہ معاشرہ کی اخلاق، روحانی اور ذہنی اصلاح و تعمیر کا کام جاری رہے۔

۱۰۔ ادارہ کے مقاصد اور طریق کار کے تعیین میں معاشرہ کے اہل الرائے افراد کو بھی شریک رکھے گا اور انھیں ادارے کے تعلیمی پروگرام سے پوری طرح آگاہ رکھنے کی کوشش کرے گا۔

۱۱۔ طلبا کو پاکستان کا خوش حال، اولوالعزم اور مفید شہری بنانے اور ان میں خلوص و محبت اور ہمدردی کے بہتر جذبات پیدا کرنے کے لیے تمام طلبا سے بلا لحاظ منصفانہ اور غیرجانبدارانہ سلوک روا رکھے گا۔

۱۲۔ اپنے فکر، قول اور عمل کے ذریعے طلبا کو پاکستانی فلسفہ حیات کے مطابق زندگی کے اعلیٰ نصب العین کی تشکیل میں مدد دے گا تاکہ وہ اپنی جسمانی، ذہنی، تخلیقی اور روحانی صلاحیتوں کو ترقی دے سکیں۔

۱۳۔ ان میں پاکستان کے لیے محبت اور اس کی تعمیر و ترقی اور بہبود کے لیے سرگرمیٔ عمل اور جذبہ ایثار پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔

۱۴- تعلیم و تربیت کے دوران میں طلبا کی صلاحیتوں، دلچسپیوں اور میلانات کا لحاظ رکھے گا۔ اور ان صلاحیتوں کی بہتر تہذیب کے لیے کوشاں رہے گا۔

۱۵- جب تک طلبا کے مفاد یا مفاد عام کا تقاضا نہ ہو، طلبا کے خانگی پس منظر، اہلیت اور کارکردگی کے کوائف صیغہ راز میں رکھے گا۔

۱۶- طلبا کو ٹیوشن پڑھنے پر مجبور نہیں کرے گا۔

۱۷- طلبا کی تعلیم و تربیت میں والدین اور سرپرستوں کے تعاون کی اہمیت کا احساس رکھتے ہوئے ان کے ساتھ معاونت اور رفاقت کے تعلقات قائم رکھنے کی کوشش کرے گا۔

۱۸- طلبا کے بہترین مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے والدین یا سرپرستوں کو طلبا کی تعلیمی ترقی اور دیگر کوائف سے صحت اور وضاحت کے ساتھ مطلع کرتا رہے گا۔

۱۹- اپنے رفقائے کار سے بہتر تعلقات استوار کرنے کے لیے ان سے وہی حسن سلوک روا رکھے گا جس کی وہ اپنی ذات کے لیے توقع رکھتا ہے۔

۲۰- اپنے رفقائے کار کے کاموں میں بے جا اور غیرضروری مداخلت سے اجتناب کرے گا اور ایسا رویہ اختیار کرے گا جس سے رنجش اور مخاصمت کے بجائے باہمی خلوص و معاونت پیدا ہونے کا احتمال ہو۔

۲۱- دیگر اساتذہ کے متعلق ہمیشہ تعمیری رائے زنی کرے گا۔ اور ان کے متعلق گفتگو کے سلسلے میں انتہائی احتیاط برتے گا۔

۲۲- اساتذہ کی تنظیموں میں عملی طور پر اور سرگرمی کے ساتھ شریک ہوگا اور ان کے علمی اور فنی مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں رہے گا۔

۲۳- درس گاہ کو فرقہ وارانہ اختلافات اور گروہی سیاست سے پاک رکھنے کی پوری کوشش کرے گا۔

۲۴- اپنے فکر و عمل اور اخلاق و کردار سے معلمی کے پیشے کو باوقار اور پرکشش بنانے کی کوشش کرے گا تاکہ دوسرے مخلص اور اہل افراد اسے اختیار کرنے کی طرف مائل ہوتے رہیں۔

۲۵- اپنے کام اور مفادات کے متعلق تمام سرکاری مراسلت اپنے افسران بالا کے توسط سے کرے گا۔

۲۶- اپنے تقرر یا ترقی کے لیے محض اہلیت کی بنیاد پر کوشش کرے گا اور اس سلسلے میں اثر و رسوخ، خارجی دباؤ اور ناپسندیدہ ذرائع استعمال کرنے سے گریز کرے گا۔

۲۷- کسی ایسی آسامی کے لیے درخواست نہیں دے گا جس پر کوئی دوسرا معلم کام کر رہا ہو۔ اور نہ ہی کسی آسامی کے لیے دوسرے اُستاد یا اساتذہ سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنے مشاہرے میں کمی تجویز یا منظور کرے گا۔

۲۸- سرکاری اور راز میں رکھنے والی معلومات غیرمتعلق افراد تک پہنچانے سے اجتناب کرے گا۔

۲۹- اپنی شرائط ملازمت اور متعلقہ قواعد و ضوابط کی پابندی کرے گا۔

۳۰- کسی درسی کتاب ، تدریسی مواد یا سامان مدرسہ کی منظوری یا خریداری کے سلسلے میں کوئی معاوضہ یا تحفہ قبول نہیں کرے گا۔

۳۱- اپنے افسران، رفقائے کار اور ماتحت عملہ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار دیانتداری اور انصاف پسندی سے کرے گا۔

۳۲- کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرنے کے لیے معلمی کو زینہ یا وسیلہ کے طور پر استعمال نہیں کرے گا۔

۳۳- درس گاہ کی پالیسی اور لائحہ عمل کے متعلق براہ راست اپنے رفقاء اور صدر معلم سے بات کرے گا اور صدر معلم کی اجازت کے بغیر اعلیٰ انتظامی افسران سے غیرضروری رابطہ نہیں رکھے گا۔

۳۴- مطالعہ، تحقیق، علمی سفر، دوران ملازمت تجدیدی کورسز، تعلیمی کانفرنسوں اور دیگر علمی مجالس میں شرکت کے ذریعے اپنی علمی اور فنی مہارت میں اضافہ کے لیے باقاعدہ، مسلسل اور سرگرمی کے ساتھ کوشاں رہے گا۔

———

(حصہ اول)

تیسرا باب

برصغیر میں اشاعت اسلام

مسلمانوں کی آمد سے قبل برصغیر کے لوگ :

برصغیر پاک و ہند کی سرزمین مختلف نسلوں اور قوموں کا عجائب خانہ معلوم ہوتی ہے - اس وسیع سرزمین میں بیسیوں نسلوں اور رنگوں کے لوگ نظر آتے ہیں جن کی زبان اور طرز زندگی میں گوناگوں اختلافات پائے جاتے ہیں - برصغیر کے لوگوں کی چھ اقسام بیان کی جاتی ہیں - جو دراوڑ، منگول ، منگولی دراوڑ ، آریائی دراوڑ، آریا، ترکی اور ایرانی اقوام کہلاتے ہیں - اگرچہ برصغیر کی بہت قدیم آبادی کے متعلق کوئی قابل اعتماد تاریخی مواد موجود نہیں اس لیے عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ آریاؤں کی آمد سے پہلے جو قومیں یہاں آباد تھیں ان میں سے کول، دراوڑ اور منگول خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱- کول :

تاریخی کتابوں کی عدم موجودگی میں اگرچہ وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم اکثر مؤرخین کی رائے کے مطابق کول برصغیر کی قدیم ترین نسل ہے - بعض مؤرخین کی رائے ہے کہ یہ اس برصغیر کے اصلی باشندے تھے، جن کا رنگ سفید، سر گول، ناک چپٹی، قد چھوٹا اور شکل بھدی تھی - یہ لوگ درختوں کی کھوہ یا پہاڑوں کی غاروں میں رہتے تھے اور جنگلی پھل پتے کھا کر گزارہ کرتے تھے اور بھوت پریت کی پوجا کرتے تھے - رفتہ رفتہ ترقی کرکے وہ کھیتی باڑی کی طرف متوجہ ہوئے اور رہائش کے لیے جھونپڑیاں اور مکان بنانے لگے - جب دوسری قوموں کا غلبہ پڑا تو یہ لوگ بھاگ کر پہاڑوں میں روپوش ہوگئے - اب تک ان کی نسلیں بنگال، بہار، اڑیسہ اور وسط ہند کی پہاڑیوں میں موجود ہیں۔ جو خانہ بدوش ہیں اور ابتدائی تہذیب کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں -

۲- دراوڑ :

دراوڑوں کے متعلق دو نظریے ہیں - بعض مؤرخ انہیں اس سرزمین کے اصلی باشندے خیال کرتے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ یہ عراق کے سامری باشندوں کے ہم نسل تھے جو درہ بولان کی راہ سے پاک و ہند میں وارد ہوئے اور بلوچستان اور سندھ میں مدتوں آباد رہے - آج کل یہ قوم دکن میں آباد ہے - اس نسل کے لوگ کولوں کے مقابلے میں بہتر خد و خال رکھتے تھے - ان کا قد چھوٹا، رنگ سیاہ، سر لمبوترا چہرہ لمبا، ناک چپٹی اور جسم مضبوط ہوتا تھا - ان کی تہذیب و تمدن کے آثار ہڑپہ اور موئن جوڈرو کی

کھدائی سے برآمد ہوئے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ یہ بہت اعلیٰ معیار کی تہذیبی زندگی بسر کرتے تھے - کھیتی باڑی کرتے اور مویشی پالتے تھے - کپڑا بننا بھی جانتے تھے اور سونے چاندی کے زیور بھی بناتے تھے - انھوں نے ملک کے طول و عرض میں خوبصورت اور بارونق شہر آباد کر رکھے تھے اور اپنے قبائلی سرداروں کی اطاعت میں فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے - وہ کئی قسم کے دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے - ان کی مذہبی رسومات میں انسانی قربانی کو خاص اہمیت حاصل تھی - اگرچہ دراوڑ قوم نے تہذیب و تمدن میں کافی ترقی کر لی تھی لیکن ان کی دو شاخیں جنھیں گونڈ اور بھیل کہتے ہیں ابھی تک وحشیانہ اور غیرمہذب زندگی بسر کرتی ہیں -

۳- منگول :

منگول نسل کے لوگ منگولیا سے برہمپتر کی وادی کی راہ سے برصغیر میں وارد ہوئے - آج کل یہ لوگ آسام، بھوٹان، سکم اور نیپال میں آباد ہیں - ان میں اپنی نسل کی تمام خصوصیات موجود ہیں - ان کا قد پستہ، ناک چپٹی، رنگ زردی مائل بھورا، چہرہ چوڑا اور آنکھیں ترچھی تھیں - یہ لوگ پہلے کول اور دراوڑوں سے لڑتے رہے - لیکن بعد میں ان کے ساتھ گھل مل گئے -

۴- آریا :

برصغیر کی اکثریت آریا نسل سے تعلق رکھتی ہے - یہ لوگ شمال مغربی دروں کے راستے پاک و ہند میں وارد ہوئے - ان کی فتوحات کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا - اکثر مؤرخین کی رائے کے مطابق یہ وسط ایشیا کے باشندے تھے جو تغیرات زمانہ سے اپنا آبائی وطن چھوڑ کر یورپ اور ایشیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئے - یہ لوگ دراز قد، سفید رنگ اور خوبصورت تھے - تہذیب و تمدن میں بھی مفتوح اقوام سے بہت بلند تھے، اس لیے جلد ہی انھوں نے تمام شمالی ہندوستان پر قبضہ کر لیا -

وادیٔ سندھ کی تہذیب

قدیم آبادی کے متعلق قابل اعتماد حوالوں کی عدم موجودگی سے بالعموم یہی کہا جاتا رہا ہے کہ آریوں کی آمد سے قبل برصغیر پاک و ہند میں وحشی اور غیرمہذب قومیں آباد تھیں - لیکن ہڑپہ اور موئن جوڈرو کے کھنڈرات کی کھدائی سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ آریوں کی آمد سے کئی صدیاں پہلے یہاں وادی سندھ میں کوئی متمدن اور مہذب قوم آباد تھی -

وادی سندھ کے ویران ٹیلے ایک ایسی تہذیب کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہیں جس کی دریافت نے برصغیر کی تاریخ میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے - ان ٹیلوں کی کھدائی سے یہ بات واضح ہو گئی کہ وادی سندھ میں تقریباً پانچ ہزار سال پہلے ایک مہذب اور متمدن قوم آباد تھی - اس تہذیب کے آثار پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے کھنڈرات سے ظاہر ہیں - وادی سندھ کی تہذیب میں موئن جوڈرو کو دوسرے مقامات سے زیادہ اہمیت حاصل ہے - موئن جوڈرو کے لفظی معنی "مردوں کا ٹیلہ" ہے - یہ شہر دریائے سندھ کے کنارے

لاڑکانہ کے قریب واقع ہے - اس تہذیب کا حامل دوسرا اہم مرکز ہڑپہ ہے جو دریائے راوی کی پرانی گزرگاہ کے قریب واقع ہے - اگرچہ دونوں شہروں میں تقریباً ۶۴۰ کلومیٹر کا فاصلہ ہے، لیکن چیزوں کی بناوٹ اور تعمیرات میں یکسانیت اور مشابہت ہے - ان شہروں کی قدامت اور بناوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر صدیوں تک آباد رہے - کئی بار اُجڑے اور کئی بار آباد ہوئے - ان شہروں کی تعمیر میں بڑے سلیقے اور عقلمندی سے کام لیا گیا تھا - سڑکیں، محلے، گلیاں بڑی محنت سے تیار کی گئی تھیں - موئن جوڈرو اور ہڑپہ کی عمارات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - رہائشی مکانات، بڑی عمارات اور عوامی غسلخانے - یہ عمارات اعلیٰ قسم کی پکی اینٹوں سے تیار کی جاتی تھیں - کمروں کی بناوٹ میں روشنی اور ہوا کی آمد و رفت کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا - فرش پختہ تھے اور گھروں کے نیچے تہ خانے بنے ہوئے تھے اور ان میں ہوا اور روشنی کی آمد و رفت کے لیے چھوٹے چھوٹے سوراخ بنائے جاتے تھے- کھڑکیوں اور چھتوں کے لیے لکڑی کے تختے استعمال کیے جاتے تھے- گھروں کے غسل خانے کشادہ اور آرامدہ ہوتے تھے، یہ عموماً گلی کی دیوار کے قریب ہوتے تھے تاکہ گندا پانی گلی کی بدرو میں چلا جائے- شہر کے گلی کوچوں کی نالیاں پختہ ہوتی تھیں جو اینٹوں یا پتھر کی چھت سے ڈھکی ہوتی تھیں - کوڑا کرکٹ اور گندے پانی کے لیے زمین دوز گڑھے اور کنوئیں بنے ہوئے تھے -

عام رہائشی مکانوں اور غسل خانوں کے علاوہ چند بڑی پرشکوہ عمارات بھی دریافت ہوئی ہیں جن کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ یا تو یہ محلات تھے یا عبادت گاہیں - ان میں وسعت اور کاریگری کے لحاظ سے حمام اعظم کو بہت فوقیت حاصل ہے - اس کے مرکز میں کھلا صحن ہے اور اس کے اردگرد کمرے بنے ہوئے ہیں - صحن کے درمیان ایک بڑا تالاب ہے، جس کے چاروں طرف سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں - اس کے ساتھ ہی ایک کمرے میں کنواں ہے، یہ پختگی اور مضبوطی میں بے مثال ہے -

موئن جوڈرو اور ہڑپہ خاصے وسیع اور گنجان آباد شہر تھے- ان کے قریب زمین بہت زرخیز تھی، لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے- روئی، گندم اور جو خاص فصلیں تھیں - اس کے علاوہ کھجوریں بھی دستیاب تھیں - لوگ گائے، بیل، بھیڑ اور اُونٹ پالتے تھے- وہ لوگ کپاس کی کاشت کرتے تھے اور سوتی کپڑا بناتے اور پہنتے تھے - ان مقامات سے اس وقت تک برآمد ہونے والی چیزوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ لوگ آمد و رفت کے لیے بیل گاڑیاں استعمال کرتے تھے سیاحت اور تجارت کی غرض سے متمدن دنیا اور برصغیر کے دیگر حصوں میں آیا جایا کرتے تھے- یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ کاروباری سہولت کے لیے بنڈی پرچہ کا رواج تھا اور کاغذات پر مہریں لگائی جاتی تھیں - حکومت کے قوانین کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی- ناپ تول کے پیمانوں اور باٹوں کی باقاعدہ جانچ پڑتال کی جاتی تھی -

وادی سندھ کے قدیم لوگ سونے، چاندی، تانبے، سیسہ اور کانسی کے استعمال سے واقف تھے- سونے چاندی، تانبے اور دوسری دھاتوں سے زیورات بناتے تھے- ہڈیوں اور ہاتھی دانت سے سوئیاں اور کنگھیاں بناتے

تھے - تانبے اور کانسی سے کلہاڑیاں، آریاں، چاقو، اُسترے، پیالے اور طشتریاں بناتے تھے - موئن جوڈرو سے کثیر تعداد میں کھلونے برآمد ہوئے ہیں - یہ کھلونے پختہ مٹی سے بنے ہوئے ہیں ان میں زیادہ تر انسانوں، جانوروں، پرندوں اور روزانہ استعمال کی چیزوں کے نمونے شامل ہیں -

اگرچہ ان لوگوں کے عقائد اور رسوم کے متعلق زیادہ تفصیل سے پتا نہیں چل سکا، تاہم کھنڈرات سے برآمد ہونے والے مجسموں سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ لوگ ماتا دیوی کی پرستش کرتے تھے، اس دیوی کے ساتھ ایک دیوتا کی بھی پوجا ہوتی تھی جس کی شکل و صورت ہندوؤں کے شیو دیوتا سے ملتی ہے - یہ لوگ اپنے مردوں کو دفن کرتے تھے جس کے لیے تین طریقے رائج تھے - مکمل طور پر دفنانا، جزوی طور پر دفنانا اور جلانے کے بعد دفنانا - بعض اوقات مردوں کے ساتھ برتن اور زیورات دفن کرنے کا بھی رواج تھا -

برصغیر میں آریاؤں کی آمد :

آریوں کے وطن کے متعلق مؤرخین میں اختلاف پایا جاتا ہے - اکثر مؤرخین کی رائے ہے کہ ان کا اصل وطن وسط ایشیا تھا، جہاں سے نکل کر وہ شمال مغربی دروں کے راستے پاک و ہند میں داخل ہوئے وہ محض ایک حملہ آور قوم کی حیثیت سے یہاں نہیں آئے تھے، بلکہ وہ مستقل طور پر رہائش پذیر ہونے کے لیے پہنچے تھے - اس لیے وہ اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لائے تھے - کافی عرصہ تک یہ لوگ دریائے سندھ کے پار ٹھہرے رہے، جب وہ علاقہ ان کی ضروریات کے لیے ناکافی ہوگیا تو وہ دریائے سندھ کو عبور کر کے پنجاب میں داخل ہوئے اور پھر یہاں سے آہستہ آہستہ گنگا جمنا کے میدان کی طرف بڑھے اور وہاں کے اصلی باشندوں کو شکست دے کر شمالی ہند پر قابض ہوگئے - آریا ایک طاقتور اور جنگجو قوم تھی، ان کا رنگ گندمی، قد لانبا اور نقش نہایت تیز اور دلکش تھے - ان میں سے اکثر لوگوں کے سر بڑے، بدن گٹھیلے اور مضبوط تھے -

سیاسی زندگی :

آریا لوگ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں مقیم تھے- ہر قبیلے کی اپنی ریاست ہوتی تھی - جسکا حکمران اس قبیلے کا سردار ہوتا تھا، جسے راجا کہتے تھے راجا کا فرض ہوتا تھا کہ وہ رعایا کے جان و مال کی حفاظت کرے، مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لیے پنڈتوں کا انتظام کرے اور رعایا کو بیرونی حملوں سے بچانے کا بندوبست کرے - ان خدمات کے صلے میں لوگ اس کی خدمت میں نذرانے اور تحائف پیش کرتے تھے - راجا کو کسی قسم کا ٹیکس لگانے کی اجازت نہ تھی - خاندان کے سردار مل کر ایک پنچایت بناتے تھے جسے سمتی کہا جاتا تھا - وہ راجا کا انتخاب کرتی تھی اور راجا امداد کے لیے مشاورتی کمیٹی بناتا تھا، جو سبھا کہلاتی تھی - امن کے زمانے کا سارا وقت عدل و انصاف اور مذہبی رسومات کی ادائیگی میں صرف ہوتا تھا - سزائیں نہایت سخت تھیں اور اکثر اوقات معمولی جرائم پر بڑی سنگین سزائیں دی جاتی تھیں -

معاشرتی زندگی :

آریوں کی طرز معاشرت بالکل سادہ تھی- عموماً ایک قبیلے کے لوگ ایک جگہ مکانات بناتے تھے -

چند مکانات کا مجموعہ گاؤں کہلاتا تھا۔ ہر کنبہ اپنے خاندانی بزرگ کے زیر اثر ہوتا تھا ۔ کنبے کے لوگ اکثر مل کر رہنا پسند کرتے تھے۔ وہ امن پسندی اور صلح جوئی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے ۔ خاندانی جھگڑوں کا فیصلہ کنبہ کے افراد آپس میں مل کر کرتے تھے ۔ مویشیوں کی بہتات امارت کی نشانی سمجھی جاتی تھی ۔ عورتوں کا احترام کیا جاتا تھا ۔ بچپن کی شادی کا رواج نہ تھا ۔ شادی کو ایک مقدس رشتہ تصور کیا جاتا تھا جس کا توڑنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ طلاق کا بالکل رواج نہ تھا ۔ ایک آدمی کو ایک ہی شادی کرنے کا حق حاصل تھا مگر امراء کا طبقہ اس سے مستثنیٰ تھا ۔ بالعموم عورتیں خاوند کا انتخاب خود کرتی تھیں اور رسومات میں خاوند کے ساتھ برابر کی شریک ہوتی تھیں۔ بیوہ عورتوں کو دوسری شادی کرنے کی اجازت تھی۔ شکار، غلہ، پھل اور جنگلی درختوں کی جڑیں ان کی من بھاتی خوراک تھی ۔ دودھ، دہی اور مکھن کا استعمال عام تھا ۔ بعض بوٹیوں کے رس کو دودھ میں ملا کر سوم رس تیار کرتے اور اس سے نشہ اور سرور حاصل کرتے تھے ۔ مرد سادہ زندگی گزارتے تھے مگر عورتیں سونے چاندی کے زیورات سے آراستہ ہوتی تھیں ۔

مذہبی زندگی :

آریا سورج، چاند، بجلی، پانی وغیرہ کی پوجا کرتے تھے ۔ ان کے علاوہ لاتعداد دیوتاؤں کو بھی پوجتے تھے ۔ دیوی، دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے قربانیاں دیتے تھے ۔ قربانی کا فریضہ صرف برھمن لوگ ہی سرانجام دیتے تھے ۔ قربانی کے وقت گوی، دودھ، اناج، گوشت اور سوم رس دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھایا جاتا تھا ۔ یہ لوگ ویدوں کو الہامی کتابیں مانتے تھے اور ان کے مصنفین رشی کہلاتے تھے ۔

معاشی زندگی :

آریا لوگ گاؤں میں رہتے تھے ۔ گاؤں کا افسر گرمانی کہلاتا تھا جو ہر قسم کے مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا ۔ لوگوں کا عام پیشہ زراعت تھا ۔ گندم اور جو کی کاشت کثرت سے ہوتی تھی ۔ مویشی پالنے کا رواج عام تھا ۔ لوگ تجارت اور صنعت سے بھی آشنا تھے ۔ اگرچہ ان لوگوں کی زندگی سادہ تھی اور ہر آدمی اپنی ضرورت خود مہیا کرتا تھا ۔ لیکن رفتہ رفتہ لوگ پیشہ وری کی طرف مائل ہوتے گئے اور مختلف لوگوں نے مختلف پیشے اپنا لیے ۔ جن میں کپڑا بننا، چمڑا بنانا، مٹی کے برتن بنانا، رتھ بنانا اور زیورات بنانا قابل ذکر ہیں ۔ جنگوں میں رتھ اور مختلف دھاتوں سے بنے ہوئے اوزار استعمال ہوتے تھے، اشیاء کی نقل و حمل کے لیے رتھ، بیل گاڑیاں استعمال کی جاتی تھیں ۔

بدھ مت :

چھٹی صدی قبل مسیح تاریخ عالم میں مذہبی انقلابات سے مشہور ہے ۔ اس صدی میں لوگ فرسودہ رسم و رواج اور مذہبی پیچیدگیوں سے بے زار ہو چکے تھے ۔ برصغیر میں ذات پات کی پابندیوں کی وجہ سے برھمنوں نے مذہبی پیشواؤں کے لبادے میں مذہبی اجارہ داری کے علاوہ آہستہ آہستہ سیاسی اجارہ داری بھی قائم کر لی تھی ۔ وہ اتنے طاقتور ہو گئے تھے کہ راجے مہاراجے بھی ان کے محتاج اور ان سے کم

مرتبہ ہوکر رہ گئے تھے - مذہبی رسومات کو گورکھ دھندا بنا کر رکھ دیا گیا تھا - قربانیوں کا معیار اتنا بلند کر دیا گیا تھا کہ جانوروں کے علاوہ انسانوں تک کو قربان کر دیا جاتا تھا - سب سے پریشان کن بات یہ تھی کہ ان قربانیوں میں برھمن کا ہونا لازمی تھا - اس کے عوض انھیں انعام و اکرام دیا جاتا تھا - شودر تو پہلے ہی نالاں تھے، لیکن اب کشتری اور ویش بھی ان بے جا مذہبی پابندیوں اور بے سود قربانیوں کی وجہ سے مذہب سے بیزار نظر آنے لگے - فرسودہ رسم و رواج اور مذہبی پیچیدگیوں سے بیزار عوام اب برھمن کے پنجہ استبداد سے نجات حاصل کرنے کی صورتیں سوچنے لگے - وہ کسی ایسے نجات دہندہ کا انتظار کرنے لگے، جو انھیں اس ظلم و استبداد سے رہائی دلا سکے - قدرت نے ان مظلوموں کی فریاد سنی اور ان کی رہنمائی کے لیے گوتم بدھ کو بھیج دیا -

بدھ کی تعلیم :

بدھ مت کی تعلیم بڑی سادہ تھی - وہ ہندو مذہب کی فرسودہ رسوبات اور لاتعداد قربانیوں کے خلاف تھا - اس نے اپنے مذہب کی بنیاد خواہشات کو ختم کرنے اور جان داروں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے پر رکھی - نیک اعمال کو اعتقادات پر ترجیح دی - جانوروں کی قربانی کو ممنوع قرار دیا، انسانوں کو سخت ریاضت سے منع کیا اور خدمت خلق کا سبق دیا - مہاتما بدھ نے انسانی نجات کے لیے آٹھ اصول وضع کیے اور ان پر سختی سے عمل پیرا ہونے کی تلقین کی - وہ اصول سچ بولنا، کامل یقین رکھنا، ٹھیک سوچنا، صحیح عمل، نیک کوشش، حلال کمائی، پاک بازی اور محویت ہیں -

بانیٔ مذہب کی سادگی، سادہ اور عام فہم تعلیم، بھکشوؤں اور بھکشنوں کے پرچار، راجاؤں اور مہاراجوں کی ذاتی دلچسپی سے یہ مذہب نہ صرف برصغیر کے طول و عرض میں پھیل گیا، بلکہ برما، چین، جاپان، تبت اور لنکا کے ممالک میں بھی لوگ کافی تعداد میں اس مذہب کے پیروکار بن گئے - لیکن پندرہ سو سال کے اندر ہی اپنے پیروؤں کی عملی کمزوریوں، برھمنوں کی کوششوں اور یکے بعد دیگرے اپنے مربی حکمرانوں کے ختم ہونے سے زوال پذیر ہو گیا -

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد :

ظہور اسلام سے پہلے بھی عرب برصغیر پاک و ہند سے آشنا تھے - عرب اور ہندوستان میں تجارتی تعلقات قائم تھے - عرب تاجر مصر و شام سے سامان تجارت لےکر یہاں آتے اور یہاں کا تجارتی مال مصر و شام کے راستے یورپ تک پہنچاتے تھے - اسلام نے عربوں میں نئی جان ڈال دی تھی - اور ان کی بحری، بری اور تجارتی مہموں کو تیز تر کر دیا تھا - اسلام کی آمد سے پہلے بھی کچھ عرب سراندیپ اور مالدیپ کے جزیروں میں آباد ہو گئے تھے - ظہور اسلام کے بعد بھی عرب تاجر ادھر آتے رہے اور جنوبی ہند میں ان کی تجارتی حیثیت نمایاں ہوگئی - مسلمانوں کی کاروباری دیانتداری اور اخلاق سے متأثر ہو کر مقامی راجے ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے - انھیں پوری مذہبی آزادی حاصل تھی - اور انھیں اشاعت اسلام سے بھی نہیں روکا جاتا تھا - چنانچہ ان تاجروں نے تجارت کے ساتھ ساتھ اسلام کی تبلیغ کا کام بھی جاری رکھا -

سب سے پہلے عربوں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بمبئی کے قریب تھانہ پر حملہ کیا، لیکن یہ حملہ حضرت عمر کی اجازت کے بغیر کیا گیا تھا، جس پر انھوں نے ناراضگی کا اظہار فرمایا، اس لیے اس کے بعد ہندوستان کے ساحل پر مسلمانوں نے کوئی حملہ نہ کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں حاکم بن جبلہ کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے پاک و ہند کی سرحد پر بھیجا، جس نے یہاں حالات کا جائزہ لے کر اس طرف فوج کشی نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ پھر امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد حکومت میں افغانستان کے ایک حصے کو فتح کرکے ملتان تک پہنچا۔ اور واپس لوٹ گیا۔ تاہم ساتویں صدی کے اواخر تک بلوچستان کے ایک حصے اور جنوبی افغانستان پر عربوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔

اُموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانے میں حجاج بن یوسف ثقفی کو مشرق علاقوں کا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ حجاج کی سرکردگی میں اسلامی فتوحات کا ایک شاندار باب شروع ہوا۔ اس زمانے کے کچھ عرب تاجر سراندیپ (سری لنکا) کے جزیرے میں آباد ہو چکے تھے۔ ان میں سے بعض تاجروں کا انتقال ہو گیا۔ لنکا کے راجا نے حاجیوں کے ایک جہاز میں ان کے بیوی بچوں، مال و اسباب اور تحفے تحائف، خلیفہ کی خدمت میں روانہ کیے۔ اس جہاز کو کراچی کے قریب سمندری قزاقوں نے لوٹ لیا اور جہاز پر موجود لوگوں کو قیدی بنا لیا۔ جب یہ خبر حجاج کو پہنچی تو اس نے راجا داہر سے مطالبہ کیا کہ قیدیوں کو رہا کیا جائے، تحفے واپس کیے جائیں، اور جن لوگوں نے یہ حرکت کی ہے انھیں سزا دی جائے۔ لیکن راجہ داہر نے بہانہ کرکے اس معاملے کو ٹالنا چاہا۔ حجاج پہلے ہی راجا داہر سے ناراض تھا، کیونکہ اس نے پہلے ہی کچھ عرب باغیوں کو پناہ دے رکھی تھی، چنانچہ حجاج نے راجا کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔

حجاج نے خلیفہ ولید سے فوج کشی کی اجازت مانگی۔ ولید نے پہلے تو انکار کر دیا، لیکن حجاج کے اصرار پر حملے کی اجازت دے دی۔ حجاج نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں، اور اپنے سترہ سالہ بھتیجے محمد بن قاسم کو فوج دے کر سندھ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ محمد بن قاسم بارہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ خشکی کے راستے روانہ ہوا۔ حجاج نے بصرہ سے جہازوں کا ایک بیڑا روانہ کیا جو سامان رسد، بھاری منجنیقوں اور دوسرے جنگی سامان سے لدا ہوا تھا۔ جس روز محمد بن قاسم دیبل پہنچا اسی روز بحری بیڑا بھی دیبل کی بندرگاہ پر لنگرانداز ہو گیا۔

دیبل کا محاصرہ شروع ہوا۔ محصورین نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ شہر کے درمیان ایک اُونچے مندر پر ایک جھنڈا نسب تھا۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ جب تک یہ جھنڈا لہراتا رہے گا، اُس وقت تک کوئی طاقت شہر پر غالب نہیں آ سکتی۔ محمد بن قاسم نے منجنیق کے افسر کو جھنڈا گرانے کا حکم دیا۔ اس نے منجنیق سے ایک پتھر پھینک کر جھنڈا نیچے گرا دیا۔ شہر والوں کے حوصلے پست ہو گئے اور

چند روز کے بعد شہر فتح ہو گیا ۔ مسلمان قیدیوں کو چھڑایا گیا ۔ اور ان کے آرام و آسائش کا انتظام کیا گیا داروغہ جیل نے اسلام قبول کر لیا ۔ محمد بن قاسم نے دیبل کی نیابت اور انتظام اس کے سپرد کر دیا ۔ اور امن عامہ کا اعلان کر دیا ۔

دیبل کی فتح کے بعد محمد بن قاسم دریائے سندھ کے کنارے نیرون کی طرف بڑھا ۔ فوج جب شہر کے قریب پہنچی تو نیرون کا حاکم خود تحائف لے کر حاضر ہوا ۔ محمد بن قاسم نے اپنا ایک افسر یہاں متعین کیا اور خود سیوستان (سیہوان) کی طرف روانہ ہوا ۔ یہ شہر بھی لڑائی کے بغیر فتح ہو گیا ۔ اس کے بعد سیسم اور بھٹ کے شہر یکے بعد دیگرے فتح ہوئے ۔ بہت سے شہروں اور قلعوں کو فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم واپس نیرون پہنچا، تا کہ دریائے سندھ کو عبور کر کے راوڑ (روہڑی) پر حملہ کرے، جہاں راجا داہر ڈیرے ڈالے پڑا تھا ۔

لشکر اسلام نے دریا عبور کر لیا تو راجا پریشان ہوکر راوڑ سے باہر نکلا ۔ لیکن جب کہیں سے کمک آنے کی اُمید نہ رہی تو واپس جا کر پھر قلعہ بند ہوگیا ۔ جنگ کا آغاز ہوا، داہر نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن شکست کھا کر مارا گیا ۔ اب ارور اور برہمن آباد کی باری آئی، جہاں راجا داہر کے بیٹے حکمران تھے ۔ لوگوں نے ان کا ساتھ دینے کی بجائے خفیہ طور پر اسلامی لشکر کی امداد کی، اور دونوں شہر فتح ہوگئے ۔ ارور کی فتح کے بعد محمد بن قاسم باتیہ کی طرف روانہ ہوا، جس کے والی نے لڑائی کے بغیر ہی اطاعت قبول کر لی ۔ اسلامی فوجیں یہاں سے ملتان کی طرف روانہ ہوئیں ۔ ملتان کا گورنر گور سنگھ متوقع حملے کے پیش نظر پہلے ہی تیاریوں میں مصروف تھا ۔ جنگ شروع ہوئی تو مقابلے کی تاب نہ لا کر قلعہ بند ہو گیا ۔ محاصرے نے طول کھینچا تو مسلمانوں نے منجنیقوں کی مدد سے فصیل پر پتھر برسانے شروع کر دیے ۔ جس پر دشمن خود بخود مقابلے میں آ گیا ۔ چنانچہ زبردست مقابلے کے بعد شہر فتح ہوگیا ۔ ملتان کی فتح پر محمد بن قاسم اس قدر خوش ہوا کہ اس نے مال غنیمت سے خمس بھی نہ نکالا اور سب کا سب مال فوج میں تقسیم کر دیا ۔ ملتان کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے پنجاب کے کچھ حصے فتح کیے ۔ اور شمالی ہند کی طرف پیش قدمی کے منصوبے بنا رہا تھا کہ خلیفہ سلیمان کا فرمان پہنچا اور اسے اپنا کام نامکمل چھوڑ کر مجبوراً واپس جانا پڑا ۔

محمد بن قاسم نے مفتوح لوگوں کے ساتھ انتہائی رواداری کا سلوک کیا ۔ انھیں پوری پوری مذہبی آزادی دی ۔ اس نے مندروں اور گرجوں کی پوری پوری تکریم کی ۔ برہمنوں کی قدیم مراعات اور حقوق برقرار رکھے ۔ راجا داہر کے عہد حکومت کے عہدے داروں کو ان کے عہدوں پر بحال رہنے دیا ۔ کاریگروں اور دستکاروں کو اپنی حالت درست کرنے کے لیے مالی امداد دی ۔ بہت سے ٹیکس معاف کر دیے ۔ اس نے عوام کی فلاح و بہبود کی طرف پوری پوری توجہ دی جس سے عوام خوشحال ہوگئے، اس کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر لوگ اسے اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے، چنانچہ جب یہ یہاں سے رخصت ہونے لگا تو لوگ زار و قطار رو

رہے تھے، ہندوؤں کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ اس کے جانے کے بعد انھوں نے اس کا بت بنا کر مندر میں رکھ لیا۔

سلاطین دہلی کے دور میں اسلامی تہذیب :

برصغیر میں مسلمان حکومت کی بنیاد محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں رکھی۔ لیکن اس کے جانے کے بعد تقریباً اڑھائی سو سال تک راجپوت برصغیر میں حکومت کرتے رہے۔ ۹۹۸ء میں سلطان محمود غزنوی نے برصغیر کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اس نے برصغیر پر سترہ حملے کیے۔ آخری حملے کے بعد لاہور میں اپنا ایک گورنر مقرر کیا۔ جس سے برصغیر میں مسلم حکومت کی داغ بیل پڑی۔ سلطان محمود کے تقریباً دو سو سال بعد محمد غوری برصغیر میں آیا اور یہاں باقاعدہ حکومت کی بنیاد رکھی۔ سلطان محمد غوری کے بعد قطب الدین ایبک نے خاندان غلاماں کی بنیاد رکھی۔ اِس خاندان نے تقریباً سو سال تک حکومت کی۔ اس خاندان کے زمانے میں دہلی مسلمانوں کا دارالحکومت بنا۔ خاندان غلاماں کے بعد خلجی، تغلق، سادات، لودھی، سوری اور مغلیہ خاندان برصغیر پر حکمرانی کرتے رہے۔

قطب الدین ایبک سے لے کر لودھی خاندان تک کے بادشاہوں کو سلاطین دہلی کہا جاتا ہے۔ سلاطین دہلی نے اپنے نظام حکومت کی بنیاد اسلام کے اصولوں پر رکھی تھی، جس کی وجہ سے مسلم حکومتوں کو غیرمسلم حکومتوں کی نسبت زیادہ مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ سلاطین دہلی کے دور حکومت کی چیدہ چیدہ خصوصیات درج ذیل ہیں۔

نظام حکومت :

سلاطین دہلی خود مختار فرماں روا تھے۔ ان کے اختیارات بڑے وسیع تھے، لیکن اس کے باوجود شریعت اسلامی کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ان میں سے بعض اپنے آپ کو عباسی خلیفہ کا نائب سلطنت سمجھتے تھے۔ چنانچہ بعض سلاطین نے خلیفہ وقت سے حکومت کی سند بھی حاصل کی تھی۔ بادشاہ سیاسی معاملات کے علاوہ فوج کا سپہ سالار، دین کا محافظ اور منصف بھی ہوتا تھا۔ سلطنت دہلی موروثی بھی تھی اور غیرموروثی بھی۔ موروثی اس لحاظ سے کہ عموماً بادشاہ کے بعد اس کا بیٹا ہی تخت نشین ہوتا تھا، غیرموروثی اس لحاظ سے کہ سلطان کے خاندان میں سے یا بڑے بڑے اُمراء میں سے کوئی بھی بلند حوصلہ اور با اثر شخص اپنی قوت بازو سے تخت پر قابض ہو سکتا تھا۔

وزیر کے بعد فوج کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا جو فوج سے متعلقہ تمام امور کے انتظام کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ مذہبی امور کا نگران صدرالصدور یا صدر جہاں کہلاتا تھا۔ وہی قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) بھی ہوتا تھا۔ شاہی خط و کتابت اور اس کی ترسیل کے لیے دیوان انشاء اور دیوان برید قائم تھے۔ تمام سلطنت کئی صوبوں میں منقسم تھی۔ ہر صوبے میں سلطان کی طرف سے ایک حاکم مقرر ہوتا تھا جو صوبے کے انتظام کی نگرانی کرتا تھا۔ ہر صوبے کی آمدنی اور خرچ کے حساب کے لیے دیوان مقرر تھے۔

عدل و انصاف :

عدل و انصاف کے لیے دیوان قضا قائم تھا ۔ چونکہ مقدمات کے فیصلے شرح کے مطابق ہوتے تھے اس لیے اسے دیوان شرح بھی کہا جاتا تھا ۔ دیوان قضا بھی صدر جہاں یعنی قاضی‌القضاۃ کے ماتحت ہوتا تھا ۔ سارے ملک کے مفتی اور قاضی دیوان قضا کے ماتحت ہوتے تھے ۔ قاضیوں کا تقرر مرکز سے ہوتا تھا ۔ ہر شہر میں ایک قاضی (جج) مقرر ہوتا تھا جو مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا ۔ گاؤں میں فیصلوں کے لیے پنچایت ہوا کرتی تھی ۔ عدل و انصاف کے معاملہ میں سلاطین خود بھی گہری دلچسپی لیتے تھے ۔

نظام حکومت میں عدل و انصاف کو بہت اہمیت حاصل تھی ۔ انصاف کے معاملے میں امیر اور غریب، بادشاہ اور رعایا، مسلم اور غیرمسلم میں کوئی فرق نہ تھا ۔ قانون کی نگاہ میں سب برابر تھے ۔ رعایا کے ہر طبقے کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا تھا ۔

انصاف کے مقابلے میں سلاطین اپنے آپ کو بھی قانون سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے ۔ محمد تغلق کو خود ایک مقدمے کے سلسلے میں قاضی کی عدالت میں پیش ہونا پڑا تھا ۔ سلطان التمش نے اپنے محل کے باہر زنجیر عدل لگوا رکھی تھی اور حکم دے رکھا تھا کہ فریادی سرخ لباس پہنیں تاکہ بادشاہ انھیں آسانی سے پہچان سکے اور انھیں انصاف مہیا کر سکے ۔ فیروز شاہ تغلق کا عہد بھی عدل و انصاف کے لیے خاصا مشہور ہے ۔ بلبن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ عدل و انصاف کے معاملے میں نہ شہزادوں کی رعایت کرتا تھا نہ امراء کی ۔ سلاطین دہلی کے نزدیک حکومت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ عوام کو انصاف مہیا کریں اور اس سلسلے میں کسی سے رو رعایت نہ کریں، عام طور پر سلاطین یہ فرض پوری طرح بجا لاتے تھے اور کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا تھا ۔

علوم و فنون :

مسلمان بادشاہ خود عالم تھے، عالموں کی قدر کرتے تھے اور علمی اور ادبی کاموں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے ۔

منگولوں کے فتنے کی وجہ سے جن اصحاب علم نے ایران و توران سے ہجرت کی تھی ۔ پاک و ہند کے سلاطین اور امراء کے دربار ان کی آماجگاہ بن گئے تھے ۔ چنانچہ دہلی اور صوبائی مرکزوں میں مختلف علوم و فنون کے ماہرین کا ایک اچھا اجتماع رہتا تھا ۔ التمش نے فخرالملک جیسے عالم و فاضل کو بغداد سے بلوا کر اپنا وزیراعظم بنایا ۔ رضیہ سلطانہ اور ناصرالدین محمود نے بھی یہ سلسلہ جاری رکھا ۔ بلبن بھی علوم و فنون کا شیدائی تھا ۔ علاؤالدین خلجی کے دربار میں وسط ایشیا سے علماء آتے اور عزت پاتے ۔ محمد تغلق کو خود بہت سے علوم پر عبور حاصل تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے دسترخوان پر ہر کھانے پر کم و بیش دو سو علماء موجود ہوتے تھے ۔ لودھی خاندان کے حکمرانوں نے بھی علم و ادب کی بہت خدمت کی ہے ۔

اس زمانے میں فن شاعری کو بھی خوب عروج حاصل ہوا ۔ بادشاہ خود بھی شعر کہتے تھے ۔ صوفی

بزرگوں کو بھی شاعری سے گہری دلچسپی تھی ۔ شیخ شرف‌الدین، امیر خسرو، امیر حسن دہلوی جیسے بلند پایہ شاعر اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ دیگر علوم میں علم ہیئت، علم ریاضی، علم طب، تاریخ نویسی، خطاطی اور قرأت کے اعلیٰ پایہ کے اُستاد موجود تھے ۔ فیروز شاہ کی زیرنگرانی فن طب پر کتاب مرتب کی گئی، جسے طب فیروز شاہی کہا جاتا ہے ۔ فیروز شاہ نے سنسکرت سے بھی بعض کتب کا ترجمہ کرایا ۔

مسلمان حکمرانوں کو تعمیرات کا بھی بڑا شوق تھا ۔ قطب الدین ایبک نے دہلی میں ایک بڑی مسجد قوت الاسلام بنوائی ۔ قطب مینار کی تعمیر شروع کرائی جو التمش کے عہد میں مکمل ہوا ۔ علاؤالدین نے بھی عظیم‌الشان عمارات تعمیر کروائیں ۔ لائی دروازہ اس کے زمانے میں اسلامی فن تعمیر کا بہترین نمونہ تھا ۔ غیاث‌الدین تغلق نے کئی نئے شہر آباد کیے ۔ محمد تغلق نے عادل آباد کا قلعہ بنوایا ۔ فیروز تغلق نے کئی شہر بنائے ۔ لودھی خاندان نے بھی کئی خوبصورت مساجد اور مقبرے بنوائے، ان عمارات پر نقاشی و خطاطی قابل دید اور ان کی مضبوطی قابل تعریف ہے ۔

مذہبی رواداری :

ان حکمرانوں کے زمانے میں اسلامی تعلیم پر پوری طرح عمل کیا گیا ۔ معاشرے میں غلام اور آقا کے امتیاز کو ختم کیا گیا ۔ ہندوؤں میں بھی ذات پات کے رواج کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ۔ مسلمانوں نے ہندوؤں پر بیشمار احسان کیے ۔ انھیں سول اور فوجی محکموں میں اعلیٰ عہدے دیے گئے اور انھیں مکمل مذہبی آزادی دی گئی ۔ قطب‌الدین ایبک نے ہندوؤں کے ساتھ فیاضی کا سلوک روا رکھا التمش کا رویہ اپنی تمام رعایا کے ساتھ یکساں رہا ۔ فیروز شاہ تغلق نے بھی مساوات کے اصول پر عمل کیا ۔

رفاہ عامہ :

سلاطین دہلی کے زمانے میں رعایا کی فلاح و بہبود کا بہت خیال رکھا جاتا تھا ۔ قطب الدین نے اپنے عہد میں فقیروں، درویشوں اور اپاہجوں کو خیرات دینے کے لیے محکمہ قائم کر رکھا تھا ۔ وہ رعایا کی خوشحالی کے لیے کثیر رقم صرف کرتا تھا ۔ اس سخاوت کی وجہ سے اسے ''لکھ بخش'' بادشاہ کہا جاتا ہے ۔ التمش نے رعایا کی بھلائی کے لیے بہت سے کام کیے ۔ تعلیم کو فروغ دیا اور حکومت کو سیاسی اور اقتصادی طور پر مستحکم کیا ۔ علاؤالدین خلجی نے عوام کی اقتصادی حالات بہتر بنانے کی طرف توجہ دی، اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول کیا ۔ جس کے نتیجے میں ضروریات زندگی سستے داموں ملنے لگیں ۔ اس نے شراب نوشی اور جوئے بازی کو ختم کیا اور ستی کی رسم پر پابندی لگائی ۔ محمد تغلق نے عوام کے فائدے کے لیے کئی ترقیاتی منصوبے بنائے ۔ زمین کا بندوبست کیا، سرائیں اور سڑکیں بنوائیں ۔ سڑکوں پر سایہ دار درخت لگوائے ۔ کنویں کھدوائے اور سکول جاری کیے ۔ فیروز شاہ تغلق نے ملک سے وحشیانہ سزائیں ختم کیں ۔ غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کے وظیفے مقرر کیے ۔ بیروزگاروں کو روزگار مہیا کرنے کا بندوبست کیا ۔ سرائیں، مساجد، پل اور ہسپتال بنائے ۔ نہریں کھدوائیں، زرعی اصلاحات نافذ کیں اور تمام غیرشرعی ٹیکس ختم کر دیے ۔

معاشرتی برائیوں کا خاتمہ :

مسلمان سلاطین کے ساتھ علماء اور شیوخ بھی برصغیر میں تشریف لائے تھے ۔ وہ اسلامی زندگی کا صحیح نمونہ تھے، ان کے دم قدم سے اسلام بڑی تیزی سے پھیلنا شروع ہوگیا ۔ مساوات اور توحید کے اصولوں نے ہندوؤں کے آداب معاشرت کو بہت متأثر کیا، جس کی وجہ سے ان کے رہنے سہنے کے طریقوں میں تبدیلی آگئی ۔ ہندوؤں کے کچھ سنجیدہ لوگوں نے اپنے مذہب کی خرابیوں کا جائزہ لیا اور ان کے تدارک کے لیے کوششیں شروع کر دیں جس کی بنا پر چند قبیح معاشرتی برائیوں کا خاتمہ ہوا ۔

مغلیہ دور میں اسلامی تہذیب :

مغل حکمرانوں نے برصغیر پاک و ہند میں تقریباً تین سو سال تک حکومت کی ۔ ان میں بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاهجهان اور اورنگ زیب بہت مشہور ہیں ۔ تہذیب و تمدن، علوم و فنون، صنعت و حرفت زراعت و تجارت اور عدل و انصاف کی وجہ سے مغلیہ دور برصغیر میں مسلمانوں کا سنہری زمانہ کہلاتا ہے ۔ مغلوں کے دور حکومت میں زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ترقی ہوئی، جس کا مختصر ذکر درج ذیل ہے ۔

نظام حکومت :

مغل دور میں بادشاہ قوت کا سرچشمہ ہوتا تھا ۔ سارے اختیارات کی باگ ڈور اس کے اپنے ہاتھ میں ہوتی تھی اُمراء، وزراء اور صوبہ داروں کا تقرر، تبدیلی، موقوفی اور بحالی اس کی اپنی مرضی پر موقوف ہوتی تھی ۔ بادشاہ سپہ سالاری کے فرائض بھی خود ہی سرانجام دیتا تھا ۔ خزانہ بھی اس کے اپنے تصرف میں ہوتا تھا اور قاضی بھی خود مقرر کرتا تھا ۔ اس کے سامنے بھی خاص خاص مقدمے پیش ہوتے ۔ اس کی عدالت ملک کی بڑی عدالت تھی جس میں اپیلیں پیش کی جاتی تھیں ۔ ابن حسن کے الفاظ میں مغل بادشاہ ''حکومت کا صدر، افواج ملک کا سپہ سالار، عدل کا سرچشمہ، مقنن اور ملک میں آخری و قطعی فیصلے کا اختیار رکھتا تھا'' ۔ اس کی قوت پر کوئی قانونی پابندی نہ تھی اور حکومت کی تمام شاخوں میں قوت کا سرچشمہ وہی تھا، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ بادشاہ کے اختیار غیر محدود تھے ۔ اسے رائے عامہ کا خیال رکھنا پڑتا تھا سوائے اکبر کے سارے مغل بادشاہ شریعت اسلامی کا بڑا احترام کرتے تھے ۔ بادشاہ عوام کے ساتھ رابطہ رکھتا اور ان کی شکایات اور تکالیف کو دور کرنے کی طرف توجہ دیتا تھا ۔

مغلوں کی سلطنت میں بہت سے وزراء تھے جو ملکی معاملات سرانجام دیتے تھے ۔ وزراء میں سے سب سے اونچا درجہ بھی وکیل کا تھا لیکن اسے ملکی نظم و نسق میں کوئی دخل نہیں تھا ۔ البتہ دیوان (وزیر مال) کو بڑی اہمیت حاصل تھی یہ ملکی محاصل جمع کرتا اور سلطنت کی آمدنی اور خرچ کا حساب رکھتا تھا ۔ فوج کے اعلیٰ افسر کو میر بخشی کہتے تھے جو وزیر فوج کا درجہ رکھتا تھا ۔ فوج کی بھرتی، نگہداشت، تنخواہ کی تقسیم، فوج کے ساز و سامان، ہتھیاروں اور سواری کے گھوڑوں کی جانچ پڑتال اس کے ذمے تھی ۔ صدرالصدور کا درجہ بہت اونچا تھا، امور مذہبی کے علاوہ تعلیم اور عدالت کے محکمے بھی اس کے سپرد تھے

وہ قاضی القضاۃ کے فرائض بھی سرانجام دیتا تھا ۔ سلطنت میں متعین تمام قاضی اس کے ماتحت ہوتے تھے ۔ صدقات و خیرات کی تقسیم اور مشائخ و علماء کے وظائف کا انتظام بھی اس کے سپرد تھا ۔

انتظامی لحاظ سے مغل شہنشاہوں نے ملک کو کئی صوبوں میں تقسیم کر رکھا تھا ۔ ہر صوبے میں ایک صوبے دار (گورنر) ہوتا تھا ۔ جس کا تقرر بادشاہ خود کرتا تھا ۔ اسے دیوانی اور فوجی دونوں اختیارات حاصل تھے ۔ صوبے دار عام طور پر شاہی خاندان سے ہوتا تھا یا بادشاہ کا بہت قریبی مصاحب ہوتا تھا ۔ صوبوں کے دیوان براہ راست مرکزی حکومت کے دیوان کے ماتحت اور صوبوں کے قاضی صدرالصدور کے ماتحت ہوتے تھے ۔ صوبہ داروں کو ان پر چنداں اختیار حاصل نہ تھا ۔

علم و ادب :

مغلوں کے عہد میں علم و ادب کو بے پناہ ترقی ہوئی ۔ شاہان مغلیہ علم کی سرپرستی کی طرف خاص توجہ دیتے تھے ۔ وہ عالم تھے اور علماء اور اساتذہ کی قدر کرتے تھے ۔ بابر خود بڑا عالم و فاضل تھا وہ فارسی، عربی اور ترکی زبان پر دسترس رکھتا تھا ۔ "تزک بابری" ادب کا بہترین نمونہ ہے ۔ ہمایوں شاعری کے علاوہ علم نجوم پر بھی دسترس رکھتا تھا ۔ اس کی ایک بہت بڑی لائبریری تھی، جو جلاوطنی کے دنوں میں بھی اس کے ساتھ رہی ۔ اکبر گو خود ان پڑھ تھا، لیکن اس عہد کے بڑے جلیل القدر علماء اور ادیب اس کے دربار میں جمع رہتے تھے ۔ اس کے عہد میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں ۔ آئین اکبری اس دور کی اہم تصنیف ہے ۔ جہانگیر علم و ادب کا دلدادہ تھا ۔ فارسی اور ترکی زبانوں پر دسترس رکھتا تھا ۔ "تزک جہانگیری" کا شمار فارسی کی بلند پایہ کتب میں ہوتا ہے ۔

شاھجہان بھی علم و ادب کا بڑا مربی اور سرپرست تھا ۔ اس کا بیٹا دارا بڑا فاضل شخص تھا اس نے اپنشدوں اور "بھگوت گیتا" کا ترجمہ فارسی میں کیا ۔ اور بہت سی کتابیں لکھیں ۔ شاھجہان کے عہد میں تعلیم کی اشاعت وسیع پیمانے پر ہوئی ۔ جامع مسجد دہلی کے ساتھ ملحقہ مدرسہ اس زمانہ میں یونیورسٹی کا درجہ رکھتا تھا ۔ اورنگ زیب عالمگیر مغلوں میں سب سے زیادہ عالم و فاضل تھا ۔ "فتاویٰ عالمگیری" اس کی زیرسرپرستی مرتب ہوئی ۔ "عالمگیر نامہ" اور "مآثر عالمگیری" بھی اس عہد کی مشہور کتابیں ہیں ۔ اس کے عہد میں دینی مدرسوں کو بہت ترقی ہوئی ۔ اساتذہ کے وظیفے مقرر ہوئے ۔ اور طلبا کے اخراجات شاہی خزانے سے پورے کیے جاتے تھے ۔ عالمگیر کے عہد میں شاہی لائبریری اور امراء کے کتب خانے دینی کتب سے بھرے ہوئے تھے ۔ مغلوں کے دور زوال میں بھی علمی سرگرمیاں بدستور قائم رہیں ۔ محمد شاہ رنگیلے کے ادبی ذوق کا اندازہ اس کی عظیم لائبریری سے لگایا جا سکتا ہے ۔ جس پر جاتے جاتے نادر شاہ ہاتھ صاف کر گیا ۔

تعلیم نسواں :

مغلیہ دور میں عورتوں کی تعلیم پر بھی خاص توجہ دی گئی ۔ ہر مسجد کے ساتھ ملحقہ مدرسے میں

بچے اور بچیوں کی مشترکہ تعلیم کا انتظام ہوتا تھا ۔ جہاں انہیں ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی ۔ اس کے علاوہ سرکاری خرچ پر خواتین کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کیا جاتا تھا ۔ اکبر کے عہد میں شاہی محل کے بعض حصے، خواتین کے مدرسے کے لیے وقف تھے ۔ مغل شہزادیاں اور بیگمات بھی تعلیم نسواں میں کافی دلچسپی لیتی تھیں ۔ ان میں نور جہاں، ممتاز محل، جہاں آرا بیگم، زیب النساء، بدرالنساء بہت بلند مقام رکھتی ہیں ۔ گلبدن بیگم "ہمایوں نامہ" کی مصنف تھی ۔ نور جہاں اور ممتاز محل فارسی کی عالم تھیں ۔ جہاں آرا بیگم کو علم و ادب سے بے حد لگاؤ تھا ۔ زیب النساء قرآن پاک کے معانی اور تشریح کرتی تھی اور اعلیٰ درجہ کی خطاط تھی ۔

علم طب :

مغل سلاطین نے علم طب کی بھی خوب حوصلہ افزائی کی ۔ اکبر کے دربار میں طبیبوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی ۔ طب کی مشہور کتاب "قانون" کی شرح بھی اس زمانے میں حکیم علی گیلانی سے لکھوائی گئی ۔ جہانگیر کے زمانے میں بڑے بڑے سرکاری ہسپتال قائم تھے ۔ شاہجہان نے ان ہسپتالوں میں اضافہ کیا ۔ اور دہلی میں ایک مرکزی ہسپتال قائم کیا ۔ عالمگیر کے درباری اطباء کا فنی معیار بہت بلند تھا ۔

خطاطی :

اسلامی فنون میں خوش نویسی کو بہت اہمیت حاصل ہے ۔ مغل بادشاہوں نے فن خطاطی کی ترق کے لیے بہت کام کیا ہے ۔ اور ان کے دور میں فن خطاطی کو بہت عروج حاصل ہوا ۔ بابر خط بابری کا موجد تھا ۔ شہاب معماتی اور ملا بقاہی ہمایوں کے مشہور درباری کاتب تھے ۔ اکبر نے بھی خوشنویسی کی بہت سرپرستی کی ۔ اس زمانے میں خط نستعلیق مقبول عام تھا ۔ کتابت کے لیے "کارخانہ کتاب سازی" قائم کیا گیا ۔ محمد حسین کاشمیری، ملا میر علی، مولانا عبدالحئی، مولانا عبدالرحیم، بایزید، ٹوڈر مل، پنڈت جگن ناتھ عہد اکبری کے مشہور کاتب گزرے ہیں ۔ جہانگیر کے دربار کے مشہور کاتب مشکین رقم اور محمد حسین مرزا اپنے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے ۔ شاہجہان کے عہد میں عبدالرشید دیلمی اور میر عماد نستعلیق کے مشہور کاتب اور ماہر فن تھے ۔ اورنگ زیب کو خطاطی سکھانے کے لیے ایک ایرانی ماہر کی خدمات حاصل کی گئیں، تکمیل فن کے بعد عالمگیر نے اس فن کو بطور شغف جاری رکھا اور اپنے ہاتھ سے قرآن مجید کے کئی نسخے لکھے ۔ پنڈت لکشمی رام، منشی محبوب رائے، یاقوت رقم، جواہر رقم اور زرین رقم عالمگیری عہد کے مشہور کاتب تھے ۔

مصوری :

مصوری کا شوق مغلوں کو وراثت میں ملا تھا ۔ بابر حسن و فطرت کا شیدائی تھا ۔ وہ اپنے ساتھ کئی مصور لایا تھا جو اس کی زیرسرپرستی کام کرتے تھے ۔ ہمایوں کو مصوری سے بے حد شغف تھا ۔

ایران سے واپسی پر خواجہ عبدالصمد اور سید علی دو مشہور ترین مصوروں کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ اکبر کے عہد میں بھی انھیں اہمیت حاصل رہی۔ اکبر نے "کارخانہ کتاب سازی" میں متعدد باتصویر کتب تیار کرائیں۔ اس کے منصب داروں میں کافی تعداد میں مصور شامل تھے۔ جہانگیر کے عہد سے برصغیر میں مصوری کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جہانگیر خود بہترین مصور تھا۔ اس نے اس فن کو درجہ کے کمال تک پہنچا دیا۔ اس کے عہد میں "مغل طرز مصوری" بام کمال تک پہنچا، جو ایرانی اور ہندو فن مصوری کے امتزاج سے معرض وجود میں آیا تھا۔ انسانوں، جانوروں اور مناظر فطرت کی عکاسی کا رواج شروع ہوا۔ شاہجہان نے بھی مصوری کی حوصلہ افزائی کی، اور اس فن میں بے شمار اختراعات کی گئیں۔ اس کے عہد میں فن مصوری عام ہو گیا۔ بادشاہ کے علاوہ امراء نے بھی اس فن کی سرپرستی کی۔

فن تعمیر :

مسلمانوں کے برصغیر میں آنے سے پیشتر یہاں کے لوگ تنگ و تاریک عمارتوں میں رہتے تھے۔ مسلمانوں نے یہاں آکر کھلی اور ہوا دار عمارتوں کو رواج دیا، ان عمارات کی تعمیر میں پکی اینٹوں اور چونے کا استعمال کیا گیا ہے۔ مغل بادشاہوں کی بنوائی ہوئی عمارات اب بھی ان کی عظمت کی یاد دلاتی ہیں۔ بابر اعلیٰ تعمیرات کا ذوق رکھتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایرانی معمار لایا تھا۔ اس نے اپنے عہد میں خوبصورت محلات اور مساجد تعمیر کرائیں۔ پانی پت میں بنائی ہوئی مساجد اب بھی موجود ہیں۔ ہمایوں کا دور اگرچہ پرآشوب تھا، لیکن اس کے باوجود بھی اس نے تعمیری کاموں میں خاصی دلچسپی لی۔ اس نے دین پناہ کا شہر تعمیر کرایا، اور آگرہ میں ہفت ایوان محل بنایا۔ اس کے علاوہ آگرہ اور فتح آباد میں مساجد بھی تعمیر کرائیں۔ اکبر نے بھی بہت سی عمارات تعمیر کرائیں جن میں ہمایوں کا مقبرہ، قلعہ آگرہ، جہانگیری محل، لاہور کا شاہی قلعہ اور فتح پور سیکری کا محل خاص، دیوان خاص، مختلف محلات، جامع مسجد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جہانگیر اگرچہ فن تعمیر میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تھا، تاہم اس کے عہد میں شاہی قلعہ کی موتی مسجد، اعتمادالدولہ کا مقبرہ اور نور جہاں کا تعمیر کردہ مقبرہ جہانگیر قابل ذکر عمارتیں ہیں۔

شاہجہان کے عہد میں فن تعمیر کو عروج حاصل ہوا۔ اسے انجینیئر بادشاہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شاہجہان کا عہد مغلوں کا سنہری زمانہ کہلاتا ہے۔ اس کے عہد میں ہر طرف امن و امان اور خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ اس لیے اس نے اپنی تمام توجہ تعمیرات کی طرف مبذول کی۔ اس کے عہد کی مشہور عمارات میں لال قلعہ دہلی، اس کے دیوان عام اور دیوانِ خاص، تاج محل، آگرہ کی موتی مسجد اور دہلی کی جامع مسجد ہیں۔ ان عمارات میں زیادہ تر سنگ مرمر استعمال کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے یہ عمارات نہایت ہی حسین و جمیل نظر آتی ہیں۔ اس نے ایک بہت خوب صورت تخت بنوایا، جس میں قیمتی جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ اور مور تراشے ہوئے ہیں، اسے تخت طاؤس کہتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے

عہد کی عمارات میں سادگی اور پختگی پائی جاتی ہے۔ لاہور کی شاہی مسجد، دہلی کی زینت النساء مسجد، لال قلعہ، دہلی میں موتی مسجد اور اورنگ آباد میں رابعہ دورانی کا مقبرہ بہت مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ دکن میں بھی اس نے بہت سی مساجد تعمیر کرائی تھیں۔

باغات :

مغلوں کو باغات لگوانے کا بھی بہت شوق تھا۔ آگرہ کا رام باغ اور زہرا باغ، کشمیر میں نسیم باغ، نگین باغ، نشاط باغ اور شالامار باغ، لاہور کا شالامار باغ اور دلکشا باغ بہت مشہور ہیں۔ ان باغات میں نہروں، چشموں، فواروں اور بارہ دریوں کی موجودگی ان کے حسن کو دوبالا کرتی ہے۔ مغل باغات بالعموم دو یا تین طبقات میں منقسم ہوتے تھے۔ نچلے طبقے بیگمات کے لیے وقف تھے۔ اس خاص طرز کی وجہ یہ تھی کہ بیگمات کا حصہ باپردہ رہے۔

معاشرتی زندگی :

مغلیہ دور حکومت میں عوام کی معاشرتی اور اقتصادی حالت کی بہتری کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول نے ایک نئی تہذیب کو جنم دیا۔ ان پر ایک دوسرے کے مذہب، زبان، رسم و رواج اور طرز معاشرت کا اثر ہوا۔ ہندوؤں کے اثر سے مسلمانوں میں بھی ذات پات کا رواج ہو گیا۔ اور سید، مغل، پٹھان کا امتیاز قائم ہوا۔ ہندوؤں میں بچپن کی شادی، بیوہ عورتوں کا دوسرا بیاہ نہ کرنا اور ستی کی رسم جاری تھی۔ تہوار بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے۔ اکبر ہندو تہواروں میں خود شرکت کرتا تھا۔ شاہجہان کے عہد میں دربار میں تہواروں کو منانے کی اجازت تھی۔ مسلمانوں کے تہوار بھی بڑی شان و شوکت سے منائے جاتے تھے۔

مغل شہنشاہ اپنی رعایا کے آرام و آسائش کا خاص خیال رکھتے تھے۔ بادشاہوں کے لنگر ہر وقت جاری رہتے تھے۔ غرباء کی مدد کی جاتی تھی۔ قحط کے دنوں میں قحط زدہ علاقے میں پکا پکایا کھانا مفت تقسیم کیا جاتا تھا۔ لوگوں کی صحت پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ اگرچہ ہسپتال معقول تعداد میں نہ تھے تاہم حکومت دوائیں مفت تقسیم کرتی تھی۔ تعلیم کا بھی خاطر خواہ انتظام تھا۔ جہالت کو دور کرنے کی بہت کوششیں کی گئیں۔ ملک میں جا بجا مدرسے قائم تھے، جہاں مفت تعلیم دی جاتی تھی۔

اقتصادی حالت :

مغل دور میں عوام کی اقتصادی حالت اچھی تھی۔ عوام خوش و خرم زندگی بسر کرتے تھے۔ ہر چیز کی فراوانی تھی۔ اور بھاؤ سستے تھے، قیمتوں کو حد میں رکھنے کے لیے ہر شہر میں کوتوال مقرر تھے۔ مزدور اچھی اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ فضول خرچی کم تھی۔

زراعت :

لوگوں کا عام پیشہ زراعت تھا۔ زراعت کی ترقی کے لیے الگ محکمہ قائم تھا۔ کسانوں کی خوشحالی

کا خیال رکھا جاتا تھا ۔ ملک میں جاگیرداری نظام رائج تھا، لیکن جاگیرداری موروثی نہیں تھی ۔ بحیثیت مجموعی کسان مطمئن تھے ۔ قحط کی صورت میں مالیہ معاف کر دیا جاتا تھا اور تقاوی قرضے دیے جاتے تھے ۔ حکام کو ہدایت تھی کہ وہ کاشتکاروں پر سختی نہ کریں ۔ مالیہ کی شرح بھی مناسب تھی ۔

صنعت و تجارت :

مغلیہ دور میں صنعت و حرفت نے بھی خوب ترقی کی ۔ صنعت و حرفت عام طور پر متوسط طبقہ کے ہاتھ میں تھی جو مزدوروں اور کاریگروں کی محنت سے فائدہ اٹھاتے تھے ۔ سب سے بڑی صنعت سوتی اور ریشمی کپڑے کی تھی ۔ لاہور، احمد آباد، آگرہ اور فتح پور میں کپڑے کے بڑے بڑے کارخانے قائم تھے ۔ ڈھاکہ کی ململ نفاست کی وجہ سے دور دور تک مشہور تھی ۔ کپڑے کی پیداوار اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ ملکی ضرورت سے زائد مال عرب، مصر، برما وغیرہ کو برآمد کیا جاتا تھا، اس کے علاوہ اون کی مصنوعات، لکڑی کا سامان اور چمڑے کا سامان بھی بڑا عمدہ تیار ہوتا تھا اور بیرون ملک بھیجا جاتا تھا ۔ داخلی تجارت کے ساتھ ساتھ خارجی تجارت بھی جاری تھی ۔ تجارت کا مرکز بڑے بڑے شہر تھے ۔ حکومت تجارت کی حوصلہ افزائی کرتی تھی ۔ عام طور پر تیل، گرم مصالحہ، افیون، کھانڈ، نمک، لاکھ، موم، سوتی اور اونی کپڑا اور تیل نکالنے کے بیج برآمدی اشیا میں" شامل تھے ۔

مذہبی رواداری :

مسلمانوں نے ہندوؤں سے بڑی رواداری کا سلوک کیا اور انھیں مکمل مذہبی آزادی دی ۔ شہنشاہ اکبر نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی فرق روا نہ رکھا ۔ اس کے زمانے میں ہندو امراء دربار میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے ۔ ٹوڈر مل، بیربل اور مان سنگھ اس کے نو رتنوں میں شامل تھے، جہانگیر اور شاہجہان نے بھی رواداری کا ثبوت دیا اور انھیں اعلیٰ عہدوں پر فائز رکھا ۔ جے سنگھ اور جسونت سنگھ شاہجہان کے سپہ سالاروں میں شامل تھے ۔ اورنگ زیب نے نہ صرف اپنے پیشروؤں کی اچھی کوششوں کو جاری رکھا بلکہ ان کی فلاح کے لیے مزید اقدامات کیے ۔

عدل و انصاف :

عدل و انصاف کے سلسلے میں مغل حکمرانوں نے بھی سلاطین دہلی کے اصولوں پر عمل کیا ۔ ان کے عہد میں انصاف کا سرچشمہ بادشاہ کی ذات متصور ہوتی تھی مقدمات کے فیصلے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کے مطابق کیے جاتے تھے بادشاہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی روا نہیں رکھتے تھے ۔ انصاف کرتے وقت حقوق العباد کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا ۔ دیوان عام میں فوجداری مقدمات کی سماعت ہوتی تھی اور مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جاتی تھی ۔ مغل شہنشاہ عدل و انصاف کو اپنا مذہبی اور سیاسی فریضہ سمجھتے تھے ۔ اکبر نے ایک بار کہا تھا "اگر میں خود بھی کسی جرم کا ارتکاب کروں تو میں اپنے خلاف فیصلہ دوں گا" ۔ مغل شہنشاہ عوام کی شکایات خود سنتے تھے "جھروکہ درشن" میں درخواستیں وصول

کی جاتی تھیں اور دربار خاص و عام میں ان کے فیصلے کیے جاتے تھے ۔ جہانگیر نے اپنے محل کے باہر زنجیر عدل لگوا رکھی تھی تاکہ کسی فریادی کو بادشاہ تک پہنچنے میں کوئی دقت یا رکاوٹ نہ ہو ۔

سوالات

۱۔ برصغیر پاک و ہند کی سرزمین مختلف نسلوں اور قوموں کا "عجائب خانہ" معلوم ہوتی ہے ۔ وضاحت کیجیے ۔

۲۔ آریاؤں کی آمد سے پہلے برصغیر میں کون سی قابل ذکر قومیں آباد تھیں ۔ ان کا مختصر حال لکھیے ۔

۳۔ موئن جوڈرو اور ہڑپہ کی عمارات اور طرز تعمیر پر مختصر نوٹ لکھیے ۔

۴۔ آریاؤں کی سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور معاشی زندگی کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں ؟ مختصراً تحریر کیجیے ۔

۵۔ بدھ مت کی تعلیم کیا تھی اور مذہب کی مقبولیت کی وجوہات کیا تھیں ؟

۶۔ سندھ پر محمد بن قاسم کے حملہ کی وجوہات کیا تھیں ؟

۷۔ فتح سندھ کے واقعات لکھیے اور مفتوح قوم کے ساتھ مسلمانوں کے سلوک کا ذکر کیجیے ۔

۸۔ سلاطین دہلی کے دور میں نظام حکومت کس قسم کا تھا ؟ ہر عہدہ دار اور ہر محکمہ کے فرائض لکھیے ۔

۹۔ سلاطین دہلی نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا کردار ادا کیا ہے ؟ مثالوں سے واضح کیجیے ۔

۱۰۔ سلاطین دہلی کے دور میں مذہبی رواداری اور رفاہ عامہ کے کاموں پر مختصر نوٹ لکھیے ۔

۱۱۔ مغل دور حکومت میں علمی اور ادبی سرگرمیوں کا حال لکھیے ۔

۱۲۔ مغل حکمرانوں نے اپنے عہد حکومت میں فن تعمیر کی ترقی کے لیے جو کردار ادا کیا ہے مثالوں سے اس کی وضاحت کیجیے ۔

۱۳۔ مغلیہ دور کی زرعی، تجارتی اور صنعتی ترقی کا تنقیدی جائزہ لکھیے ۔

———

چوتھا باب

برصغیر میں برطانوی نوآبادیاتی نظام

انگریزوں کی آمد

یورپ میں پندرھویں صدی کا آخری اور سولھویں صدی کا بیشتر حصہ دریافت اور ایجادات کا زمانہ کہلاتا ہے۔ ۱۴۵۳ء میں جب ترکوں نے استنبول فتح کر لیا اور تمام تجارتی راستے ان کے قبضے میں آگئے تو یورپ والوں نے نئے بحری راستوں کی تلاش شروع کی۔ کولمبس ہندوستان کی تلاش میں نکلا اور ۱۴۹۲ء میں امریکہ جا پہنچا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد چند باہمت جہازراں ہندوستان کے راستہ کی تلاش میں نکلے لیکن ناکام رہے۔ آخرکار ایک پرتگیز جہازراں واسکوڈےگاما افریقہ کا چکر لگاتا ہوا عربوں کی مدد سے ۱۴۹۸ء میں کالی کٹ (ہندوستان) پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اگلے سال پرتگال کے بادشاہ نے ایک بحری بیڑا کالی کٹ بھیجا جو یہاں سے مال تجارت لےکر واپس چلا گیا اور اس طرح برصغیر کے ساتھ پرتگیزوں کی تجارت کا آغاز ہوا اور پرتگیز تاجروں نے برصغیر کی دولت سے خوب ہاتھ رنگے۔

پرتگیزوں کی دیکھا دیکھی یورپ کی دوسری اقوام نے بھی اس طرف توجہ کی۔ جس میں انگریز، ولندیزی اور فرانسیسی شامل ہیں۔ برطانیہ نے ہندوستان کے ساتھ تجارت کے لیے ۱۶۰۰ء میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی بنائی۔ ۱۶۱۰ء میں سطامس روجیمز اول کے سفیر کی حیثیت سے شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا اور اپنی قوم کے لیے چند تجارتی مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں نے مچھلی ٹیم، بالا سور اور ہگلی میں تجارتی کوٹھیاں حاصل کر لیں۔ ۱۶۴۰ء میں کمپنی نے مدراس کا شہر آباد کیا اور ۱۶۶۸ء میں بمبئی کی بندرگاہ بھی اس کے ہاتھ آگئی۔ ۱۶۸۶ء میں سب سے پہلے اورنگ زیب کو انگریزوں کے خلاف شکایت پیدا ہوئی۔ انگریزوں نے مغل جہازوں پر قبضہ کر لیا اور ہگلی شہرکو آگ لگا دی، جس پر اورنگ زیب نے ان کی گوشمالی کی۔ انگریزوں نے شکست کھانے کے بعد تاوان ادا کرکے معافی مانگ لی، جس پر ان کی مراعات دوبارہ بحال کر دی گئیں۔ ۱۶۹۸ء میں کمپنی نے کلکتہ کی بنیاد رکھی جو انگریزوں کے لیے تجارتی اڈہ ثابت ہوا جس سے کمپنی کی مالی حالت میں بے حد اضافہ ہوا۔ شہنشاہ فرخ سیر بیمار پڑا، جس کا ایک انگریز ڈاکٹر ہملٹن نے علاج کیا۔ شہنشاہ کے تندرست ہونے پر ڈاکٹر نے معاوضہ میں اپنی قوم کے لیے تجارتی سہولتیں طلب کیں اور اپنی تجارتی کوٹھیوں کی حفاظت کے لیے مختصر فوج رکھنے کی اجازت طلب کی۔ بادشاہ نے مستقبل کے خطرات سے بے نیاز ہو کر ڈاکٹر کو منہ مانگی مراعات

عطا کر دیں، جس میں صرف تین ہزار روپیہ سالانہ ٹیکس ادا کرنے پر پورے بنگال میں تجارت کرنے کی رعایت بھی شامل تھی ۔ اس رعایت سے انگریزوں کو بے پناہ فائدہ حاصل ہوا ۔

سراج الدولہ

سراج الدولہ جب بنگال کا نواب بنا تو اس کی عمر صرف چوبیس سال تھی ۔ لیکن وہ بڑا لائق اور ہونہار نوجوان تھا اور انتظامی معاملات میں بڑی سوجھ بوجھ رکھتا تھا، اس نے انگریزوں کو بنگال میں مزید قلعے بنانے اور مورچہ بندیاں کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا، انگریزوں کو سراج الدولہ کی حکمت عملی پسند نہ آئی اس لیے اس کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ بنگال سے مسلم حکومت کو ختم کرنے کے لیے ~~انھوں~~ نے ہندوؤں سے گٹھ جوڑ کر لیا، انھوں نے کلکتہ کے قلعے کو سراج الدولہ کی مرضی کے خلاف مستحکم کرلیا تجارتی رعایتوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور ایک مفرور بنگالی سوداگر کو نواب کے مطالبہ کے باوجود واپس نہ کیا ۔ جس پر مجبوراً سراج الدولہ کو انگریزوں کے خلاف لشکرکشی کرنا پڑی ۔ چنانچہ نواب نے پہلے قاسم بازار پر حملہ کرکے برطانوی کارخانے پر قبضہ کر لیا، پھر کلکتہ پر فوج کشی کی ۔ انگریزوں میں لڑنے کی ہمت نہ تھی ۔ لہذا نواب نے کلکتہ پر بھی قبضہ کر لیا ۔

جنگ پلاسی

جب انگریزوں کی شکست کی خبر مدراس پہنچی تو انگریز سالار کلائیو اور واٹسن کی سرکردگی میں بری اور بحری فوجیں کلکتہ پہنچیں، کلکتہ کا حاکم مانک چند انگریزوں سے ملا ہوا تھا اس لیے مقابلہ کیے بغیر کلکتہ انگریزوں کے حوالے کر دیا اور خود مرشد آباد بھاگ گیا ۔ نواب دوبارہ فوج لے کر کلکتہ پہنچا تو اس کے نمک حرام درباریوں نے اسے احمد شاہ ابدالی اور مغل شہنشاہ کے حملے کا یقین دلا کر انگریزوں سے صلح کرنے کا مشورہ دیا ۔ نواب ان کی باتوں میں آ گیا اور انگریزوں سے صلح کر لی ۔ جس کے نتیجے میں کلکتہ انگریزوں کے قبضے میں رہا اور ان کی سابقہ رعایتیں بھی بحال ہو گئیں ۔

کلائیو کو یقین تھا کہ نواب کو قوت و طاقت سے مرعوب کرنا یا میدان جنگ میں اس پر فتح پانا مشکل ہے اس لیے اس نے سازشوں کا جال پھیلانا شروع کر دیا ۔ چنانچہ اس نے چند دنوں میں لطف خان، مانک چند، راج بلبھ دل راب، جگت سیٹھ اور اومی چند جیسے سازشی پیدا کر دیے ۔ اومی چند کے ذریعے سے نواب کے ایک رشتہ دار اور فوج کے سپہ سالار میر جعفر کو بنگال کی حکومت کا لالچ دے کر ساتھ ملا لیا، اومی چند نے اس سازش کے عوض کلائیو سے تیس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تو اسے فرضی معاہدہ دکھا کر مطمئن کر دیا گیا ۔

جب سازش مکمل ہوگئی تو کلائیو نے سراج الدولہ سے بگاڑ کا موقعہ پیدا کرکے بنگال پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا اور تین ہزار دو سو سپاہیوں کے ہمراہ بنگال کے دارالحکومت مرشد آباد کی طرف روانہ ہوا ۔ راستہ میں ہگلی اور کٹرہ میں متعین نواب کی فوجوں نے کوئی مزاحمت نہ کی اور کلائیو بلا روک ٹوک پلاسی

کے میدان میں پہنچ گیا۔ جہاں نواب پچاس ہزار فوج کے ساتھ پہلے ہی موجود تھا۔

۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو لڑائی ہوئی۔ سراج الدولہ اور اس کے وفادار سالار میر مدن اور میر موہن لال داد شجاعت دے رہے تھے لیکن معاہدے کے مطابق میر جعفر اور دوسرے غدار ایک طرف کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ فوج کا بہت بڑا حصہ انھی کی کمان میں تھا اس کے باوجود کلائیو کی فوج کو پسپا ہونا پڑا، لیکن اسی دوران میر مدن کی ہلاکت کی خبر پہنچی، میر جعفر اور دوسرے غداروں نے اس وقت جنگ بند کرنے اور دوسرے روز پوری قوت سے مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا۔ نواب ان کی باتوں میں آگیا اور فوج کو واپسی کا حکم دے دیا، دوسری طرف غداروں نے کلائیو کو واپس لوٹتی ہوئی فوج پر عقب سے حملہ کرنے کا پیغام بھیجا۔ کلائیو کے اس غیرمتوقع حملے سے شاہی فوجوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ میر جعفر اور دوسرے غداروں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر نواب کی فوج پر حملہ کر دیا اور اس طرح سراج الدولہ کو شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔ میر جعفر کے بیٹے نے تعاقب کرکے نواب کو گرفتار کر لیا اور اسے شہید کر دیا۔

انگریزوں نے میر جعفر کو بنگال کا نواب مقرر کیا اس کے صلے میں نواب کی طرف سے کمپنی کو بہت بڑی رقم اور بہت سا علاقہ اور بے شمار تجارتی رعایتیں دی گئیں۔ کلائیو نے بھی خوب ہاتھ رنگے، دو لاکھ چونتیس ہزار پونڈ اس کے حصے میں آئے۔ اس لڑائی کے نتیجے میں انگریزوں کو بنگال میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ یہاں سے حاصل کی ہوئی دولت سے دکن میں انھوں نے فرانسیسیوں کے خلاف کرناٹک کی تیسری جنگ جیت لی اور ایک بہت بڑی تربیت یافتہ فوج تیار کرلی۔

میر قاسم

جنگ پلاسی کے نتیجہ میں میر جعفر بنگال کا حکمران بنا، لیکن اس میں انتظامی صلاحیتوں کا فقدان تھا، وہ ہر بات کے بارے میں کلائیو سے مشورے لیتا اور اس کی ہدایات پر عمل کرتا، اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ مالی مشکلات کا تھا، مرشد آباد کے خزانے میں، جوکچھ تھا وہ کمپنی کے پاس پہنچ چکا تھا، خزانہ خالی تھا اور کمپنی کے افسران اس سے بدظن ہوگئے اور اسے گدی سے اتارنے کی سازشیں کرنے لگے، آخرکار میرجعفر کو معزول کرکے میر قاسم کو بنگال کا نواب مقرر کر دیا گیا جس کے عوض میں بردوان، مدنا پور اور چاٹگام کی زمینداری کمپنی کے حوالے کر دی گئی۔

میرقاسم ایک قابل حکمران اور بہت سی صلاحیتوں کا مالک تھا، اس نے ملکی حالت درست کرنے کے لیے بہت سے اقدامات کیے۔ اس نے دربار کے فضول مصارف ختم کر دیے، انگریزوں کے بقایا جات ادا کیے، فوج کو منظم کیا اور زمینداروں کی سرکشی ختم کرکے حکومت کا وقار بحال کیا۔ وہ انگریزوں کی بالا دستی کو ناپسند کرتا تھا، اس لیے اس نے اپنا دارالحکومت مرشد آباد سے منگیر منتقل کرایا۔ منگیر میں توپیں بنانے کا کارخانہ قائم کیا اور شہر کی قلعہ بندی کرکے اس کی رفاہی حیثیت کو مضبوط بنایا۔ جاگیرداروں کی قوت توڑنے کے بعد میر قاسم نے تمام قلعوں میں دستے مقرر کیے اور سرحدوں کو بیرونی

حملوں سے بچانے کے یے افواج متعین کیں ۔ انگریزوں کو بنگال سے نکالنے کے لیے شجاع الدولہ سے مفاہمت کر لی ۔

نواب نے اپنی فوجی قوت مضبوط بنانے کے بعد ملک کی معاشی حالت کی طرف توجہ دی، کمپنی کے ملازمین اپنی فوجی برتری کی وجہ سے تجارتی مراعات سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے، جس کی وجہ سے ملکی آمدنی کم ہوتی جا رہی تھی، چنانچہ میرقاسم نے کمپنی کے ملازمین کی پرائیویٹ تجارت پر پابندی عائد کر دی اور اپنے حکم کو نافذ کرنے کے لیے مؤثر ذرائع استعمال کیے ۔ انگریز ان پابندیوں پر بہت برافروختہ ہوئے اور میر قاسم کو گدی سے ہٹانے کے لیے منصوبے بنانے لگے ۔ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ۱۷۶۳ء میں انگریزوں نے پٹنہ پر حملہ کرکے لوٹ مار کا بازار گرم کیا، لیکن جلد ہی نواب کی فوج نے انھیں شہر سے نکال دیا اور انگریزی فوج قلعہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئی ۔ لیکن یہاں پھر انگریزوں کی مکاری اور چال بازی کام آئی، میر قاسم کو شکست ہوگئی اور وہ بھاگ کر اودھ چلا گیا ۔ انگریزوں نے میر جعفر کو دوبارہ بنگال کا حاکم مقرر کر دیا ۔

جنگ بکسر

میر قاسم نے اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی سے مدد مانگی ۔ میر قاسم شجاع الدولہ اور مغل بادشاہ کی متحدہ افواج نے بنگال پر حملہ کیا ۔ بکسر کے مقام پر جنگ ہوئی، جس میں انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی اور میر قاسم میدان جنگ سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ۔

نواب اودھ کے ساتھ کچھ دیر جنگ جاری رہی ۔ لیکن آخرکار اسے بھی انگریزوں کے ہاتھوں سے شکست ہوئی اور وہ بریلی کی طرف بھاگ گیا ۔ عہد نامہ الہ آباد کی رو سے یہ جنگ ختم ہوئی ۔ کڑہ اور الہ آباد کے اضلاع تاوان جنگ کے طور پر کمپنی کے حوالے کر دیے گئے ۔ انگریزوں نے یہ اضلاع شاہ عالم کو دے کر اس سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی لے لی ۔ اس طرح بنگال اور بہار پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا اور انھوں نے اپنی توجہ جنوبی ہند کی طرف مبذول کی ۔

حیدر علی

دکن میں میسور کی مسلم سلطنت کا بانی حیدر علی تھا ۔ بچپن ہی میں حیدر علی کا باپ فتح محمد ایک جنگ میں مارا گیا اور اس کی پرورش ایک رشتہ دار نے کی، جو سرنگا پٹم میں راجا کی ملازمت کرتا تھا۔ اس لیے حیدر علی کو تربیت کے لیے سازگار ماحول میسر آ گیا ۔ اس زمانے میں علمی قابلیت کی بجائے فن حرب کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی ۔ اس لیے حیدر علی نے بچپن ہی میں فنون جنگ کی تربیت حاصل کی جب حیدر علی جوان ہوا تو نند راج وزیر نے اس کے اطوار و عادات اور صلاحیتوں سے متأثر ہو کر ایک معمولی فوجی افسر مقرر کیا ۔ لیکن قلیل عرصے میں وہ اپنی لیاقت، اور ہونہاری اور ذہانت کی بنا پر میسور کی فوج کا سپہ سالار بن گیا ۔

میسور کا راجا اپنے وزیر نند راج کی بڑھتی ہوئی قوت سے بڑا خائف تھا، اس نے وزیر سے رہائی حاصل کرنے کے لیے حیدر علی کو مامور کیا - حیدر علی نے نہایت عقلمندی سے نند راج کو وزارت چھوڑ کر جاگیر پر چلے جانے پر آمادہ کر لیا - راجا نے حیدر علی کی فہم و فراست کے پیش نظر ریاست کے تمام معاملات حیدر علی کے سپرد کر دیے، لیکن بعد میں اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں - ریاست کی فوجیں چونکہ حیدر علی کے قبضے میں تھیں، اس لیے راجا نے حیدر علی کی گرفتاری کے لیے مرہٹوں سے ساز باز کی - حیدر علی نے مرہٹوں کو شکست دی اور سابق وزیر نند راج کی وساطت سے راجا کو بارہ محل کا علاقہ دے کر اسے میسور چھوڑنے پر آمادہ کر لیا - اس طرح میسور کی ریاست پر حیدر علی کا قبضہ ہو گیا -

سلطان فتح علی خان ٹیپو

فتح علی خان ٹیپو، حیدر علی کا بیٹا تھا - حیدر علی نے اپنے بیٹے فتح علی خان ٹیپو کی تعلیم و تربیت کے لیے اپنے عہد کے ممتاز علماء کی خدمات حاصل کیں - بچپن ہی میں عربی، فارسی اور قرآن و حدیث کی تعلیم سے بہرہ ور ہوا - دینی اور دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس نے فن حرب میں کمال حاصل کیا - باپ کی صلاحیتوں کا وارث ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے باپ کے بلند عزائم سے بھی سرشار تھا - صرف سترہ سال کی عمر میں اس نے میسور کی پہلی لڑائی میں مدراس پر حملہ کرنے والی فوج کی کمان سنبھالی اور انگریزی فوج کو شکست دے کر قلعہ تنجور پر قبضہ کر لیا - میسور کی دوسری لڑائی میں بھی باپ کا دست راست رہا اور بہادری کے جوہر دکھائے - باپ کی وفات کے بعد ۱۷۸۲ء میں سلطنت میسور کے تخت پر بیٹھا - سلطان نے تخت نشین ہوتے ہی بہت سی اصلاحات کیں - اس نے جاگیرداری نظام کو ختم کر دیا، پولیس کو منظم کیا، سرحدوں پر غیرملکی جاسوسوں کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لیے پولیس متعین کی - ڈاک کا انتظام بہتر بنایا اور بری و بحری قوت میں اضافہ کیا - انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لیے دوسرے لوگوں سے معاہدے کیے - ایسٹ انڈیا کمپنی پر کاری ضرب لگانے کے لیے سلطان ٹیپو نے ترکی، فرانس اور افغانستان سے مدد طلب کی، لیکن کوئی بھی اس کی مدد کو نہ پہنچا -

انگریز بھی ٹیپو سلطان کو انگریزی اقتدار کے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنی مثالی عیاری سے کام لیتے ہوئے ٹیپو سلطان کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا - انھوں نے نظام اور مرہٹوں سے اتحاد کرنے کے علاوہ سلطان کے درباریوں اور فوجی افسروں کو بھی اپنے جال میں پھانس لیا، ان غداروں میں میر صادق، میر غلام نبی اور دیوان پورنیا بھی شامل تھے -

میسور کی تیسری جنگ :

سلطان کو جب نظام اور مرہٹوں کی ملی بھگت کا علم ہوا تو اسے بیحد غصہ آیا، اس نے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور تن تنہا سب قوتوں کا مقابلہ کیا - جنگ برابر طول کھینچتی گئی، آخرکار انگریز گورنر جنرل کارنوالس نے خود فوجی کمان سنبھالی، لیکن اسے بڑی پسپا ہونا پڑا - اسی دوران نظام اور

مرہٹے بہت سا ساز و سامان لے کر کارنوالس کی مدد کو پہنچ گئے۔ سلطان سرنگا پٹم میں محصور ہوگیا۔ ٹیپو سلطان ایک سال تک متحدہ دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا، آخرکار مجبور ہوکر اسے صلح کرنا پڑی۔ سلطان کو تین کروڑ روپے بطور تاوان جنگ ادا کرنا پڑے اور آدھی سلطنت انگریزوں کے حوالے کرنا پڑی، جسے مرہٹوں، نظام اور انگریزوں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔

میسور کی چوتھی جنگ :

سلطان نے سرنگا پٹم کا معاہدہ مجبوری کے تحت قبول کیا تھا، تاہم اس نے پختہ عزم کر رکھا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف ضرور ایک فیصلہ کن جنگ لڑے گا۔ انگریز بھی ٹیپو سلطان کے جذبات سے آگاہ تھے۔ ۱۷۹۹ء میں ولزلی نیا گورنرجنرل بن کر آیا تو اس نے ایک بار پھر نظام اور مرہٹوں کو ساتھ ملا کر فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تیاریاں شروع کر دیں، اس نے سلطان پر یہ الزام لگایا کہ اس نے انگریزوں کے خلاف دوسرے ملکوں کے بادشاہوں کے ساتھ خط و کتابت کی ہے اور "امدای نظام" کی سکیم کو ماننے سے انکار کیا ہے، لہذا انھوں نے میسور پر حملہ کر دیا۔ ایک فوج کرناٹک کی طرف سے اور دوسری بمبئی کی طرف سے روانہ کی گئی۔ جنوبی سمت سے مرہٹے بڑھے اور نظام نے بھی ایک امدادی فوج بھیجی۔ سلطان چاروں طرف سے گھر چکا تھا، لیکن سب سے زیادہ خطرناک دشمن اس کے اپنے امراء تھے جو انگریزوں کو ایک ایک لمحے کی خبریں پہنچا رہے تھے۔ ان حالات کے باوجود دو ماہ تک سلطان سرنگا پٹم میں محصور رہا۔ سلطان اور اس کے وفادار اُمراء بے نظیر شجاعت سے لڑے، لیکن غدار اُمراء نے ان کی کوششوں کو بارآور نہ ہونے دیا۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو نماز فجر کے بعد سلطان تلوار سونت کر قلعے سے باہر نکلا، اس کے دیوان پورنیا نے تنخواہ تقسیم کرنے کے بہانے فوج کو عین اس وقت میدان جنگ سے واپس بلا لیا۔ اس کے وفادار ساتھی ایک ایک کرکے میدان جنگ میں کام آ رہے تھے۔ سلطان خود بھی لڑتے لڑتے زخمی ہوگیا۔ نمک حراموں نے قلعے کا صدر دروازہ بند کر دیا تاکہ سلطان قلعہ میں واپس نہ آسکے۔ چنانچہ بہادری کے ساتھ لڑتے لڑتے سلطان نے جام شہادت نوش کیا۔ سلطان کی شہادت کے ساتھ برصغیر کی آزادی کا خاتمہ ہوگیا اور وسیع و عریض سرزمین میں غلامی کے خلاف آواز بلند کرنے والا کوئی نہ رہا۔ چنانچہ سلطان کی شہادت کی خبر سنتے ہی انگریز سالار پکار اُٹھا۔ "آج سے ہندوستان ہمارا ہے"۔

جنگ کے خاتمہ کے بعد ریاست کا اکثر حصہ انگریزی سلطنت میں مدغم کر دیا گیا، تھوڑا سا علاقہ نظام حیدرآباد کو دیا گیا، لیکن مرہٹوں کو کچھ نہ ملا، کیونکہ انھوں نے انگریزوں کی شرائط دوستی ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد جو چھوٹی سی ریاست رہ گئی وہ میسور کے سابق ہندو راجا کے نابالغ لڑکے کے حوالے کر دی گئی جو انگریزوں کی نگرانی میں حکومت کرنے لگا۔

الحاق سندھ و پنجاب

بنگال پر قبضہ کرنے اور ٹیپو شہید کی شکست کے بعد انگریزوں کے حوصلے بلند ہوگئے۔ انھوں نے

آہستہ آہستہ تمام والیان ریاست کو زیر کر لیا۔ مرہٹہ سرداروں کو بھی ایک ایک کر کے شکست دی اور وسطی برصغیر میں مسلمان مجاہدین کو چاروں طرف سے گھیر کر ان کی طاقت بھی ختم کر دی۔ مشرق، شمالی اور جنوبی حصے پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے مغربی حصے پر نظریں جمائیں۔ پہلے سندھ کی باری آئی۔ ۱۸۰۹ء میں لارڈ منٹو نے امیران سندھ کے ساتھ معاہدہ کر کے دریائے سندھ کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی اجازت حاصل کی۔ ۱۸۳۸ء میں انگریزوں نے افغانستان پر حملہ کیا اور معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سندھ کے راستے انگریزی فوجیں افغانستان بھیجیں۔ جنگی لحاظ سے اس علاقے کی اہمیت کا اندازہ لگاتے ہوئے انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور امیران سندھ پر معاہدہ کی خلاف ورزی کا بہانہ کر کے سندھ پر فوج کشی کی جس میں امیران سندھ کو شکست ہوئی اور سندھ پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔

اس زمانے میں پنجاب پر سکھوں کی حکومت تھی۔ ۱۸۰۹ء میں انگریزوں اور رنجیت سنگھ کے درمیان معاہدہ امرتسر کی رو سے دریائے ستلج فریقین کے درمیان حد قرار پائی۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد تمام پنجاب میں بد امنی اور افراتفری پھیل گئی اور سکھ فوج بے قابو ہوگئی۔ رانی جنداں اور اس کے وزیر لال سنگھ نے فوج کا زور توڑنے کے لیے فوج کو انگریزی علاقے فتح کرنے کے لیے بھیجا۔ مدکی، فیروز شاہ اور سیبراؤں کے مقام پر لڑائیاں ہوئیں، جس میں سکھوں کو شکست ہوئی، بھاری تاوان جنگ ادا کرنے کے علاوہ سکھوں نے ستلج اور بیاس کا علاقہ بھی انگریزوں کے حوالے کیا۔ پہلی جنگ میں شکست کے باوجود سکھوں کے حوصلے بلند تھے اور وہ انگریزوں سے شکست کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ ۱۸۴۹ء میں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان دوسری جنگ شروع ہوئی۔ چیلیانوالہ اور گجرات کے قریب لڑائیوں میں سکھوں کو شکست ہوئی۔ پنجاب پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا اور سر جان لارنس اس علاقے کا پہلا چیف کمشنر مقرر ہوا۔ انگریز مختلف حیلوں بہانوں سے اپنی سلطنت میں توسیع کرتے رہے۔ لارڈ ڈلہوزی نے الحاق پالیسی کے ذریعے ستارہ، سنبل پور، ناگپور، جے پور، حیدرآباد اور اودھ کی ریاستوں پر قبضہ جما لیا اور آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اطلاع دے دی گئی کہ اس کی وفات کے بعد اس کی اولاد کو قلعہ خالی کرنا پڑے گا۔ اس طرح انگریز سو سال کے عرصے میں پورے برصغیر پر قبضہ کر کے تمام سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء

ایسٹ انڈیا کمپنی تجارتی غرض سے برصغیر پہنچی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی حکومت تقریباً تمام برصغیر میں پھیل گئی۔ مغلوں کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر برائے نام بادشاہ بن کر رہ گیا۔ اس کی عملداری صرف قلعہ دہلی تک محدود تھی اور وہ بھی صرف اس کی ذات تک، کیونکہ اسے باقاعدہ اطلاع دی جا چکی تھی کہ اس کی اولاد کو قلعہ خالی کرنا ہوگا اور وہ اپنے نام کے ساتھ بادشاہ کا لفظ استعمال نہ کر سکے گی۔ لہذا برصغیر کے لوگوں کو یقین ہو چکا تھا کہ برصغیر سے

ملکی حکومت کو ختم کرکے اسے براہ راست تاجدار برطانیہ کی غلامی میں دے دیا جائے گا، اس طرح سے لوگوں کے دلوں میں وطن پرستی اور حب قومی کے خیالات جوش مارنے لگے۔ انھوں نے برصغیر کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے ایک بار پھر کوشش کی۔ اس کوشش کو "جنگ آزادی" کا نام دیا گیا۔

نتائج

جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے یہاں کے باشندوں سے زبردست انتقام لیا۔ تقریباً پانچ لاکھ مقامی سپاہیوں اور شہریوں کو قتل کیا گیا۔ صرف ایک دن میں چوبیس مغل شہزادوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔ مسلمانوں کو جنگ آزادی کا ذمہ دار ٹھہرا کر ان پر خاص طور سے سختی روا رکھی گئی۔ مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا، ان کے گھر لوٹ لیے گئے، جائیدادیں اور جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور ملازمتوں سے برطرف کر دیا گیا۔

جنگ آزادی کے بعد مغل حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ بہادر شاہ ظفر کو مجرم قرار دے کر جلاوطن کرکے رنگون میں قید کر دیا گیا، جہاں اس نے چار سال بعد وفات پائی۔ جنگ آزادی کوئی معمولی واقعہ نہ تھا، اس جنگ کے نتیجے میں برصغیر کے لوگوں کے معاملات پر نظرثانی کی گئی۔ کمپنی کے ظلم و ستم کی داستانیں انگلستان پہنچیں تو کمپنی کے خلاف اعتراضات کی بھرمار ہونے لگی۔ پارلیمنٹ میں بل پیش ہوا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط ختم کرکے برصغیر کو براہ راست حکومت برطانیہ کے ماتحت کر دیا گیا۔ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ وکٹوریہ کی جانب سے اعلان ہوا کہ برصغیر کی عنان اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر حکومت برطانیہ کے قبضہ میں چلی گئی ہے۔ اس اعلان میں ملکی انتظام کے سلسلے میں اصولوں کی وضاحت کی گئی۔ والیان ریاست کو تسلی دی گئی کہ آئندہ اُن کے حقوق و اختیارات کی حفاظت کی جائے گی اور ان کے اعزاز و اکرام میں کوئی فرق نہیں آنے پائے گا۔ لاولد راجاؤں کو متبنیٰ بنانے کی اجازت دے دی گئی اور ریاستوں کا مستقبل محفوظ کر دیا گیا۔

رعایا کو اس بات کا اطمینان دلایا گیا کہ ان کے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے بلا مذہب و ملت ہر شخص کے لیے کھلے رکھے جائیں گے اور ملازمت کے حصول کے لیے صرف قابلیت کو شرط قرار دیا جائے گا۔ جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں کو امان دے دی گئی۔ لوگوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ صرف ان لوگوں کو سزائیں دی جائیں گی جنھوں نے برطانوی رعایا کو قتل کرنے میں حصہ لیا ہے۔ اس اعلان میں یہ بھی کہا گیا کہ حکومت رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرے گی۔

سوالات

۱۔ شروع شروع میں کون سی یورپی اقوام نے پاک و ہند کی طرف توجہ کی اور انھیں کہاں تک کامیابی ہوئی۔

۲- جنگ پلاسی کے اسباب و واقعات لکھیے - اس جنگ میں نواب سراج الدولہ کی شکست کے اسباب کیا تھے ؟ نیز اس جنگ کی اہمیت بھی بیان کیجیے -

۳- "بکسر کی لڑائی پلاسی کی لڑائی سے زیادہ اہم ہے" وضاحت کیجیے -

۴- حیدر علی کے حالات زندگی لکھیے -

۵- ٹیپو سلطان کے حالات زندگی تحریر کیجیے - اس نے میسور کی اسلامی ریاست کو بچانے کے لیے جو کوششیں کیں، ان کا مختصر حال لکھیے -

۶- میسور کی چوتھی لڑائی کی وجوہات، واقعات اور نتائج لکھیے - نیز اس لڑائی کی اہمیت بیان کیجیے -

۷- الحاق پنجاب کے حالات مختصر طور پر تحریر کیجیے -

۸- جنگ آزادی کے نتائج بیان کیجیے -

پانچواں باب

تحریک پاکستان

مغربی طرزِ فکر کے مطابق قوم، افراد کے ایسے مجموعے کو کہتے ہیں جو ایک وطن میں رہتے ہوں۔ ان افراد میں زبان، نسل، مذہب، معاشی مفادات، سیاسی عزائم اور تاریخی روابط کا اشتراک موجود ہو تو قوم کو زیادہ متحد اور مضبوط سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اسلامی نقطہ نظر سے انسانوں کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ وہ جو اسلام قبول کر لیتے ہیں، ملت اسلامیہ کے رکن بن جاتے ہیں۔ اور وہ جو اسلام قبول نہیں کرتے، ملت کفر کے رکن رہ جاتے ہیں۔ وطن، زبان، نسل، معاشی مفادات، سیاسی عزائم اور تاریخی روابط راستے میں حائل نہیں ہوتے۔

برصغیر میں دو قومی نظریے نے "مسلمان قوم" اور "ہندو قوم" کا روپ دھارا۔ کچھ مسلمان عرب، ایران، ترکستان اور افغانستان سے برصغیر میں آئے۔ ہندوستان کی سابقہ روایات کے برعکس وہ ہندو معاشرہ میں مدغم نہ ہوئے، بلکہ ہندو معاشرہ کے بے شمار افراد کو مسلمان بنا کر ملت اسلامیہ میں مدغم کر لیا۔ نہ صرف مسلمان اپنے آپ کو ہندوؤں سے الگ قوم سمجھتے رہے، بلکہ ہندو مسلمانوں سے ایک الگ قوم کا سلوک کرتے رہے۔ اگرچہ برصغیر کی ملت اسلامیہ کا بیشتر حصہ ہندوؤں سے مسلمان ہوا تھا، تاہم ہندو مسلمانوں کو غیرملکی قرار دیتے رہے۔ ہندو مسلمانوں کو ناپاک، ملیچھ اور اچھوت سمجھتے رہے۔ ہندو مسلمانوں سے علیحدہ محلوں میں رہتے تھے۔ ہندو مسلمانوں کے ہاتھوں سے کوئی چیز لے کر نہیں کھاتے تھے۔ مسلمان ہندوؤں کے کنوؤں سے پانی نہیں لے سکتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے طعام خانے، چائے خانے، باورچی خانے الگ الگ ہوتے تھے۔ مسلمان سے ہاتھ ملانے سے ان کے ہاتھ بھرشٹ ہو جاتے تھے۔ اس سارے طرزِ عمل کے باوجود کانگرس نے یہ ڈھونگ رچایا ہوا تھا کہ برصغیر کے تمام باشندے ایک قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ڈھونگ مسلمانوں کو بے وقوف بنا کر سارے برصغیر پر ہندوؤں کی بالادستی قائم کرنے کے لیے رچایا گیا تھا۔ کانگرس کے مؤقف کے برعکس مسلم لیگ دو قومی نظریہ کی علمبردار تھی۔

مسلم لیگ کا قیام

جب تک مسلمان برصغیر میں فرمانروا رہے، مسلمانوں کے حقوق محفوظ رہے۔ انگریز آئے تو مسلمان اپنی سلطنت و سطوت کو قائم رکھنے کے لیے انگریزوں کی پیش رفت کی مزاحمت کرتے رہے۔ ۱۸۵۷ء میں آخری مزاحمت، تحریک آزادی ہند ناکام ہوگئی۔ انگریز فتح یاب ہو گئے اور سارے برصغیر پر مسلط ہو گئے تو مسلمان ان کی نظروں میں دشمن اول قرار پائے۔ مسلمانوں کو کچلا گیا، ان کے حقوق پامال کیے گئے اور

تھوڑے ہی عرصے میں ایک خوشحال و توانا قوم کو بد حال و ناتواں بنا کے رکھ دیا ۔ ادھر ہندوؤں کو ہر طرح سے نوازا گیا اور زور آور بنا دیا گیا ۔

سر سید احمد خاں مسلمان مدبر تھے ۔ جنھوں نے ہندوؤں کی نیت کو بھانپا اور مسلمانوں کو نصیحت کی کہ وہ کانگرس میں شریک نہ ہوں ۔ کیونکہ کانگرس مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت نہیں کرے گی ۔ اس کے مقابلے میں سر سید احمد خاں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو ہی سیاسی پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا، جس کا ہر سال اجلاس ہوتا اور مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے بارے میں غور و خوض ہوتا ۔

۱۸۹۸ء میں سر سید احمد خان کے بعد مسلمانوں کو ایک سیاسی تنظیم کی ضرورت تھی ۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ میں چند مسلمان رہنماؤں کا اجتماع ہوا ۔ اس میں طے ہوا کہ مسلمانوں کے معاشرتی اور سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے ایک تنظیم بنائی جائے ۔ ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ کسی مناسب وقت پر تمام صوبوں کے مسلمان نمائندوں کے اجلاس کا بندوبست کرے اس وقت تو نمائندہ اجلاس کا اہتمام نہ ہو سکا لیکن ۱۹۰۶ء میں شملہ وفد کی کامیابی نے مسلمانوں کی ہمت بندھائی تو ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں مسلمان رہنماؤں کا ایک اجلاس نواب وقارالملک کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ نواب سر سلیم اللہ خان نے آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کی قرارداد اجلاس میں پیش کی ، جو اتفاقِ رائے سے منظور ہوئی ۔ اس وقت مسلم لیگ کے قیام کے مقاصد حسب ذیل تھے :

(۱) مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے لیے جذبہ مفاہمت پیدا کرنا اور حکومت کی کسی کارروائی کے بارے میں ان میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو تو اسے دور کرنا ۔

(۲) ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفادات کی نگہداشت کرنا اور ان کے مطالبات کو حکومت کے سامنے پیش کرنا ۔

(۳) مذکورہ بالا مقاصد کو ضرر پہنچائے بغیر مسلمانوں میں ایسے خیالات نہ پیدا ہونے دینا جو دوسرے فرقوں کے خلاف ہوں ۔

اس اجلاس میں شملہ وفد کے مطالبات کو دہرایا گیا اور تقسیم بنگال کو برقرار رکھنے پر زور دیا گیا ۔ دسمبر ۱۹۰۸ء میں مسلم لیگ کے دوسرے اجلاس منعقدہ امرتسر میں حکومت سے حسب ذیل مطالبات کیے گئے ۔

۱۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو ایک خاص تناسب سے حصہ دیا جائے ۔

۲۔ تقسیم بنگال کو برقرار رکھا جائے ۔

۳۔ مسلمانوں کے لیے جداگانہ طریق انتخاب رائج کیا جائے ۔

تقسیم بنگال تو برقرار نہ رہی ۔ البتہ ۱۹۰۹ء کی منٹو مارلے اصلاحات میں مسلمانوں کو جداگانہ

انتخاب کا حق دے دیا گیا۔

میثاق لکھنؤ

۱۹۱۰ء تک مسلمان انگریزوں سے خوش تھے۔ تقسیم بنگال برقرار تھی اور جداگانہ انتخاب کا حق مل گیا تھا۔ ۱۹۱۰ء کے بعد پے درپے چند واقعات ایسے ہوئے کہ مسلمان انگریزوں سے کشیدہ خاطر اور بد ظن ہوگئے۔

ایسے حالات میں ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اول کا آغاز ہوا تو برطانیہ جرمنی کے خلاف لڑ رہا تھا اور سلطنت عثمانیہ نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا۔ اس لیے برطانیہ نے سلطنت عثمانیہ کے مختلف علاقوں پر لشکرکشی کر دی۔

اگرچہ تنسیخ تقسیم بنگال اور سانحہ مسجد کانپور، میں ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کی مخالفت کی تھی لیکن ان تمام واقعات میں انگریزوں کی روش مسلمانوں کے بارے میں معاندانہ، مخالفانہ اور مخاصمانہ تھی۔ انگریزوں کی اس معاندانہ روش کے حسب ذیل اثرات مرتب ہوئے۔

۱۔ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ نے اپنے دستور میں ترمیم کی۔ حکومت برطانیہ سے مفاہمت کی پالیسی کو ترک کرکے تاج برطانیہ کے تحت ہندوستان کے لیے موزوں حکومت خود اختیاری کے نظام کو اپنا نصب العین قرار دیا۔

۲۔ ہندو مسلم اتحاد کی ابتدا ہوئی، جو ۱۹۲۱ء تک قائم رہا۔

۳۔ محمد علی جناح کی کوششوں سے کانگرس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں ہوئے اور دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا، جو تاریخ میں میثاق لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے اور جو ۱۹۱۹ء کی دستوری اصلاحات کی بنیاد بنا۔

میثاق لکھنؤ کی بہت سی دفعات تھیں۔ مسلمانوں کے نقطہ نگاہ سے حسب ذیل باتیں اہم تھیں:

(۱) کانگرس نے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا۔

(۲) مرکزی قانون ساز ادارہ میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دینے پر کانگرس رضامند ہوگئی۔

(۳) مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلم آبادی کے تناسب سے زیادہ نمائندگی دی گئی، جس کے بدلے میں مسلم اکثریت کے صوبوں، پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو کم نمائندگی ملی۔ پنجاب میں ۵۰ فی صد اور بنگال میں ۴۰ فی صد نمائندگی مسلمانوں کو ملی۔ یہاں مسلمان خسارہ میں رہے۔ مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمان زیادہ نشستیں لےکر بھی اقلیت میں رہے۔ لیکن پنجاب اور بنگال میں اکثریت میں ہوتے ہوئے اسمبلی میں اقلیت بن گئے۔ اس وجہ سے وزارت سازی میں مسلمانوں کو بنگال اور پنجاب میں دشواریاں پیش آتی رہیں۔ ۱۹۳۲ء کے کمیونل ایوارڈ میں بھی اسی کو بنیاد بنا کر پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو بالترتیب

۴۹ اور ۴۸ فیصد نشستیں دی گئیں - ۱۹۴۷ء میں تقسیم پنجاب و بنگال میں یہ کم نمائندگی پاکستان کے لیے نقصان دہ بنی -

(۴) کسی قانون ساز ادارہ میں کسی ایسے مسودہ قانون پر بحث نہیں ہوگی جس کی مخالفت کسی قوم کے تین چوتھائی ارکان کر دیں - اس دفعہ سے ہندوؤں کی مرضی مسلمانوں پر مسلط کرنے کے خطرہ کا سدباب ہو گیا تھا -

اس معاہدہ سے دو اور نتیجے اخذ کیے گئے ہیں - ایک یہ کہ مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کرکے ہندوؤں نے یہ بات تسلیم کر لی کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں - دوسرے یہ کہ کانگرس نے مسلم لیگ سے معاہدہ کرکے اس بات کا اقرار کر لیا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے -

قائد اعظم کے چودہ نکات

میثاق لکھنؤ کے بعد تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون میں ہندو مسلم اتحاد کے خوب مظاہرے ہوئے - لیکن اتحاد کا یہ دور دیر پا ثابت نہ ہوا - دونوں قوموں کے درمیان اس قدر اختلافات و تضادات تھے کہ یہ اتحاد زیادہ عرصہ تک چل نہیں سکتا تھا - ہندو تحریک خلافت کے دوران مسلمانوں کے جوش و خروش سے وحشت زدہ ہو گئے تھے- اور مستقبل میں مسلمانوں کو اپنے لیے خطرہ سمجھنے لگے- اس وحشت کی وجہ سے چند ہندو تحریکوں نے جنم لیا - اور جن کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہو گیا -

(۱) ہندو مہا سبھا نے اعلانیہ کہنا شروع کر دیا کہ ہندوستان ہندوؤں کا وطن ہے - مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے - مسلمانوں کے لیے صرف دو راستے کھلے ہیں، ہندو دھرم اختیار کرکے ہندوستان میں رہیں یا ہندوستان سے چلے جائیں -

(۲) ہندو مہا سبھا کے ایک رہنما سوامی شردھا نند نے شدھی کی تحریک شروع کی - اس تحریک کا مقصد ہندوستان کے اُن باشندوں کو پھر سے ہندو بنانا تھا، جو ہندو دھرم تیاگ کر مسلمان ہو چکے تھے -

(۳) ہندو مہا سبھا کے ایک اور رہنما ڈاکٹر مونجے نے سنگھٹن کی تحریک شروع کی - اس تحریک کا مقصد ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف منظم کرکے ایسے اسلحہ کے استعمال کو ترتیب دینا تھا، جو مسلمانوں کے خلاف فسادات میں کام آ سکے -

(۴) ہندو مہا سبھا کی ان حرکتوں سے ہندوستان کے طول و عرض میں ہندو مسلم فسادات ہونے لگے - مسلمانوں نے بھی مزاحمت کے لیے شدھی کے مقابلے میں تحریک تبلیغ اور سنگھٹن کے مقابلے میں "تنظیم" کا اہتمام کیا -

(۵) نومبر ۱۹۲۷ء میں حکومت برطانیہ نے سائمن کمیشن ہندوستان بھیجا - تاکہ ہندوستانی رہنماؤں سے تبادلہ خیالات کرکے آئندہ کے لیے دستوری اصلاحات کا خاکہ تیار کرے - چونکہ اس کمیشن میں کوئی ہندوستانی رکن نہ تھا - کانگرس اور مسلم لیگ نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا - کانگرس نے بھی

لال نہرو کی سرکردگی میں ایک کمیٹی دستوری سفارشات تیار کرنے کے لیے بنائی ۔ اس کمیٹی کی رپورٹ نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہوئی ۔ اس رپورٹ میں تجویز کیا گیا تھا کہ جداگانہ انتخاب کو ختم کیا جائے ۔ اسمبلیوں میں مختلف قوموں کے لیے نشستیں مخصوص نہ کی جائیں ۔ مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو ویٹج نہ دیا جائے ۔ مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی کی بجائے ایک چوتھائی نشستیں دی جائیں ۔ ملک میں وحدانی طرز حکومت ہو اور سندھ کو بمبئی سے الگ کیا جائے ، اگر وہ مالی لحاظ سے خود کفیل ہو ۔ قصہ مختصر نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کے تمام مطالبات کو مسترد کر دیا گیا تھا ۔

ان حالات میں مسلمانوں کو اپنے حقوق و مفادات کے تحفظ کی فکر دامنگیر ہوئی ۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کے دیگر رہنماؤں سے صلاح مشورہ کرکے چودہ نکات مرتب کیے ۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ دہلی میں ایک قرارداد کی صورت میں پیش کرکے منظور کروائے ۔ یہ چودہ نکات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

(۱) ملک کا آئین وفاقی طرز کا ہو، اور غیرمتذکرہ اختیارات صوبوں کے پاس ہوں ۔

(۲) تمام صوبوں کو یکساں قسم کی خود مختاری دی جائے ۔

(۳) ملک کی تمام اسمبلیوں اور انتخابی اداروں میں اقلیتوں کو مناسب اور مؤثر نمائندگی دی جائے اور کسی صوبہ کی اکثریت کو اقلیت یا برابری میں تبدیل نہ کیا جائے ۔

(۴) مرکزی اسمبلی میں مسلمان ارکان کی تعداد ایک تہائی سے کم نہ ہو ۔

(۵) جداگانہ انتخاب کا طریقہ جاری رہے ۔ تاہم ہر قوم کو اجازت ہو کہ اپنی مرضی سے اس سے دست بردار ہوکر مخلوط انتخاب کے طریقے کو اپنا لے ۔

(۶) اگر کسی وقت صوبوں کی نئی حدبندی ہو تو پنجاب، بنگال اور سرحد میں مسلمانوں کی اکثریت پر اثر انداز نہ ہو ۔

(۷) کوئی ایسا مسودہ قانون یا تحریک منظور نہ کی جائے ، اگر کسی قوم کے تین چوتھائی ارکان اس کی مخالفت کریں ۔

(۸) تمام قوموں کو مذہبی آزادی حاصل ہو ۔

(۹) سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کیا جائے ۔

(۱۰) سرحد اور بلوچستان میں بھی دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات نافذ کی جائیں ۔

(۱۱) مسلمانوں کو تمام سرکاری اور خود مختار اداروں کی ملازمتوں میں مناسب حصہ دیا جائے ۔

(۱۲) مسلم ثقافت، تعلیم، زبان، مذہب اور شخصی قوانین کے تحفظ اور فروغ کے لیے دستور میں مناسب اہتمام کیا جائے ۔ مسلم خیراتی اداروں کو تحفظ دیا جائے ۔ اور ان کے لیے سرکاری امداد کا اہتمام کیا جائے ۔

(۱۳) مرکز اور صوبوں میں کم از کم ایک تہائی مسلم وزراء کے بغیر کوئی وزارت نہ بنائی جائے۔

(۱۴) دستور میں اس وقت تک کوئی ترمیم نہ کی جائے جب تک وفاق میں شامل تمام صوبے اور ریاستیں اس کی منظوری نہ دے دیں۔

خطبۂ الہ آباد

برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بہت اہمیت حاصل کر چکے تھے۔ تمام سیاسی رہنماؤں کو اس بات کا احساس تھا کہ جب تک اس مسئلہ کا تسلی بخش حل تلاش نہ کیا گیا، برصغیر میں کوئی آئینی ڈھانچہ کامیابی سے نہیں چل سکتا۔ اس کے باوجود سیاسی رہنما اس کا کوئی تسلی بخش حل تجویز نہ کر سکے۔ نہرو رپورٹ اور قائد اعظم کے چودہ نکات ہندو مسلم تعلقات کے حل کی دو متضاد تجاویز تھیں۔ کانگرس مسلمانوں کا الگ سیاسی وجود تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ جب کہ مسلم لیگ کا دعویٰ تھا کہ مسلمانوں کی ضروریات اور مطالبات وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اور مسلمانوں کے علیحدہ سیاسی وجود سے انکار کرنا حقیقت کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔

علامہ اقبال بھی ہندو مسلم سیاست کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔ ۱۹۳۰ء تک آپ برصغیر میں کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اب وہ صرف فلسفی اور شاعر ہی نہ تھے بلکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر بھی منتخب ہو چکے تھے۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں برصغیر کے راہنما جب لندن میں گول میز کانفرنس میں مصروف تھے اور عوام کی نگاہیں اس کے نتائج پر لگی ہوئی تھیں تو مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الہ آباد میں بلایا گیا جس کی صدارت علامہ اقبال نے کی، ان کا صدارتی خطبہ سیاسی تاریخ میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ آپ نے بڑی خوب صورتی سے مسلمانوں کے سیاسی مسائل کا جائزہ لے کر ان کا حل پیش کیا تھا۔

آپ نے اپنے خطبہ میں مسلمانوں کی علیحدہ قومیت پر روشنی ڈالی، اور دلائل سے ثابت کیا کہ برصغیر دو قوموں کا وطن ہے، اور مسلمان ایک الگ اور مکمل قوم ہیں۔ ان کی تہذیب و تمدن، ثقافت، زبان، مذہب، رسم و رواج اور اخلاقی تصورات دوسروں سے الگ ہیں۔ آپ نے تفصیل سے بتایا کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ جس میں زندگی کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی مسائل کے بارے میں مکمل رہنمائی موجود ہے۔ اور اسلام موجودہ دور کے ہر چیلنج کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ مسلمان اگر اپنا وجود قائم رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں اسلام کے حصار میں پناہ لینا ہوگی۔ آپ نے فرمایا کہ تاریخ اسلام سے یہ بات ثابت ہے کہ آڑے وقت میں اسلام نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ اگر وہ اپنی نگاہیں پھر سے اسلام پر مرکوز کر دیں اور اس کے زندگی پرور تخیل سے اثرپذیر ہوں تو ان کی منتشر اور پراگندہ قوتیں ازسرنو یکجا ہو جائیں گی اور ان کا وجود ہلاکت اور بربادی سے محفوظ رہے گا۔

آپ نے انسانوں اور ریاستوں کی زندگیوں میں مذہب کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلام ایک زندہ طاقت ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی بنانے میں یہ ایک اہم عنصر تھا۔ اس نے وفاداری کے

ان عناصر کو جنم دیا جنھوں نے منتشر افراد اور گروہوں کو بتدریج منظم کر دیا ۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ دنیا میں ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام نے افراد کو منظم کرنے کی طاقت کا بہترین مظاہرہ کیا ہے ۔ ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کے دوسرے فرقوں سے مختلف ہیں ۔ وہ اپنی مخصوص روایات کو برقرار رکھنے کا شدید جذبہ رکھتے ہیں ۔ انھیں کسی وسیع تر قومی اتحاد میں ضم نہیں کیا جا سکتا ۔ آپ نے فرمایا کہ تمام ہندوستانیوں کو ایک گروپ میں اکٹھا کرنا خلاف فطرت ہے مسلمانوں کا فرقہ ہر لحاظ سے الگ فرقہ ہے ۔ جس کے مفادات الگ ہیں اور جس کے تحفظ کے لیے خصوصی اقدامات کی ضرورت ہے ۔ مسلمان اگر ایک قوم کی حیثیت سے اپنے محفوظ مستقبل کے لیے کوشاں ہیں تو یہ ایک فطری امر ہے ۔ کیونکہ جدید تصورات کے مطابق دنیا کی ہر قوم کو اپنی علیحدہ منزل کے حصول کا حق حاصل ہے اگر ہندو انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کر کے آزادی کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں، تو مسلمان بھی ہندوؤں سے الگ ہو کر اپنے آزاد وجود کے قیام کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں ۔ آپ کے خیال میں کسی مسئلہ کے حل کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ حقیقت سے روگردانی نہ کی جائے ۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ہندوستان کے معاشرہ کی اکائیاں یورپ کی طرح جغرافیائی نہیں ہیں ۔ یہ ایک برعظیم ہے، جس میں کئی انسانی گروہ بستے ہیں ۔ جن کی نسلیں، زبانیں اور مذاہب مختلف ہیں ۔ ان سب گروہوں میں سوائے علاقائی ہم آہنگی کے اور کوئی خصوصیت مشترک نہیں ۔ ہندو خود بھی ایک متحدہ گروہ نہیں ۔ ان حالات میں ہندوستان میں یورپی جمہوریت کا اصول نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستانی قومیت کا نعرہ لگا کر مسلمانوں پر اکثریت کی مطلق العنان حکومت قائم کر کے حالات بہتر نہیں ہو سکتے۔ آئینی مسائل کا صرف ایک ہی حل ہے کہ مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا کے ناموں سے دو الگ ریاستیں قائم کر دی جائیں ۔ اپنے خطبہ کا مرکزی خیال پیش کرتے ہوئے آپ نے فرمایا :

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کے صوبوں کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے ۔ خواہ یہ ریاست برطانیہ کے اندر خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر ۔ مجھے تو ایسا نظر آ رہا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی" ۔

علامہ صاحب نے ہندوؤں اور انگریزوں سے کہا کہ وہ اس تجویز سے پریشان نہ ہوں، کیونکہ اسلام ایک مضبوط قوت ہے اور مسلمان اس کے دفاع کے لیے ایک خطہ زمین ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ نے اس کی مزید توضیح کرتے ہوئے فرمایا کہ شمال مغربی علاقوں میں الگ ریاست کا قیام ہندوستان کے دفاع میں بھی معاون ثابت ہوگا اور بیرونی حملہ کی صورت میں یہ ریاست ہندوستان کو خطرہ سے محفوظ رکھے گی ۔

اپنے خطبہ کے آخر میں آپ نے مسلمانوں کو ذاتی مقاصد سے بالا تر رہ کر مشترک اقدامات کرنے کی تلقین کی اور فرمایا :

"آخر میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانان ہند اس وقت زندگی کے جس نازک دور

سے گزر رہے ہیں ان کے ملی وجود کی بقا اور ہندوستان کے مفاد کے لیے کامل تنظیم، اتحاد، عزم اور مقصدیت کی ضرورت ہے ۔ موجودہ نازک حالات کے ازالہ کے لیے مستقبل قریب میں آزادانہ جد و جہد کرنا پڑے گی ۔ آزادانہ جد و جہد صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ پوری قوم میں اس کا عزم موجود ہو اور ان کے ارادے ایک مرکز پر مرکوز ہوں"۔

علامہ اقبال کا یہ خطبہ مسلمانوں کی جد و جہد میں خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ یہ خطبہ مسلمانوں کے لیے روشنی کا ایک ایسا مینار تھا جس نے مسلمانوں کو ایک نئی راہ دکھائی اور ایسی منزل کی طرف راہنمائی کی جس کے حصول کے بغیر ان کے مسائل کا حل ناممکن تھا ۔

کانگرسی وزارتیں ۳۹ - ۱۹۳۷ء

سائمن کمیشن کی ناکامی اور نہرو رپورٹ پر مسلم لیگیوں کی کڑی تنقید نے مزید آئینی اقدامات کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دی تھی ۔ کانگرس حکومت پر زور دے رہی تھی کہ وہ نہرو رپورٹ پر انحصار کرتے ہوئے آئین مرتب کرے اور مسلم لیگ کی کوشش تھی کہ ایسا نہ ہونے پائے ۔ چنانچہ اس مسئلے پر برصغیر کے قائدین سے گفت و شنید کے لیے برطانوی حکومت نے لندن میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک تین گول میز کانفرنسیں منعقد کیں ۔ ان کانفرنسوں میں برصغیر کی تمام بڑی بڑی جماعتوں اور دس ریاستوں کے نمائندوں نے شرکت کی ۔ ان میں مسلم لیگ کی طرف سے قائد اعظم سمیت چند مسلمان راہنماؤں نے بھی شرکت کی ۔ ان کانفرنسوں میں کوئی سمجھوتہ نہ ہوسکا ۔ اس لیے برطانوی حکومت نے اپنی مرضی سے برصغیر میں ایک نیا دستوری قانون نافذ کیا، جس کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کہتے ہیں ۔ اس کی رو سے برصغیر میں صوبوں کو مزید اختیارات دے دیے گئے ۔

نیا آئین نافذ ہوا تو عام انتخابات کرانے کا اعلان بھی کر دیا گیا ۔ ۱۹۳۷ء میں انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ کو تمام صوبوں میں شدید مقابلے کا سامنا کرنا پڑا، مسلم اقلیت کے صوبوں میں تو کانگرس ویسے ہی چھائی ہوئی تھی۔ مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلم لیگ کو خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی ۔ جن صوبوں میں غیرکانگریسی اکثریت میں تھے، وہاں وزارتیں قائم ہوگئیں ۔ اور یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو نئے قانون کے تحت صوبائی خود مختاری نافذ کر دی گئی ۔ باقی صوبوں میں کانگرس نے وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا اور مطالبہ کیا کہ صوبائی گورنر وزارت کے کاموں میں دخل نہ دیں اور اپنے مخصوص اختیارات سے دستبرداری کا اعلان کریں ۔ وائسرائے نے وضاحت کی کہ یہ اختیارات محض ناگزیر صورتوں میں استعمال کیے جا سکیں گے اور گورنر بلاوجہ وزارت کے کاموں میں دخل نہیں دیں گے ۔ وائسرائے کے اس وعدہ کے پیش نظر جولائی ۱۹۳۷ء میں کانگرسی ہائی کمان نے وزارتیں بنانے کی اجازت دے دی ۔ چنانچہ باقی صوبوں میں بھی کانگرس نے وزارتیں قائم کر لیں ۔

مسلم لیگ نے کانگرسی وزارتوں سے تعاون کرنے کے لیے مطالبہ کیا، کہ مسلم اقلیت کے صوبوں

میں مسلم لیگ کے نمائندوں کو کانگرسی وزارتوں میں شامل کیا جائے ۔ کیونکہ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق صرف مسلم لیگ کو حاصل ہے ۔ لیکن کانگرس کو یہ بات گوارا نہ تھی ۔ چنانچہ مسلم لیگ کے نمائندوں کو وزارتوں میں شامل کرنے کے لیے یہ شرط رکھی، کہ مسلم لیگ سے استعفیٰ دے کر کانگرس میں شامل ہو جائیں تو وزارت میں شامل کرنے کے سوال پر غور کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن مسلم لیگ کو یہ بات قطعاً منظور نہ تھی ۔ چنانچہ کانگرس نے مسلم لیگ کے نمائندوں کو وزارت میں شامل کرنے سے صاف انکار کر دیا ۔

بیشتر صوبوں میں کانگرس نے اپنی یکجماعتی وزارتیں قائم کر لیں، اور کام شروع کر دیا ۔ ہندوؤں نے کانگرس حکومت کو "ہندو راج" کا نام دیا ۔ اور مسلمانوں کے خلاف منظم سازش کے تحت کارروائی ہونے لگی ۔ مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت، زبان، ادب، مذہب اور روایات کو کچلنے کے لیے بھرپور حملے شروع کر دیے گئے ۔ سرکاری عمارتوں پر کانگرس کے جھنڈے لہرائے گئے ۔ سکولوں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں مسلم آزار ترانہ "بندے ماترم" گایا جانے لگا ۔ مسلمانوں پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیے گئے ۔ اُردو پر ہندی کی بالادستی قائم کرنے کے لیے عدالتوں، کچہریوں، سکولوں اور کئی دوسرے اداروں میں ہندی رائج کرنے کی کوشش کی گئی ۔ ودیا مندر سکیم اور واردھا سکیم کے نام سے تعلیمی منصوبے بنائے گئے، جن پر عمل ہونے کی صورت میں مسلمان بچوں کے ذہن میں ہندو تصورات پیدا کیے جا سکتے تھے ۔ ہر طالب علم کو گاندھی کی مورتی کے سامنے با ادب طریقے سے جھک کر ہاتھ جوڑنے پر مجبور کیا گیا ۔ گاندھی کے علاوہ کئی دوسرے ہندو رہنماؤں کو ہیرو بنا کر تعلیمی اداروں میں پیش کیا جاتا ۔ اس قسم کی مختلف سرگرمیوں کے ذریعے سے ہندو مذہب کو اُجاگر کرنے اور مسلمانوں کی تہذیب کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ۔

ہندوؤں نے حکومت کی شہ پر مختلف مقامات پر مسلمانوں کو قتل کرنا اور ان کی جائیدادوں کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا ۔ ہندو غنڈے نماز کے وقت مسجدوں کے سامنے باجے بجا کر مسلمانوں کو پریشان کرنے لگے ۔ کانگرسیوں نے گھر گھر جا کر مسلمانوں کو کانگرس میں شمولیت کی ترغیب دینا شروع کر دی ۔ مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو خطرے میں پڑ گئی ۔ ہندو ذہنیت پوری طرح آشکارا ہو گئی ۔ اور ہندوؤں سے حسن ظن رکھنے والے مسلمان قائدین کی بھی آنکھیں کھل گئیں ۔

مسلم لیگ نے کانگرسی وزارتوں کی کارکردگی اور مسلمانوں سے روا رکھی گئی ناانصافیوں کی تحقیقات کرائیں، جو پیرپور اور شریف رپورٹ کے نام سے موسوم ہیں ۔ ان کمیٹیوں کی رپورٹوں نے کانگرسی وزارتوں کے مظالم کو دنیا کے سامنے بے نقاب کیا ۔ اور کانگرسی وزارتوں کی زیادتیوں کے رد عمل کے طور پر مسلمانوں میں اپنے حقوق کے تحفظ کا شعور بیدار ہوا ۔ کانگرس کے طرز عمل کے پیش نظر ہندو مسلم اتحاد کا امکان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ۔ اور مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت

بن کر اُبھری ۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی ۔ اس جنگ میں برطانیہ بھی شریک تھا ۔ اسے برصغیر کے عوام کی حمایت کی ضرورت تھی ۔ انگریزوں کی اس مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوؤں نے اس سے سیاسی مفاد حاصل کرنا چاہا ۔ انگریزوں نے جب ان کا مطالبہ رد کر دیا تو انھوں نے حکومت کی جنگی مساعی کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا اور بعد میں مزید دباؤ ڈالنے کے لیے صوبوں کی وزارتوں سے استعفیٰ دے دیا ۔ مسلمانوں نے اس پر اطمینان کا سانس لیا ۔

۲۲- دسمبر ۱۹۳۹ء کو مسلم لیگ نے یوم نجات منایا ۔ مختلف مقامات پر جلسے منعقد ہوئے، جن میں کانگرسی راج کے خاتمے پر خوشی کا اظہار کیا گیا ۔ اور مسلم لیگ کی قیادت کی حمایت کا اعادہ کیا گیا کانگرسی وزارتوں کی دست برداری ایک لحاظ سے مسلم لیگ کے لیے مفید ثابت ہوئی کیونکہ بنگال، پنجاب، سرحد اور آسام میں اس کی وزارتیں قائم ہو گئیں ۔ اور باقی صوبوں میں گورنروں نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی اور مشیروں کی مدد سے انتظام چلانے لگے ۔

قرارداد پاکستان

برصغیر پاک و ہند کے مسلمان اپنے آپ کو ایک قوم سمجھتے ہیں، جو ایک مخصوص تہذیب و تمدن ثقافت، تاریخ، ورثہ اور فلسفہ حیات کی مالک ہے ۔ انھوں نے اپنی اس ممتاز حیثیت کو ہمیشہ برقرار رکھا ۔ یہی وجہ تھی کہ پوری ہندو قوم اپنی کوشش کے باوجود اسے اپنے اندر جذب نہ کر سکے ۔ کانگرس کی صوبائی وزارتوں کے دور میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی، کہ وفاق ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو سخت خطرہ لاحق رہے گا ۔ ہندو جمہوریت کا نام لےکر مسلمانوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کریں گے ۔ لہذا انھوں نے سنجیدگی سے اس مسئلے کا حل تلاش کرنا شروع کر دیا ۔

۲۳- مارچ ۱۹۴۰ء کا دن برصغیر پاک و ہند کی سیاسی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس دن مسلم لیگ نے لاہور کے تاریخی اجلاس میں ایک قرارداد منظور کرکے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے جداگانہ ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا ۔ تاریخی اجلاس منٹو پارک (اقبال پارک) لاہور میں منعقد ہوا ۔ جس کی صدارت قائد اعظم محمد علی جناح نے کی ۔ آپ نے اپنے خطبہ صدارت میں برصغیر کے گذشتہ حالات و واقعات کا ذکر کرنے کے بعد قومیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :

"ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلق دو مختلف مذہبی فلسفوں، معاشرتی رواجوں اور ادبیات سے ہے ۔ نہ ان کے درمیان شادیاں ہوتی ہیں، نہ یہ ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں دو ایسی تہذیبوں کے پیرو ہیں، جن کی بنیاد متصادم خیالات اور تصورات پر ہے ۔ یہ بالکل واضح ہے کہ وہ تاریخ اور ہے جس پر ہندوؤں کو فخر اور ناز ہے اور وہ اور ہے جس پر مسلمان نازاں ہیں ان کی رزمیات الگ الگ، ان کے ہیرو اور ان کے المیے بھی ایک دوسرے سے قطعی بیگانے اور

مختلف ہیں ۔ اکثر و بیشتر معاملات میں ایک کا ہیرو دوسرے کا دشمن ہے ۔ اور اسی طرح فتوحات اور شکستوں کا حال ہے ۔ ایک کی فتح دوسرے کی شکست اور دوسرے کی فتح پہلے کی شکست سمجھی جاتی ہے"۔

مسلمانوں کے لیے آزاد اور خود مختار ریاست کی اہمیت کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا :

"ہندوستان کا مسئلہ فرقہ وارانہ نوعیت کا نہیں، بین الاقوامی ہے ۔ جب تک اس بنیادی حقیقت کو نہیں سمجھا جائے گا ۔ چاہے کیسا ہی دستور بنایا جائے، تباہی کا پیش خیمہ ہوگا ۔ نہ صرف مسلمانوں بلکہ انگریزوں اور ہندوؤں کے لیے بھی نقصان دہ ہوگا ۔ اگر برطانوی حکومت برصغیر کے لوگوں کے لیے واقعی امن اور خوشی کے حصول کی متمنی ہے تو اس کے لیے صرف ایک راستہ ہے کہ ہندوستان کو دو خود مختار اور آزاد ریاستوں میں تقسیم کرکے بڑی اقوام (ہندوؤں اور مسلمانوں) کو جداگانہ وطن بنانے کی اجازت دے ۔ مسلم انڈیا کوئی ایسا دستور قبول نہیں کرے گا جس سے ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے"۔

وہ بات جو عرصہ دراز سے ایک امکان اور ایک تجویز کی صورت میں مسلمانوں کے سامنے تھی، اُسے آج قائد اعظم نے ایک واضح نصب العین اور متعین منزل کی صورت میں قوم کے سامنے رکھ دیا تھا ۔ قائداعظم کی تقریر کی روشنی میں ایک قرارداد ترتیب دی گئی ۔ جسے شیر بنگال مولوی اے۔ کے۔ فضل حق نے اجلاس میں پیش کر دیا ۔ اس قرارداد کا خلاصہ درج ذیل ہے :

"مسلم لیگ کے اس اجلاس کی یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ اس ملک میں وہی دستور قابل عمل اور مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہوگا جو ذیل کے بنیادی اصولوں کے مطابق طے کیا جائے گا :

(۱) جغرافیائی لحاظ سے باہم متصل یونٹوں کی خطوں کی صورت میں حد بندی کی جائے ۔ اور یہ خطے ضرورت کے مطابق علاقائی رد و بدل کرکے اس طرح قائم کیے جائیں کہ ان علاقوں کو جہاں مسلمانوں کی عددی اکثریت ہے، جیسا کہ برصغیر کے شمال مغربی اور مشرق حصوں میں ہے، آزاد مملکتوں کی صورت میں اکٹھا کر دیا جائے، جن کے اندر شامل ہونے والی اکائیاں خود مختار اور حاکمیت کی حامل ہوں ۔

(۲) ان اکائیوں اور علاقوں کے دستور میں اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی اور انتظامی حقوق و مفادات کی حفاظت کے لیے ان کے مشورے سے کافی اور مؤثر تحفظات رکھے جائیں ۔ اس طرح کے تحفظات کے ذریعے ہندوستان کے ان حصوں میں جہاں مسلمان اقلت میں ہیں ان کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے ۔

یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کو اختیار دیتا ہے کہ مذکورہ بالا بنیادی اصول کے بموجب ایسی دستوری سکیم مرتب کرے جس میں ان ریاستوں کو سارے مسائل، مثلاً دفاع، خارجی معاملات، رسل و

وسائل، کسٹم اور دیگر ضروری امور کا اختیار دیا گیا ہو"۔

یہ قرارداد لاہور، بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی۔ قرارداد پاکستان کو پاکستان کے قیام کے سلسلے میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس قرارداد کے بعد مسلمانوں کی سیاسی تحریک ایک نئے دور میں داخل ہو گئی۔ اس قرارداد کی تائید میں مسلم لیگ کے زیر اہتمام ملک بھر میں اجلاس منعقد ہوئے۔ جن میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ ریاست کا مطالبہ کیا گیا۔ کانگرس کا رد عمل شدید تھا، اس کی کوشش تھی کہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن قائم نہ ہونے دیا جائے۔ ہندو قائدین نے تصور پاکستان کو مجذوب کی بڑ قرار دیا۔ کانگرس نے سرکاری طور پر ۱۹۴۲ء میں ایک قرارداد منظور کی جس میں برصغیر کی تقسیم کو ایک خطرناک سازش قرار دیا گیا۔ برطانوی حکومت کی ہمدردیاں بھی کانگرس کے ساتھ تھیں اور وہ برصغیر میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن قائم کرنے کی حامی نہ تھی۔

کرپس کی تجاویز

دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی سالوں میں برطانوی حکومت کو برصغیر کی سیاسی جماعتوں کے تعاون کی بہت ضرورت تھی، لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ برصغیر کے سیاسی مستقبل کا جلد سے جلد فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ حکومت نے کسی مشترکہ سیاسی فارمولے کی تشکیل کے لیے ۱۹۴۲ء میں مسٹر سٹیفورڈ کرپس کو برصغیر میں بھیجا۔ کرپس نے یہاں مسلم لیگ اور کانگرس کے قائدین سے ملاقاتیں کرکے ان کا نقطہ نظر معلوم کیا۔ اور حالات کا جائزہ لینے کے بعد سفارشات مرتب کیں۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ دوران جنگ برطانیہ کا قبضہ برقرار رہے گا۔ اور جنگ ختم ہونے کے بعد ملک میں ایک دستور ساز اسمبلی بنائی جائے گی، جو آزاد مملکت کے لیے دستور بنائے گی۔ البتہ جن صوبوں کو اس دستور سے اتفاق نہ ہو، وہ اپنے لیے الگ دستور بنانے کے مجاز ہوں گے۔ کرپس کی تجاویز کو کانگرس نے مسترد کر دیا، کیونکہ اس کے نزدیک صوبوں کو دستورسازی کا حق دینا برصغیر کی تقسیم کے مترادف تھا۔ دوسری طرف مسلم لیگ نے ان تجاویز کو اس لیے رد کر دیا کہ ان میں قیام پاکستان کے مطالبہ کو واضح طور پر تسلیم نہ کیا گیا تھا۔ لہذا کرپس کا مشن ناکام ہو گیا۔ کرپس مشن کی ناکامی کے بعد برصغیر کے سیاسی حالات مزید ابتر ہوگئے۔ کانگرس نے اس دوران "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک شروع کی، کانگرس نے جلسے جلوس نکالے، کئی جگہ تشددآمیز واقعات ہوئے۔ اور ملک کے امن و امان کو تہ و بالا کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ انگریز مجبور ہوکر اقتدار کانگرس کے حوالے کر دیں گے، اور انہیں من مانی کارروائیاں کرنے کا موقعہ مل جائے گا۔ قائد اعظم نے اس تحریک کو "مسلم لیگ، اور مسلمانوں کو غلام بنانے کا ایک ہتھکنڈہ" قرار دیا۔ چنانچہ مسلم لیگ اس تحریک سے کنارہ کش رہی۔ حکومت نے متعدد کانگرسی قائدین کو گرفتار کر لیا۔ اس طرح وہ اس تحریک کو دبانے میں کامیاب ہوگئی۔

اس تحریک کی ناکامی سے کانگرس پر یہ بات واضح ہوگئی کہ مسلم لیگ کے تعاون کے بغیر

آزادی کی کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی - چنانچہ راجگوپال آچاریہ نے مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان مفاہمت کرانے کے لیے قائد اعظم سے رابطہ قائم کیا - جو کانگرسی لیڈروں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ناکام ہوا - اس کی ناکامی کے بعد گاندھی اور قائد اعظم کے درمیان براہ راست مذاکرات کا ایک سلسلہ شروع ہوا - گاندھی نے راجگوپال آچاریہ کے فارمولے کو گفت و شنید کی اساس بنایا - لیکن جب قائد اعظم نے اس کے خلاف بھرپور استدلال کیا تو گاندھی نے قرارداد پاکستان پر تنقید شروع کر دی اور قائد اعظم کے دو قومی نظریہ کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا - فریقین اپنے اپنے مؤقف پر قائم رہے اور یہ مذاکرات بھی ناکام ہو گئے -

شملہ کانفرنس

۱۹۴۳ء میں لارڈ ویول برصغیر کا وائسرائے مقرر ہوا - لارڈ ویول کا خیال تھا کہ اگر برصغیر میں مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کو عبوری حکومت میں ساتھ دینے کے لیے آمادہ کر لیا جائے تو ممکن ہے کہ وہ ان تمام نمائندوں کو کسی طویل المیعاد فارمولے پر رضامند کر لیں، جس سے برصغیر کی وحدت برقرار رکھی جا سکے - اس مقصد کے حصول کے لیے لارڈ ویول نے مختلف سیاسی رہنماؤں سے گفت و شنید بھی کی، لیکن کوئی خاطرخواہ نتیجہ نہ نکل سکا - مارچ ۱۹۴۵ء میں لارڈ ویول برصغیر کے سیاسی مستقبل کے بارے میں برطانوی حکومت سے مشورہ کرنے کے لیے انگلستان گیا اور ۴ جون ۱۹۴۵ء کو اپنے منصوبے کی منظوری لےکر واپس آیا - اس نے ۱۴ جون کو اپنی نشری تقریر میں اعلان کیا کہ اسی ماہ شملہ میں سیاسی رہنماؤں کی کانفرنس طلب کی جائے گی، جس میں حکومت کی پیش‌کردہ تجاویز پر غور کیا جائے گا - وائسرائے نے ۲۵ جون ۱۹۴۵ء کو شملہ کانفرنس طلب کی جس میں مسلم لیگ، کانگرس اور دوسری سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کے علاوہ صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کو بھی مدعو کیا گیا - اس میں کانگرس کی نمائندگی کانگرس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد نے کی، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت نہیں ہے - کانفرنس کی افتتاحی تقریروں نے کانفرنس کی غرض و غایت بیان کی اور شرکائے کانفرنس سے حکومت کے ساتھ تعاون کی اپیل کی - اس کے بعد کانگرس کے صدر نے کانفرنس سے خطاب کیا اور اپنی تقریر میں کہا "کانگرس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ ایسی چیز میں فریق بنے خواہ وہ عارضی ہی کیوں نہ ہو جس سے اس کی قومی حیثیت کو نقصان پہنچے" - اس کے بعد قائد اعظم نے اس کے جواب میں اپنی تقریر میں کہا کہ کانگرس صرف ہندوؤں کی نمائندگی کرتی ہے - اور مسلم لیگ پاکستان کے سوا کسی اور بنیاد پر مفاہمت نہیں کر سکتی -

کانفرنس میں جب ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل اور مختلف فرقوں کی نمائندگی کا معاملہ زیر بحث آیا تو نیشنلسٹ پارٹی نے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے مساوات کے اصول کی مخالفت کی - کانگرس نے اس اصول کی زیادہ مخالفت نہ کی لیکن اس بات پر اصرار کیا کہ کانگرس کو بھی ایگزیکٹو

کونسل میں مسلمان نمائندوں کو نامزد کرنے کا حق دیا جائے جب کہ مسلم لیگ کا موقف تھا کہ مسلمان نمائندوں کو نامزد کرنے کا اختیار صرف مسلم لیگ کو ہونا چاہیے ۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ خضر حیات ٹوانہ اور ان کی یونینسٹ پارٹی کا مطالبہ تھا ایگزیکٹو کونسل کی ایک نشست انھیں دی جائے ، کیونکہ جنگ کے دوران پنجاب نے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں حکومت سے زیادہ تعاون کیا تھا ۔ مسلم لیگ اس صورت حال کو کسی طرح گوارا نہ کر سکتی تھی، اس لیے کانفرنس میں تعطل پیدا ہوگیا ۔

کانفرنس میں پیدا شدہ تعطل کو ختم کرنے کے لیے سیاسی رہنماؤں کے درمیان نجی مشورے ہوئے ۔ مسلم لیگ اور کانگرس میں سمجھوتے کے لیے قائد اعظم اور مسٹر پنتھ کے درمیان گفتگو ہوئی، لیکن یہ گفتگو ناکام رہی، کیونکہ دونوں جماعتیں اپنے اپنے سیاسی مطالبات سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ تھیں ۔

۲۹ جون کو وائسرائے نے اس تعطل کو دور کرنے کے لیے تمام سیاسی جماعتوں سے ایگزیکٹو کونسل کے لیے ناموں کی فہرست طلب کی اور کہا کہ ہر ایک جماعت اپنی مخصوص نشستوں کی تعداد سے زیادہ نام پیش کرے ۔ وائسرائے کا خیال تھا کہ اس طریقے سے ایسے افراد کا انتخاب کر سکے گا جنھیں سب پسند کریں گے ۔ کانگرس نے فوری طور پر ایک فہرست وائسرائے کو پیش کر دی جس میں دو مسلمانوں (مولانا ابوالکلام آزاد اور آصف علی) کے نام بھی شامل تھے ۔ کانگرس کا مطالبہ تھا کہ مسلمانوں کی پانچ مخصوص نشستوں میں سے دو اسے دی جائیں کیونکہ کانگرس ہندوستان کی نمائندہ قومی جماعت ہے ۔

۶ جولائی ۱۹۴۵ء کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا ، جس میں وائسرائے کی تجویز کو ناپسند کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ فہرست کی بجائے وائسرائے اور مسلم لیگ کے صدر کے درمیان خفیہ بات چیت میں ہی ممبران کے انتخاب کا فیصلہ ہو ۔ ۸ جولائی کو قائد اعظم وائسرائے سے ملے اور مسلم لیگ کے مطالبات کی وضاحت کی، مگر وائسرائے نے اس تجویز کو نامنظور کیا کہ کونسل کے تمام مسلم ارکان مسلم لیگ سے لیے جائیں ۔ چنانچہ ۹ جولائی کو قائد اعظم نے وائسرائے کو تحریری اطلاع دے دی کہ اس صورت میں مسلم لیگ کی طرف سے ایگزیکٹو کونسل کے لیے کوئی فہرست پیش نہیں کی جائے گی کیونکہ مسلم لیگ اپنے بنیادی اصولوں کو ترک نہیں کر سکتی ۔

وائسرائے نے دوسری جماعتوں کی پیش کردہ فہرستوں کی بنا پر ایک فہرست تیار کی ۔ مسلمانوں کے لیے پانچ نشستیں مخصوص کی گئیں، چار مسلم لیگ کو اور ایک پنجاب کے وزیراعلیٰ (یونینسٹ) کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ۔ وائسرائے نے اپنے اس فیصلے سے قائد اعظم کو تحریری طور پر مطلع کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر وہ چاہیں تو ان چار ناموں میں رد و بدل بھی کر سکتے ہیں ۔ لیکن قائد اعظم نے اس تجویز کو رد کر دیا، نتیجتاً کانفرنس ناکام ہوگئی ۔ اور ۱۴ جولائی ۱۹۴۵ء کو وائسرائے نے کانفرنس کی ناکامی کا باقاعدہ اعلان کر دیا ۔

مسلم لیگ نے شملہ کانفرنس میں ویول منصوبے سے عدم تعاون کرکے پاکستان کے قیام کی بنیادیں

مضبوط کر دیں ۔ مسلمانوں پر نہ صرف کانگرس کے منصوبے واضح ہوگئے بلکہ ان مسلمانوں کا پول بھی کھل گیا جو مسلم لیگ اور مطالبہ پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے چنانچہ مسلم لیگ کے مخالف ایسے مسلمانوں کی مقبولیت کم ہو گئی ۔ برطانوی حکومت اور کانگرس کو بھی پتہ چل گیا کہ مسلم لیگ مطالبہ پاکستان کے متعلق کتنی سنجیدہ ہے اور حکومت اسے کوئی ایسا منصوبہ منظور کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی جو مسلم لیگ کے اصولوں کے مطابق نہ ہو ۔

انتخابات ۱۹۴۶ء

شملہ کانفرنس کے دوران بعض حلقوں کی طرف سے عام انتخابات کا مطالبہ کیا گیا ۔ مسلم لیگ نے بھی عام انتخابات جلد از جلد منعقد کرانے پر زور دیا چنانچہ ۲۱ اگست ۱۹۴۵ء کو وائسرائے نے اعلان کیا کہ آئندہ موسم سرما میں مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے انتخابات ہوں گے ۔ پھر وہ برطانوی حکومت سے مشورہ کرنے کے لیے برطانیہ چلے گئے ۔ برطانیہ سے واپس آکر وائسرائے نے اعلان کیا کہ انتخابات کے بعد ایک مجلس دستور ساز قائم کی جائے گی اور برصغیر کی بڑی جماعتوں کے تعاون و اشتراک سے نئی ایگزیکٹو کونسل تشکیل دی جائے گی ۔

اس اعلان کے بعد ملک میں عام انتخابات کے لیے بڑے زور سے تیاریاں شروع ہو گئیں ۔ تمام جماعتوں نے اس کے لیے انتظامات شروع کر دیے ۔ مسلم لیگ نے انتخابات کے لیے ایک پارلیمنٹری بورڈ نوابزادہ لیاقت علی خاں کی صدارت میں قائم کیا ۔ مسلم لیگ پاکستان کے سوال پر انتخاب لڑنے کا عزم رکھتی تھی، اس لیے اس کا منشور یہ تھا کہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان ایک قوم ہیں ۔ اور ان کے سیاسی مسائل کا واحد حل قیام پاکستان ہے ۔ اس کے برعکس کانگرس کا مؤقف یہ تھا کہ وہ برصغیر کے تمام عوام کی نمائندہ جماعت ہے، اور برصغیر ایک متحد ملک رہے گا ۔

مسلم لیگ کے لیے یہ انتخابات زندگی اور موت کا مسئلہ تھا ۔ وہ جانتی تھی کہ اگر مسلمانوں نے اس موقعہ پر غلط فیصلہ کر لیا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائیں گے ۔ قائد اعظم اور دوسرے مسلم لیگی رہنماؤں نے ملک بھر کے طوفانی دورے شروع کر دیے اور مسلم اتحاد کے لیے کوشش کرنے لگے ۔ قائد اعظم نے ایسی جماعتوں سے خصوصی رابطہ قائم کیا، جنھوں نے ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی مخالفت کی تھی ۔ قائداعظم کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور مسلمانوں کی اکثریت مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہوگئی ۔ اس دور میں مسلمان طالب علموں نے بھی مسلم لیگ کے لیے بہت کام کیا، یہ نوجوان دور دراز علاقوں اور دیہاتوں میں گئے اور مسلمانوں کو مسلم لیگ کے منشور سے آگاہ کیا ۔

کانگرس نے مسلم لیگ کی سرگرمیوں کے مقابلے میں اپنی وسیع پروپیگنڈہ مشینری قائم کی ۔ کانگرسی اخبارات نے مسلم لیگ اور جناح پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیا ۔ مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کو دھرتی

ماتا کے ٹکڑے کرنے والا منصوبہ قرار دیا اور مسلم لیگی مطالبات کو مذہبی تعصبات اور رجعت پسندانہ نظریات پر مبنی قرار دیا ۔ کانگرس نے مسلم لیگ کی تنظیم پر حملے کیے اور اسے نوابوں، انگریز کے وظیفہ خوروں اور سرمایہ داروں کی جماعت ہونے کا پروپیگنڈہ کیا، اس نے مسلمانوں سے براہ راست رابطہ قائم کرکے انھیں مسلم لیگ کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی، اس ضمن میں کانگرس کو نیشنلسٹ مسلمانوں اور چند دیگر طبقوں کی حمایت حاصل تھی ۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور اس قسم کے دیگر لوگوں کو مسلمانوں کے سامنے پیش کرکے مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی ۔

پروگرام کے مطابق دسمبر ۱۹۴۵ء کو مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے ۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے ۳۰ نشستیں مخصوص تھیں ۔ مسلم لیگ نے تمام نشستیں جیت لیں اور کانگرس قومی جماعت کی دعوے دار ہونے کے باوجود ایک نشست بھی حاصل نہ کر سکی ۔ انتخابات کے نتائج کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ مسلم لیگ کے آٹھ امیدوار بلا مقابلہ کامیاب ہوئے اور انھی حلقوں میں مسلم لیگ کے مخالف امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں ۔

صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات فروری ۱۹۴۶ء میں منعقد ہوئے ۔ مسلم لیگ نے کامیابی حاصل کی ۔ انتخابات کے نتائج نے ثابت کر دیا کہ مسلم لیگ بہت بڑی سیاسی قوت ہے جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ نیز یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ کانگرس صرف ہندوؤں کی جماعت ہے اور مسلمانوں کی نمائندگی کا حق صرف مسلم لیگ کو حاصل ہے ۔ نیز قیام پاکستان کے مطالبہ کو مسلمانوں کی اکثریت کی حمایت حاصل ہے ۔

اپریل ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے مرکزی مجالس قانون ساز کے تمام مسلم لیگی ممبروں کا ایک کنونشن دہلی میں طلب کیا، جس میں پانچ سو سے زائد ممبروں نے شرکت کی، اس کنونشن کی صدارت قائداعظم محمد علی جناح نے کی ۔ اس کنونشن میں مسٹر حسین شہید سہروردی نے ایک قرارداد پیش کی جسے اتفاق رائے سے منظور کرلیا گیا، اس قرارداد میں کہا گیا کہ متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر کوئی دستور ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تو مسلمان اپنی بقا کے لیے ہر ممکن اقدام کریں گے اس قرارداد میں شمال مشرقی خطہ میں بنگال اور آسام، اور شمال مغربی خطہ میں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کو ملا کر ایک آزاد اور خود مختار مملکت قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا ۔ کنونشن کے اختتام پر ہر ممبر نے مسلم لیگ سے وفاداری اور قیام پاکستان کے لیے جد و جہد کرنے اور ہر قسم کی قربانی دینے کا حلف بھی اُٹھایا ۔

کابینہ وفد کا منصوبہ

۱۹۴۶ء میں برطانیہ کے وزیراعظم مسٹر ایٹلی نے اپنی وزارتوں کے تین ارکان کا وفد برصغیر کے مسائل سلجھانے کے لیے یہاں بھیجا ۔ وزارتی مشن نے دہلی اور شملہ میں مختلف جماعتوں کے نمائندوں سے ملاقاتیں کیں، لیکن مسلم لیگ اور کانگرس میں کوئی سمجھوتہ نہ ہوسکا ۔ آخرکار مئی ۱۹۴۶ء میں وزارتی مشن

نے آئینی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے نظام حکومت کا ایک خاکہ مرتب کیا جو "کابینہ وفد کا منصوبہ" کہلاتا ہے، وفد نے برصغیر میں صوبوں کے تین گروپ بنانے کی تجویز پیش کی۔ پہلے گروپ میں مدراس، بمبئی، صوبجات متحدہ، بہار، صوبجات متوسط اور اڑیسہ کے صوبے شامل تھے، جن میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ دوسرے گروپ میں پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ۔ اور تیسرے گروپ میں بنگال اور آسام کے صوبے شامل تھے۔ آخری دونوں گروپوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ تجویز میں یہ بھی شامل تھا کہ یہ تینوں گروپ اپنا اپنا آئین مرتب کریں گے۔ لیکن اس آئین میں دفاع، امور خارجہ اور رسل و رسائل شامل نہیں ہوں گے۔ کیونکہ یہ تینوں شعبے مرکزی حکومت کے قبضے میں رہیں گے۔ نیز ہر صوبے کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنے متعلقہ گروپ سے جب چاہے علیحدگی اختیار کر لے۔

متذکرہ تجویز پیش کرنے کے بعد وزارتی مشن نے یہ پیشکش بھی کی کہ جو جماعت بھی ان تجاویز کو قبول کر لےگی اسے نئی عبوری حکومت میں شامل کر لیا جائے گا۔ مسلم لیگ نے ان تجاویز کو قبول کر لیا، لیکن کانگرس نے اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا، کیونکہ اسے اس میں قیام پاکستان کا امکان نظر آ رہا تھا۔ کانگرس کے انکار کے بعد حکومت پابند تھی کہ وہ مسلم لیگ کو وزارت بنانے کی دعوت دے لیکن وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو گئی۔ حکومت کی وعدہ خلافی کے باعث مسلم لیگ نے وزارت میں شمولیت کا فیصلہ واپس لے لیا اور وزارتی کمیشن کی تجاویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مسلم لیگ کی طرف سے تجاویز مسترد ہوتے ہی کانگرس نے اسے منظور کر لیا۔ چنانچہ وائسرائے نے کانگرس کو عبوری حکومت میں شمولیت کی دعوت دے دی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی سرکردگی میں کانگرس کے کچھ وزراء کو حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ اس پر مسلم لیگ نے راست اقدام کیا۔ عملی احتجاج کا آغاز ہوا تو وائسرائے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے قائد اعظم سے ملاقات کرکے وزارت میں شمولیت کی پیشکش کی۔ قائد اعظم نے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی خاطر مرکزی حکومت میں شمولیت کی پیشکش قبول کر لی، اور لیاقت علی خان کی سرکردگی میں مسلم لیگ کے پانچ ارکان مرکزی حکومت میں شامل ہو گئے۔

وائسرائے نے ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء کو دستور ساز اسمبلی کا اجلاس طلب کیا۔ لیکن مسلم لیگ متحدہ دستور ساز اسمبلی میں شرکت کے لیے تیار نہ تھی لہذا اس نے دستور سازی میں کوئی حصہ نہ لیا۔ برطانوی حکومت کو اس بات کا احساس تھا کہ مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کی مرضی کے بغیر کوئی آئین نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے دونوں سیاسی جماعتوں میں مفاہمت کی کوشش شروع کر دی گئی۔ اس سلسلے میں ۶ دسمبر ۱۹۴۶ء کو لندن میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں قائد اعظم، لیاقت علی خان، پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ شریک ہوئے۔ وزارتی مشن کے تینوں ارکان کانفرنس میں موجود تھے قائد اعظم نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی اور کانفرنس میں شریک لوگوں کو یہ باور کرا دیا کہ وزارتی مشن

کی تجاویز ناقابل عمل ہیں اور مسلمان قیام پاکستان سے کم کسی بات پر مطمئن نہیں ہو سکتے۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کا منصوبہ

۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو برطانوی وزیراعظم ایٹلی نے دارلعوام میں ایک اہم بیان دیا۔ جس میں انہوں نے کہا کہ برطانوی حکومت کی کوشش رہی ہے کہ ہندوستان میں خود مختار نظام حکومت رائج کیا جائے۔ اس نے جمہوری اصولوں کے فروغ کے لیے وقتاً فوقتاً مختلف اقدامات بھی کیے لیکن سیاسی پارٹیوں کے درمیان اختلافات کی وجہ سے کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اس موقعہ پر انہوں نے مزید جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ برطانوی حکومت کو اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ وزارتی مشن کی تجاویز کی بنا پر کوئی ایسا آئین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے لیے قابل قبول ہو۔

۲۔ برطانوی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ جون ۱۹۴۸ء سے پہلے ہندوستان کے ذمہ دار لوگوں کو اختیارات سونپ دیے جائیں گے۔

۳۔ برطانوی حکومت یا تو سارے اختیارات مرکزی حکومت کے سپرد کر دے گی یا بعض علاقوں میں صوبائی حکومتوں کو بھی اختیارات سونپے جائیں گے یا انتقال اختیارات کے دوسرے طریقے استعمال کیے جائیں گے۔

اس بیان میں یہ بھی اعلان کیا گیا کہ لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا ہے جو مارچ ۱۹۴۷ء تک اپنے عہدے کا چارج سنبھال لیں گے۔

ماؤنٹ بیٹن نے برصغیر میں پہنچتے ہی سیاسی رہنماؤں سے بات چیت شروع کر دی تاکہ دستورسازی اور آزادی کے سلسلے میں مسلم لیگ اور کانگرس میں سمجھوتہ کی راہ نکالی جا سکے، لیکن اس نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ دونوں جماعتوں میں اتحاد ناممکن ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ متحدہ ہندوستان کا برقرار رکھنا ناممکن ہے لہذا اسے جلد از جلد تقسیم کر دینا ہی سودمند ہوگا۔ چنانچہ اس نے برصغیر کی تقسیم کا خاکہ تیار کیا اور اسے لے کر حکومت برطانیہ کی منظوری کے لیے لندن روانہ ہوگیا۔ حکومت کی منظوری کے بعد یہ منصوبہ ۲ جون ۱۹۴۷ء کو سیاسی رہنماؤں کی کانفرنس میں پیش کیا گیا اور ۳ جون ۱۹۴۷ء کو اس کا اعلان کر دیا گیا۔ منصوبے کے نمایاں پہلو درج ذیل ہیں:

۱۔ حکومت برطانیہ اپنی طرف سے کوئی دستور نافذ نہیں کرے گی۔ یہ کام خود عوام کو کرنا ہوگا دستور ساز اسمبلی کا تیار کردہ دستور ملک کے صرف ان حصوں میں نافذ ہوگا جہاں کے عوام اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔

۲۔ پنجاب اور بنگال کی مجالس قانون ساز کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ایک حصہ مسلمان اکثریت والے اضلاع پر مشتمل ہوگا۔ جب کہ دوسرے میں باقی ماندہ اضلاع کے نمائندگان

شامل ہوں گے ۔ دونوں گروپ الگ الگ فیصلہ کریں گے کہ آیا صوبوں کی تقسیم ہونی چاہیے یا نہیں، اگر کسی حصے کی معمولی اکثریت نے تقسیم کے حق میں رائے دی تو اسے تقسیم کر دیا جائے گا ۔

۳- سندھ کی اسمبلی کثرت رائے سے صوبے کے مستقبل کا فیصلہ کرے گی ۔ بلوچستان کو بھی یہی حق دیا جائے گا ۔

۴- شمال مغربی سرحدی صوبہ میں استصواب رائے سے فیصلہ ہوگا کہ وہ کس ریاست سے الحاق کرنا چاہتا ہے ۔ اسی طرح ضلع سلہٹ میں بھی استصواب کرایا جائے گا ۔ صوبہ بلوچستان کا فیصلہ نمائندہ اداروں کے مشترکہ اجلاس میں کیا جائے گا ۔

۵- اگر پنجاب اور بنگال کی اسمبلیوں نے متعلقہ صوبوں کی تقسیم کی حمایت کی تو نئی حد بندیوں کی نشان دہی کے لیے ایک باؤنڈری کمیشن کا قیام عمل میں لایا جائے گا ۔

۶- دیسی ریاستوں کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ حسب منشاء کسی بھی ریاست میں شمولیت اختیار کریں ۔

۷- حکومت برطانیہ جون ۱۹۴۸ء سے پہلے ہی انتقال اقتدار کے لیے تیار ہے ۔ اس غرض سے اسی سال پارلیمنٹ میں مسودہ قانون پیش کیا جائے گا اور ایک یا دو ریاستوں کو درجہ نوآبادیات کی بنیاد پر اقتدار منتقل کر دیا جائے گا ۔

۳ جون کی سکیم بلاشبہ مسلم لیگ کے حق میں تھی ۔ ۱۵ جون کو کانگرس نے بھی اسے بادل نخواستہ قبول کر لیا سلہٹ اور صوبہ سرحد میں رائے شماری کے نتائج حسب توقع پاکستان کے حق میں نکلے۔ سندھ اور بلوچستان نے پاکستان میں شمولیت کے حق میں فیصلہ دیا جب کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فیصلہ ہوا جس کے مطابق مغربی پنجاب اور مشرقی بنگال کے علاقے پاکستان کے حصے میں آئے ۔

پاکستان کا قیام

۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانوی پارلیمنٹ نے "قانون آزادی ہند" منظور کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے برصغیر میں دو آزاد مملکتیں قائم کی جائیں گی، جو ہندوستان اور پاکستان کہلائیں گی ۔ ان دونوں مملکتوں میں تاجدار برطانیہ کی منظوری سے ایک ایک گورنرجنرل مقرر کیا جائے گا، جو اپنی اپنی مملکت کی حکومت کا ذمہ دار ہوگا ۔

قائد اعظم محمد علی جناح پاکستان کے پہلے گورنرجنرل بنے، جب کہ ہندوستان کا گورنرجنرل ماؤنٹ بیٹن ہی رہا ۔ ۲۰ جولائی کو پاکستان کی عبوری حکومت قائم کر دی گئی ۔ ۷ اگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظم کراچی پہنچے، جہاں ان کا فقیدالمثال استقبال کیا گیا ۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن نے دستور ساز اسمبلی کی عمارت میں قائد اعظم کو باقاعدہ پاکستان کے گورنرجنرل کے اختیارات منتقل کیے، اور قائد اعظم

نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اُٹھایا۔

حد بندی میں بے انصافیاں

چونکہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فیصلہ ہوا تھا، وائسرائے نے ۳۰ جون ۱۹۴۷ء کو پنجاب اور بنگال کے دونوں حصوں کی حد بندی کا فیصلہ کرنے کے لیے دو حد بندی کمیشن مقرر کیے ایک پنجاب کے لیے اور دوسرا بنگال کے لیے۔ ہر کمیشن پانچ ارکان پر مشتمل تھا۔ ہر ایک میں دو ارکان پاکستان کی نمائندگی کے لیے اور دو ہندوستان کی نمائندگی کے لیے مقرر ہوئے۔ دونوں کمشنوں کا چیئرمین اب انگریز قانون دان ریڈ کلف تھا۔ مسلمان اور ہندو ارکان کسی حد تقسیم پر متفق نہ ہو سکے، اس لیے فیصلہ ریڈ کلف کو کرنا پڑا اور حد بندی کا یہ فیصلہ ریڈ کلف ایوارڈ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ قیام پاکستان کے دو دن بعد ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کو شائع کیا گیا۔

مسلم لیگ نے پاکستانی پنجاب کے لیے جس سرحد کا مطالبہ کیا تھا وہ دریائے راوی پر مادھو پور ہیڈ ورکس کے قریب سے شروع ہو کر کوہ شوالک کے دامن سے گزرتی ہوئی دریائے ستلج پر روپڑ ہیڈ ورکس تک جاتی تھی۔ وہاں سے دریائے ستلج کے پار لدھیانہ، فیروز پور، فاضلکا ریلوے لائن، نہر سرہند اور نہر بیکانیر کے جنوب مشرق سے ہوتی ہوئی ریاست بہاول پور کی حدود تک چلی جاتی تھی۔ اس سرحد کے اندر غیر مسلم اکثریت کی صرف چار تحصیلیں امرتسر، ترنتارن، پھلور اور نواں شہر آتی تھیں۔ باقی سارا علاقہ مسلم اکثریت کا تھا۔ اس سرحد سے پاکستان کو حسب ذیل فوائد حاصل ہونے کی توقع تھی۔

۱- ریاست جموں و کشمیر کو لازماً پاکستان میں شامل ہونا پڑتا اور کشمیر کا تنازعہ پیدا ہی نہ ہوتا۔

۲- ریاست کپورتھلہ کے یہاں ۵۶ فی صد مسلمان آبادی تھی لیکن راجہ سکھ تھا۔

۳- پاکستان سے متصل مسلم اکثریت کے تمام علاقے پاکستان کا حصہ بن جاتے اور ان علاقوں کے مسلمانوں کو خانماں و برباد ہوکر مہاجرین کی صورت میں پاکستان پر بوجھ نہ بننا پڑتا۔

۴- جالندھر، امرتسر، لدھیانہ، ہوشیار پور اور فیروز پور کے زرخیز اور مردم خیز علاقے پاکستان کے لیے توانائی کا باعث بنتے۔

۵- مواصلات اور آبپاشی کا نظام درہم برہم نہ ہوتا۔

۶- پنجاب کے سارے دریاؤں پر پاکستان کا قبضہ ہو جاتا۔ بھارت ہماری زرعی معیشت کے لیے خطرہ نہ بن سکتا اور ہمیں متبادل نہروں کا انتظام نہ کرنا پڑتا۔ وافر پانی کی بدولت نئی نہریں بنا کر اور بنجر علاقوں کو سیراب کرکے پاکستان کو خوشحال کر سکتے۔

۷- پاکستان دفاعی لحاظ سے بہت مضبوط اور محفوظ ہوتا۔

۸- اس صورت میں شاید بھارتی پنجاب میں ہندو سکھ مسلمانوں کے قتل عام سے احتراز کرتے اور

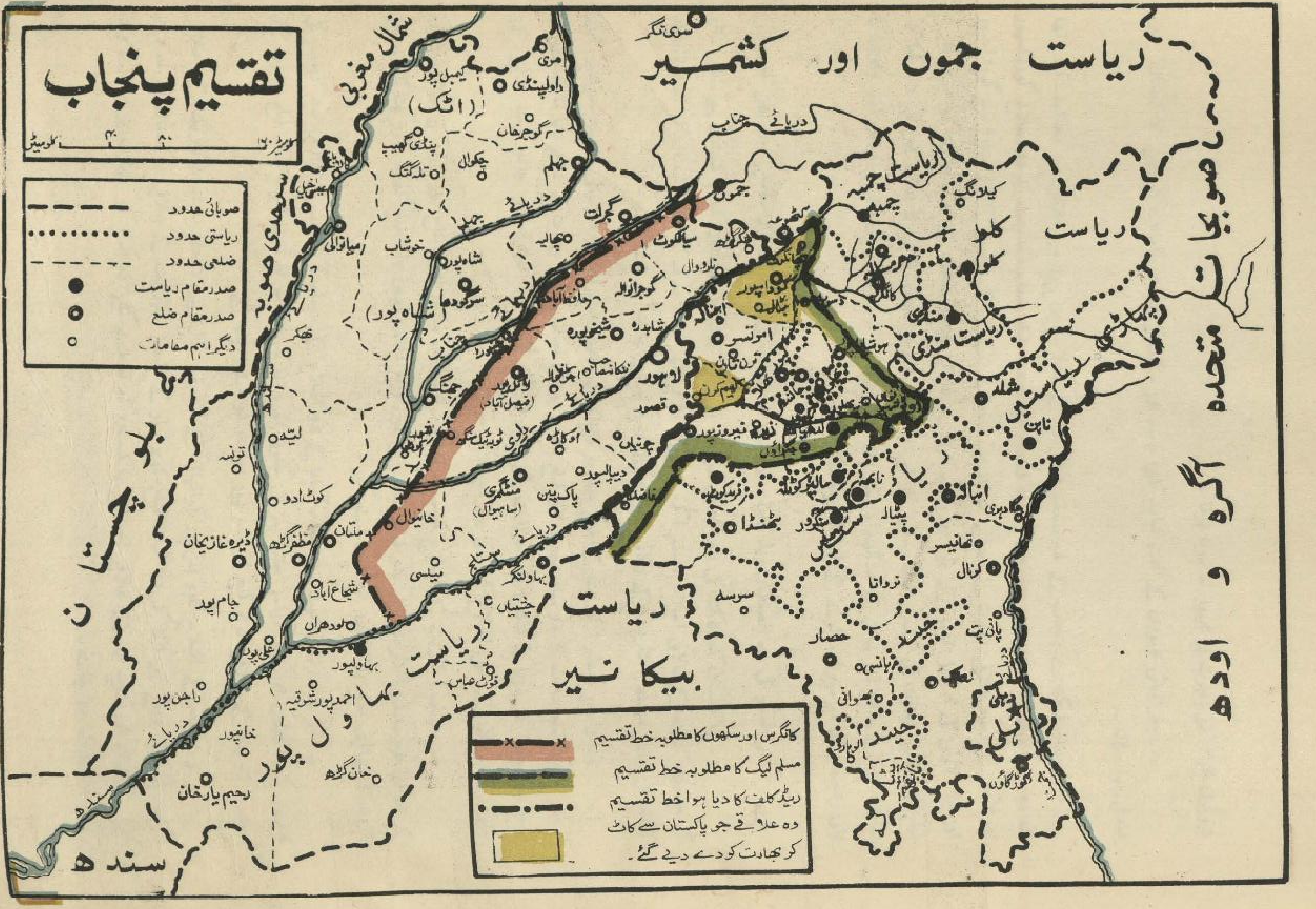

تقسیم پنجاب
کلومیٹر
صوبائی حدود
ریاستی حدود
ضلعی حدود
صدر مقام ریاست
صدر مقام ضلع
دیگر اہم مقامات
ریاست جموں اور کشمیر
سری نگر
شمال مغربی سرحدی صوبہ
بلوچستان
سندھ
ریاست بہاولپور
ریاست بیکانیر
صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ
ریاست
دریائے چناب
دریائے جہلم
راولپنڈی
کیمبل پور
(اٹک)
مری
گوجر خان
پنڈی گھیب
چکوال
تلہ گنگ
جہلم
گجرات
سیالکوٹ
جموں
میانوالی
خوشاب
شاہ پور
سرگودھا
(شاہ پور)
گوجرانوالہ
شیخوپورہ
لاہور
امرتسر
گورداسپور
قصور
جھنگ
لائل پور
(فیصل آباد)
لیہ
منٹگمری
(ساہیوال)
پاک پتن
ملتان
مظفر گڑھ
ڈیرہ غازیخان
خانیوال
میلسی
بہاولنگر
چشتیاں
لودھراں
بہاولپور
احمد پور شرقیہ
خان پور
رحیم یار خان
جام پور
سرسہ
حصار
جیند
کرنال
پانی پت
انبالہ
شملہ
پٹیالہ
بھٹنڈا
فیروز پور
ریاست منڈی
چمبہ
دہلی
کانگرس اور سکھوں کا مطلوبہ خط تقسیم
مسلم لیگ کا مطلوبہ خط تقسیم
ریڈ کلف کا دیا ہوا خط تقسیم
وہ علاقے جو پاکستان سے کاٹ کر بھارت کو دے دیے گئے۔

کروڑوں افراد کو ہجرت پر مجبور نہ ہونا پڑتا ۔

۹- جغرافیائی مجبوری کے تحت شاید کلو، چمبہ اور منڈی کی ہندو ریاستوں کو بھی پاکستان میں شامل ہونا پڑتا ۔

مسلم لیگ نے پنجاب کے غیرمسلم اکثریت کے اضلاع میں سے جن علاقوں کا مطالبہ کیا تھا ان میں سے ایک انچ علاقہ بھی ریڈ کلف نے پاکستان کو نہ دیا بلکہ مسلم اکثریت کے دو اضلاع گورداسپور اور لاہور کے وسیع علاقے بھارت کے حوالے کر دیے ۔ ماسوائے شکرگڑھ کی تحصیل کے باقی سارا ضلع گورداسپور اور ضلع لاہور کی تحصیل قصور کے پٹی اور کھیم کرن کے علاقے خاص مقاصد کے تحت بھارت کو دیے گئے ۔ ضلع گورداسپور بھارت کی کشمیر تک رسائی کے لیے دیا گیا ۔ تحصیل قصور کا پٹی کا علاقہ اس لیے دیا گیا کہ بھارت دریائے ستلج اور بیاس کے سنگھم ہریکے پتن پر بیراج بنا کر تین دریاؤں ستلج، بیاس اور راوی کا پانی راجستھان کو سیراب کرنے کے لیے لے جا سکے ۔

اسی قسم کی بے انصافیاں ریڈ کلف نے مشرق پاکستان کی حد بندی کے سلسلے میں بھی کیں ۔

۱- پاکستان کو کلکتہ کی بندرگاہ کی ضرورت تھی اور کلکتہ کی صنعتوں کو پاکستان سے خام مال کی حاجت، کلکتہ کے بالائی اضلاع مسلم اکثریت کے علاقے تھے ۔ نہ صرف کلکتہ پاکستان کو نہ دیا بلکہ کلکتہ کی خاطر مسلم اکثریت کے بالائی اضلاع کے وسیع حصے بھارت کو دے دیے ۔

۲- واضح مسلم اکثریت کے ضلع جیسور کا پانچواں حصہ، ضلع ندیا کا دو تہائی حصہ، مرشد آباد کا سارا ضلع، ضلع مالدہ کا دو تہائی حصہ اور ضلع دیناج پور کا نصف حصہ بھارت کو دے دیا تاکہ بھارت فرخا بیراج بنا کر دریائے گنگا کا پانی دریائے ہگلی میں ڈال کر کلکتہ کی بندرگاہ کو چالو رکھ سکے اور مشرق پاکستان کے کئی اضلاع کو پانی سے محروم کر سکے ۔

۳- مسلم اکثریت کے اضلاع جیسور، ندیا، مرشد آباد، مالدہ اور دیناج پور کے زرخیز علاقوں کے عوض غیرمسلم اکثریت کے دو ضلعے سندر بن میں واقع دلدلی زمین والا ضلع کھلنا اور چٹاگانگ ہلز کا بے کار پہاڑی ضلع پاکستان کو دے دیے گئے ۔

۴- نہ صرف ضلع سلہٹ سے ملحقہ آسام کے دو اضلاع کے مسلم اکثریت کے علاقے ضلع کچھار کی تحصیل ہیلا کنڈی اور ضلع کھاسی جنتیا ہلز کی جنوبی پٹی، پاکستان کو نہ دیے گئے ۔ بلکہ ضلع سلہٹ کے مسلم اکثریت کے علاقے کریم گنج اور بدر پور بھارت کو دے دیے گئے ۔

۵- آسام کے اضلاع گارو ہلز اور گوالپاڑہ کے مشرق بنگال سے ملحقہ مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان کو دینے سے انکار کر دیا گیا ۔ ضلع کوچ بہار کے مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان کو نہ دیے گئے ۔ گوالپاڑہ اور کوچ بہار کے علاقے اس لیے پاکستان کو نہ دیے گئے کہ آسام کو بھارت سے ملانے والا راستہ مخدوش نہ ہو جائے ۔

ریڈ کلف ایوارڈ کی مندرجہ بالا تفصیلات سے عیاں ہے کہ سرحدوں کے تعین میں انگریزوں نے پاکستان کی بے حد حق تلفی کی - مسلم اکثریت کے وسیع زرخیز علاقے بھارت کو دے دیے گئے۔ پاکستان کو کم سے کم علاقہ دے کر اس کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی - ۲۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظم نے اس ایوارڈ کے بارے میں فرمایا:

"اس عظیم آزاد خود مختار اسلامی مملکت کے قیام میں بڑی بے انصافیاں کی گئی ہیں - آخری ضرب جو انھوں نے لگائی وہ باؤنڈری کمشن ایوارڈ ہے - یہ ایوارڈ غیرمنصفانہ، ناقابل فہم اور گمراہ کن ہے"۔

باؤنڈری کمشن ایک ڈھکوسلہ تھا اور اس کا ایوارڈ ایک بہت بڑا فراڈ، ایوارڈ میں انصاف کا دعویٰ انگریزوں کا ایک بہت بڑا جھوٹ ہے - دراصل ہوا یوں کہ ہندوستان برطانیہ کا مقبوضہ ملک تھا - شاہ برطانیہ کے نمائندے وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جس کو جو چاہا دے دیا -

تقسیم ہند کے سلسلے میں انگریزوں کے غیرمنصفانہ طرز عمل کی حسب ذیل وجوہات تھیں -

۱- انگریز مطالبہ پاکستان کے مخالف تھے - وہ ہندوستان کو متحد رکھنا چاہتے تھے - وہ اپنے اس مؤقف کی حمایت میں بہت سے دلائل دیتے تھے - لیکن اصل وجہ مسلمان دشمنی تھی - وہ مسلمانوں کو ہندو اکثریت کی گرفت میں دے کر ان کو لاچار و بے اختیار بنانا چاہتے تھے تاکہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا خدشہ نہ رہے - انگریز بہ امر مجبوری اور بادل نخواستہ پاکستان بنانے پر رضامند ہوئے تھے - چنانچہ قصداً اس امر کا اہتمام کیا کہ کم سے کم علاقہ پاکستان کو دیا جائے -

۲- لارڈ ماؤنٹ بیٹن قائداعظم کو تقسیم ہند کے مطالبہ سے ہٹانے میں ناکام رہا تھا - اپنی اس ناکامی پر ناخوش تھا اور اس ناکامی کا بدلہ لینا چاہتا تھا -

۳- ماؤنٹ بیٹن کو کانگرس نے آزاد بھارت کا پہلا گورنرجنرل ہونے کا اعزاز بخشا تھا - لہذا نہ صرف وہ ہندوؤں کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ وہ اس احسان کا کچھ صلہ دے کر ہندوؤں کو خوش کرنا چاہتا تھا -

۴- ماؤنٹ بیٹن پاکستان کا بھی گورنرجنرل بننا چاہتا تھا لیکن مسلم لیگ نے مصلحتاً ماؤنٹ بیٹن کی اس آرزو کا احترام کرنے سے انکار کر دیا تھا - اس انکار کی وجہ سے وہ بہت برہم ہوا اور حتی المقدور اس نے مسلم لیگ اور پاکستان کے مفادات کو نقصان پہنچایا -

۵- کانگرسی لیڈر ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے - لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ان کو راضی کر لیا تھا - غالباً خفیہ وعدہ دے کر کہ ان کی منشا کے مطابق بعض اہم علاقے بھارت کو دے دیے جائیں گے -

۶- یہ بھی گمان کیا جاتا ہے کہ ہندوؤں نے اپنی دولت کا سہارا لیا ہوگا - اور انگریزوں کو رشوت

دے کر زیادہ سے زیادہ علاقہ بھارت میں شامل کروانے کی کوشش کی ہوئی۔

۷- کانگرس اور سکھوں نے "پنجاب سکھوں کا وطن" اور "سکھوں کے مقدس گوردواروں والے مقامات کی بھارت میں شمولیت" کی دلیلوں کا سہارا لے کر دریائے چناب کے کنارے کو سرحد قرار دینے کا مطالبہ کر رکھا تھا۔ سکھوں سے انگریزوں کو بھی ہمدردی تھی۔ کئی جنگوں میں سکھ برطانوی تاج کی وفادارانہ خدمات سرانجام دے چکے تھے۔ برطانیہ سکھوں کو ان خدمات کا کچھ صلہ دے کر ان کی دلجوئی کرنا چاہتا تھا۔

۸- برطانیہ کی زبردست خواہش تھی کہ آزادی کے بعد بھارت برطانوی دولت مشترکہ کا رکن بن جائے۔ اس مقصد کی خاطر بھارت کو خوش رکھنے کے لیے اس کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کی گئی۔

سوالات

۱- "مسلمان ہندوؤں سے الگ ایک قوم تھے"۔ مثالوں سے تشریح کیجیے۔

۲- مسلمانوں کو مسلم لیگ کے قیام کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اور اس کے ابتدائی مقاصد کیا تھے؟

۳- معاہدۂ لکھنؤ کے کیا اسباب تھے اور اس کے اہم نکات کیا تھے؟

۴- قائد اعظم کے چودہ نکات لکھیے۔ ان نکات کو پیش کرنے کے کیا اسباب تھے؟

۵- خطبہ الہ آباد برصغیر کی سیاسی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، وضاحت کیجیے۔ نیز یہ بھی بتائیے کہ اس خطبہ میں زیادہ زور کس بات پر دیا گیا ہے۔

۶- کانگرسی وزارتوں نے اسلامی تشخص کو مٹانے کے لیے کیا حربے استعمال کیے۔ نیز اپنے دور وزارت میں مسلمانوں پر جو ظلم و ستم کیے، اُن پر مختصر نوٹ لکھیے اور یہ بھی بتائیے کہ یہ وزارتیں کیوں مستعفی ہوئیں؟

۷- قرارداد پاکستان کا خلاصہ تحریر کیجیے اور یہ بھی بتائیے کہ یہ قرارداد کہاں اور کس نے پیش کی؟

۸- سر سٹیفورڈ کرپس نے کیا تجاویز پیش کیں؟ مسلم لیگ اور کانگرس نے کن وجوہات کی بنا پر انھیں نامنظور کیا؟

۹- ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو جو کامیابی ہوئی اس کا مختصر حال لکھیے۔

۱۰- وزارتی مشن کی تجاویز کیا تھیں۔ ان تجاویز کا کیا حشر ہوا؟

۱۱- ۳ جون ۱۹۴۷ء کا منصوبہ کیا تھا؟ اس کے اہم نکات تحریر کیجیے۔

۱۲- سرحدوں کے تعین میں انگریزوں نے پاکستان کو نقصان پہنچانے کی کیوں کوشش کی۔ اور اس سلسلے میں ماؤنٹ بیٹن نے کیا کارروائیاں کیں؟

چھٹا باب

پاکستان میں تمدنی زندگی

تمدنی زندگی کی اہمیت

نظام کائنات کا مشاہدہ کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس دنیا کی تمام مخلوق اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کا رجحان رکھتی ہے۔ سمندری مخلوق ہو یا جنگلوں میں رہنے والے جانور یا ہوا میں اڑنے والے پرندے سبھی اپنے فطری تقاضوں کے تحت تنہائی کی بجائے اجتماعی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ حیوانات کی فطرت کا یہ عکس انسانی زندگی میں نمایاں نظر آتا ہے۔ انسان اپنے ہم جنسوں کے ساتھ محض اس لیے مل جل کر نہیں رہتا کہ وہ طبعاً مجبور ہے بلکہ وہ انسانیت کے رتبہ کمال تک پہنچنے کے لیے دوسرے انسانوں کی صحبت و رفاقت کا محتاج بھی ہے۔ انسان کی اس فطری احتیاج کی وجہ سے اسے سماجی مخلوق کہا جاتا ہے۔

اس دنیا میں انسان کی ضروریات اور احتیاجات لاتعداد ہیں۔ یک خواہش کی تکمیل کئی دوسری خواہشات کو جنم دیتی ہے۔ پیدائش سے لے کر وفات تک خواہشات کا یہ سلسلہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا رہتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے وہ خوراک کا محتاج ہے، اسے تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا اور رہنے کے لیے مکان کی ضرورت ہے۔ بیمار پڑ جانے کی صورت میں علاج معالجے کا محتاج ہے۔ مزید برآں انسان صرف گوشت پوست کا خول ہی نہیں، وہ لطیف و نازک جذبات و احساسات کا مالک ہوتی ہے۔ جن کی تسکین کے لیے وہ اتنا ہی بے قرار رہتا ہے جتنا جسمانی احتیاجات کی تکمیل کے لیے۔ انسان اپنی جسمانی اور روحانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہمہ تن اور ہمہ وقت جد و جہد میں مصروف رہتا ہے۔ جسمانی ضروریات کی تکمیل کے لیے اسے معاشی و سیاسی اداروں اور تنظیموں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے، جب کہ روح اور احساسات کی تسکین کے لیے مذہب کی طرف رجوع کرتا ہے۔

انسان فطرتاً مدنیت پسند ہے۔ وہ اپنی زندگی کے اوقات اپنے ہم جنسوں کی صحبت میں رہ کر بسر کرتا ہے۔ انسانوں کے یوں باہم مل جل کر رہنے سے جو اجتماع یا گروہ وجود میں آتا ہے۔ اسے سوسائٹی معاشرہ یا سماج کا نام دیا جاتا ہے۔ انسان اپنی ضروریات زندگی کی تسکین اور جوہر انسانیت کی ترقی و تکمیل کے لیے معاشرے کے اندر رہنے پر مجبور ہے۔ معاشرہ مختلف اجزا کا مرکب ہے اس کے اجزا 'ترکیبی ادارے' کہلاتے ہیں۔ جن میں خاندان، سیاسی اور معاشی تنظیمیں، رفاہی ادارے اور ریاست کے مختلف اجزائے ترکیبی شامل ہیں۔

انسان کی روز مرہ زندگی پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے ہی زندگی کے مختلف مراحل میں وہ سماجی اداروں کی سرگرمیوں میں حصہ لیتا رہا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی لمحہ ان سماجی اداروں کے دائرہ سے باہر نہیں گزرتا۔ اگرچہ یہ ادارے انسانوں کی مختلف ضروریات پوری کرنے کے لیے وجود میں لائے گئے ہیں۔ تاہم اس مقصد کے حصول کے لیے چند اصول و ضوابط بھی تشکیل دیے گئے ہیں جنہیں ملحوظ رکھ کر ہی ایک فرد ان اداروں سے استفادہ کر سکتا ہے۔ یہ ادارے انسان کے اخلاق و کردار اور شخصیت کی تکمیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

رائے عامہ اور جمہوریت

آج کل رائے عامہ کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔ دراصل رائے عامہ ہی موجودہ جمہوری نظام کی کامیابی کا بنیادی ستون ہے۔ ملکی اور قومی معاملات کے متعلق تمام فیصلے رائے عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے سر انجام دیے جاتے ہیں۔ رائے عامہ شہریوں کے اجتماعی ضمیر کی عکاسی کرتی ہے۔ مضبوط اور مؤثر رائے عامہ ہی شہریوں کے حقوق و مفادات کی محافظ ہوتی ہے۔ رائے عامہ سے مراد کسی ریاست کی معتدبہ آبادی کی ایسی رائے ہے جو تمام باشندوں کی فلاح و بہبود کی ضامن ہو۔ اس کا مطلب عوام کی متفقہ یا اکثریت کی رائے یا کسی خاص فرقہ اور طبقہ کی رائے نہیں بلکہ وہ رائے ہے جس میں عوام الناس کی بہتری اور بھلائی مضمر ہو۔

جمہوری نظام میں رائے عامہ اور حکومت کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ مقننہ کے ارکان عوام کے نمائندے ہوتے ہیں اس لیے وہ قانون سازی میں رائے عامہ اور قومی جذبات و احساسات کا لحاظ رکھتے ہیں۔ رائے عامہ کی تائید و حمایت کے بغیر کوئی مستقل اور پائیدار حکومت قائم نہیں کی جا سکتی۔

جمہوریت

جمہوریت اس دور کی مقبول ترین طرز حکومت ہے۔ جمہوریت کا انگریزی مترادف ڈیموکریسی (Democracy) ہے۔ جو یونانی زبان کے الفاظ (Demos) اور (Krats) سے بنا ہے۔ جن کے معنی بالترتیب عوام اور اقتدار کے ہیں۔ چنانچہ جمہوریت وہ طرز حکومت ہے جس میں ملکی نظام حکومت عوام کی مرضی اور منشا کے مطابق سر انجام پاتا ہے۔ ایک مثالی جمہوری حکومت میں تمام ذی عقل بالغوں کو حکومت کے کاروبار میں حصہ لینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ عوام حکومت کے اعمال پر آزادانہ تنقید کر سکتے ہیں اور اگر عوام حکومت کے کام سے مطمئن نہ ہوں تو وہ اسے آئینی طریقوں سے بدل سکتے ہیں۔ جمہوری حکومت میں اگرچہ فیصلے کثرت رائے سے کیے جاتے ہیں مگر اقلیت کی رائے کا بھی احترام کیا جاتا ہے۔ گویا جمہوری طرز حکومت میں حکومت کی مشینری عوام کی مرضی کے گرد گھومتی ہے۔

جمہوریت کی دو اقسام درج ذیل ہیں:

۱۔ اصالتی جمہوریت

ایسی حکومت ہے جس میں ملک کے عام شہری براہ راست قانون سازی اور انتظامی معاملات میں

حصہ لیتے ہیں - اس قسم کی جمہوریت قدیم یونان کی شہری ریاستوں میں رائج تھی - ریاست کے تمام شہری ایک جگہ اکٹھے ہو کر ملکی معاملات کے فیصلے باہمی صلاح و مشورے سے کرتے تھے - موجودہ دور کی وسیع و عریض ریاستوں میں بلاواسطہ جمہوریت کا نظام ممکن العمل نہیں -

۲- نیابتی جمہوریت

ایسی جمہوریت میں کسی ریاست کے تمام شہری نظام حکومت میں براہ راست حصہ نہیں لیتے بلکہ انتخابات کے ذریعے وہ اپنے نمائندے چنتے ہیں - عوام کے یہ نمائندے ریاست کے لیے قوانین بناتے ہیں اور ریاست کا نظم و نسق چلاتے ہیں - آج کل جمہوریت کی اصطلاح ہمیشہ بالواسطہ جمہوریت کے ہم معنی سمجھی جاتی ہے اور جب کبھی جمہوری طرز حکومت کا ذکر آتا ہے تو اس سے خود بخود بالواسطہ جمہوریت مراد لی جاتی ہے -

رفاہی یا فلاحی ریاست ایسی ریاست کو کہتے ہیں جو اپنے شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کے ساتھ ساتھ انھیں معاشی تنگدستی، افلاس اور غربت سے نجات دلا کر زندگی کی راحتوں سے ہم کنار کرے - اس لحاظ سے جہاں ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ ملک کو بیرونی حملوں اور اندرونی شورشوں سے محفوظ رکھنے کے لیے فوج، پولیس اور مضبوط نظام عدلیہ کا قیام عمل میں لائے، وہاں یہ بھی لازم ہے کہ وہ افراد کی تعلیم و تربیت، صحت، رہائش، لباس، غذا اور تفریح جیسی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام بھی کرے، تاکہ افراد قوم مادی خوشحالی کے لوازمات سے بہرہ مند ہوکر خوش گوار زندگی بسر کر سکیں -

موجودہ زمانے کی فلاحی ریاستیں اپنے افراد کی خوشحالی کے لیے ایک طرف صنعت و حرفت اور تجارت و زراعت کے فروغ، ذرائع آمد و رفت اور ذرائع خبررسانی کی ترقی، پانی، بجلی اور دیگر معاشرتی خدمات کی فراہمی، باغات اور پارکوں کی تعمیر، عجائب گھروں، چڑیا گھروں، کتب خانوں، دارالمطالعوں، سکولوں اور کالجوں کے قیام، صحت و صفائی کے منصوبوں کی تکمیل اور ہسپتالوں کی تعمیر میں سرگرم عمل ہوتی ہیں تو دوسری طرف معاشرتی تحفظ کے مختلف منصوبوں، جیسے بڑھاپے کی پنشن، بیماری و بیکاری کے ایام کا الاؤنس، مختلف حادثات کی صورت میں مالی امداد کی شکل میں تلافی کی پالیسیوں پر بھی عمل پیرا ہوتی ہیں -

اسلام نے فلاحی ریاست کا تصور آج سے چودہ سو سال پیشتر پیش کیا تھا اور ایک مثالی ریاست عملی طور پر قائم کرکے دکھا دی تھی - 'خلافت راشدہ' فلاحی ریاست کی بہترین مثال ہے جو "سید القوم خادمھم" کے سنہری اصول پر قائم تھی - اس نے ریاست کو عوام کی خدمت کا ادارہ بنا دیا اور حکمرانوں کو والی اور خادم کی حیثیت سے پیش کیا، اور عملاً ایسے اقدامات کیے کہ معاشرے کا کوئی فرد خواہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا تھا، بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہا -

فلاحی ریاست کے مقاصد

۱۔ حقوق کی نگہداشت :

فلاحی ریاست کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ معاشرے کے کمزور افراد کی خبرگیری کرے اور ان کے حقوق کی نگہداشت کرے ، تاکہ وہ معاشرے میں باعزت اور باوقار زندگی بسر کر سکیں۔ فلاحی ریاست کا یہ بنیادی فرض ہے کہ وہ شہریوں کو معاشی تنگدستی، بھوک اور افلاس کے خوف سے نجات دلائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسے مواقع پیدا کرے کہ کام کرنے کے اہل افراد کو ان کے شایان شان روزگار میسر آ سکے۔ مزدوروں اور بیکسوں کو زندگی کے ہر مرحلے میں بنیادی ضروریات زندگی سے بہرہ مند کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔

۲۔ منصفانہ تقسیم دولت :

سرمایہ دارانہ نظام میں دولت چند ہاتھوں میں مرکوز ہو جاتی ہے اور عوام کی اکثریت وسائل زندگی کے معاملہ میں قلت و محرومی کا شکار ہو جاتی ہے۔ فلاحی ریاست معاشرے میں دولت کی منصفانہ تقسیم کو بروئے کار لانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس مقصد کے لیے معاشی اجارہ داریوں کو ختم کرنے کے لیے اہم اقدامات کرتی ہے۔ ملازمین اور محنت کشوں کے حقوق کی مؤثر طریقے پر نگہداشت کرتی ہے۔ اور ان کے لیے کم ازکم اجرتوں کا تعین کرتی ہے۔

۳۔ محدود وسائل سے استفادہ :

آزاد جمہوری فلاحی ریاستوں میں مخلوط معیشت کا رواج ہے جس میں محدود وسائل سے زیادہ استفادہ کرنے کے لیے منصوبہ بندی کا طریق کار اختیار کیا جاتا ہے اور اس طرح قومی زندگی کے مختلف شعبوں کی ترقی اور سماج کے مختلف طبقات کی خوشحالی کے لیے منظم کوشش کی جاتی ہے۔ فلاحی ریاست کی ذمہ داریوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ریاست ایسی معاشی تنظیم قائم کرے۔ جس سے قومی ذرائع اور وسائل سے کماحقہ استفادہ کیا جا سکے۔ یہ کام مناسب سماجی اور اقتصادی منصوبہ بندی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب فلاحی ریاستوں نے منصوبہ بندی کو اپنی پالیسی کا جزو بنا لیا ہے۔

دنیا میں اسلام کے نظام معیشت کے علاوہ اور کوئی ایسا نظام نہیں جو ان سب شرائط کو پورا کرتا ہو اور صحیح رفاہی ریاست وجود میں لانے کے قابل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جس قسم کی رفاہی ریاست اسلام نے صدیوں پیشتر قائم کرکے دکھا دی تھی یورپ اپنی عظیم‌الشان مادی ترقیوں کے باوجود ایسی مثال پیش کرنے سے آج بھی قاصر ہے۔

شہری کے حقوق و فرائض

ریاست جہاں شہریوں کو کچھ حقوق عطا کرتی ہے وہاں معاشرے کی بہتری کے لیے ان پر کچھ

فرائض بھی عاید کرتی ہے - کوئی شخص یہ توقع نہیں کر سکتا کہ حقوق تو حاصل ہوں مگر اس کے مقابلے میں اسے کوئی فرض ادا نہ کرنا پڑے - ایک فرد کا حق اس پر دوہرا فرض عاید کرتا ہے - پہلا فرض تو یہ ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کا احترام کرے اور انہیں ان سے فائدہ حاصل کرنے کا موقعہ دے - دوسرا یہ کہ وہ اس بات کا خیال رکھے کہ یہ حقوق اسے اس لیے حاصل ہیں کہ وہ ایک شہری کی حیثیت سے اپنے فرائض کو بہتر طریقے سے سرانجام دے - انسانی زندگی کے حقوق و فرائض کو بے حد اہمیت حاصل ہے لہذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حقوق و فرائض کے مفہوم اور اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

شہری کے حقوق

جدید ریاستوں میں ہر شہری کو کئی معاشرتی حقوق حاصل ہوتے ہیں - جن میں سے چند اہم بنیادی حقوق درج ذیل ہیں :

۱- حق زندگی :

ہر شہری کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے اور کوئی فرد یا ادارہ اسے اس سے محروم کرنے کا مجاز نہیں - شہری کی زندگی کی حفاظت کا ذمہ ریاست پر ہے - حق زندگی میں عزت و آبرو کے تحفظ کا حق بھی شامل ہے - جو لوگ دوسروں کے حق میں مداخلت کرتے ہیں، ریاست کی طرف سے انہیں سزا دی جاتی ہے - قتل، بغاوت یا اسی قسم کے دوسرے سنگین جرائم کی بناء پر البتہ ریاست شہری کو اس حق زندگی سے محروم کر سکتی ہے -

۲- حق جائیداد :

ہر شخص کو ذاتی جائیداد بنانے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کا حق حاصل ہے - ہر شہری جائیداد خریدنے، بیچنے اور اسے کسی کے حوالے کرنے کا مجاز ہے، بشرطیکہ یہ جائیداد قانونی طریقے سے حاصل کی گئی ہو غیرقانونی طریقے سے حاصل کی ہوئی جائیداد ضبط کرنے کا حق ریاست کو حاصل ہے - ریاست کا فرض ہے کہ جائز طریقے سے حاصل کی ہوئی ذاتی املاک کے تحفظ کا انتظام کرے -

۳- حق آزادی :

موجودہ جمہوری ریاستیں افراد کی آزادی کو خاص اہمیت دیتی ہیں - کسی قانونی جواز کے بغیر کسی شخص کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا - کسی کے مکان میں کوئی شخص اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کسی کی نقل و حرکت پر غیرقانونی پابندی لگائی جا سکتی ہے -

۴- مذہبی آزادی :

ہر شخص کو مذہبی معاملات میں آزادی حاصل ہوتی ہے - وہ اپنی مرضی سے کوئی مذہبی عقیدہ اختیار کر سکتا ہے اور اپنے عقیدے کے مطابق عبادت اور رسم و رواج بجا لا سکتا ہے - اگر کسی مذہبی فرقے یا رہنما کی سرگرمیاں ریاست کے استحکام یا امن عامہ کے لیے خطرناک ہوں تو ریاست ان پر پابندی عاید

کر سکو ہے۔

۵۔ آزادی تقریر و تحریر :

جمہوریت کے فروغ کا دار و مدار آزادی تحریر و تقریر پر ہے ، اس لیے ریاست اپنے ہر شہری کو رائے کے اظہار کی پوری آزادی دیتی ہے ۔ اس سلسلے میں اسے اجتماعات منعقد کرنے ، ان سے خطاب کرنے اور نشر و اشاعت کے تمام ذرائع استعمال کرنے کی آزادی ہوتی ہے، بشرطیکہ یہ امن عامہ کی بھلائی کے لیے ہو۔

۶۔ حق معاہدہ :

ہر شہری اپنے مفاد کی خاطر کسی دوسرے شہری سے معاہدہ کرنے کا حق رکھتا ہے ۔ ریاست ایسے تمام معاہدوں کو جو ملکی قانون کی حدود میں رہ کر کیے گئے ہوں تسلیم کرتی ہے اور انھیں تحفظ دیتی ہے ۔ اگر کوئی فریق معاہدے کی دفعات کی خلاف ورزی کرے تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جا سکتی ہے ۔

۷۔ حق انجمن سازی :

شہریوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مشترکہ مفاد کے حصول کے لیے انجمنیں بنائیں اور ان میں سرگرمی سے حصہ لیں تاکہ وہ اپنی بات مؤثر انداز میں کہہ سکیں اور اپنے مطالبات منظم اور متحدہ کوشش سے منوا سکیں ۔ لیکن ملکی امن کو تباہ کرنے یا مفاد عامہ کو نقصان پہنچانے والی انجمنوں کی تشکیل کی اجازت نہیں دی جا سکتی ۔

۸۔ حق خاندان :

ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق شادی کرے اور ایک خاندان کی بنیاد رکھے ۔ وہ اپنے خاندانی معاملات میں خود مختار ہے ۔ کسی کو اس کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا حق حاصل نہیں ۔ خاندان سے حاصل ہونے والے فوائد یعنی حق اولاد اور حق وراثت وغیرہ سے اسے محروم نہیں کیا جا سکتا ۔

۹۔ حق معاش :

ہر شخص کو باعزت زندگی گزارنے کے لیے کوئی نہ کوئی ذریعہ معاش اختیار کرنا پڑتا ہے ۔ ریاست کا فرض ہے کہ ہر شہری کو اس کی قابلیت اور استعداد کے مطابق روزگار مہیا کرے ۔ اس میں یہ حق بھی شامل ہے کہ کام کرنے والے کو ان کی محنت کا مناسب معاوضہ دیا جائے اور اس کے اوقات کار کا تعین کیا جائے ۔

۱۰۔ حق تعلیم :

ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے ۔ شہریوں کو تعلیم دینے کے لیے ہر ریاست مناسب سہولتیں مہیا کرنے کی پابند ہے ۔

۱۱- حق مساوات :

تمام شہری قانون کی نظر میں مساوی اور برابر ہیں۔ لہذا انھیں سماجی اور معاشرتی لحاظ سے مساوی حیثیت ملنی چاہیے۔ مذہب، خاندان، رنگ، نسل یا پیشے کو اس کی مساواتی حیثیت پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔

۱۲- حق رائے دہی :

جمہوری نظام میں حکومت کا کاروبار عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے سرانجام پاتا ہے۔ ان کے نمائندوں کا انتخاب ووٹوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس لیے ووٹ دینا شہری کا ایک اہم حق سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں بالغوں کا حق رائے دہی تقریباً تمام جمہوری ریاست نے تسلیم کر لیا ہے، یعنی ہر بالغ کو بلاامتیاز جنس، حیثیت، رنگ و نسل اور جائداد، ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ لہذا کسی بالغ، عاقل شہری کو اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا، نیز اسے پوری آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جسے چاہے آزادی سے ووٹ دے۔

۱۳- حق نمائندگی :

ایک شہری کو صرف رائے دینے کا ہی حق حاصل نہیں بلکہ اسے قانون ساز ادارے کا رکن بننے کا حق بھی حاصل ہے۔ لہذا وہ ملکی انتخابات میں بحیثیت اُمیدوار حصہ لینے کا مجاز ہے۔

۱۴- سرکاری ملازمت کا حق :

قانون کی نظر میں تمام شہری یکساں ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ تمام شہریوں کے لیے بلاامتیاز سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ کسی شخص کو اس کے اس حق سے مذہب، نسل، خاندان، ذات، جائے پیدائش یا جنس کی وجہ سے محروم نہ کیا جائے، البتہ کسی عہدے کے لیے قابلیت اور اہلیت کا معیار مقرر کیا جا سکتا ہے اور صرف وہی اشخاص اس عہدے کے مستحق سمجھے جا سکتے ہیں جو مطلوبہ معیار پر پورے اترتے ہیں۔

۱۵- حق تنقید :

حکومت پر اصلاحی تنقید جمہوری نظام کی روح ہے، لہذا شہریوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ حکومت کی پالیسی سے اتفاق یا اختلاف کریں اور تقریر و تحریر کے ذریعے اس پر نکتہ چینی کریں، کیونکہ اس کے بغیر حکومت کو اس کی کمزوریوں سے آگاہ نہیں کیا جا سکتا لیکن شرط یہ ہے کہ تنقید مثبت اور اصلاحی ہو تخریبی نہ ہو، کیونکہ تخریبی تنقید ملک میں بے چینی اور انتشار پھیلانے کا سبب بنتی ہے۔

۱۶- حق عذرداری یا داد رسی :

ہر شہری کو حق حاصل ہے کہ اگر اسے کسی فرد یا حکومت کے رکن کے خلاف کوئی شکایت ہو تو وہ اپنی شکایت بلاخوف و خطر اور بلا رکاوٹ مقننہ، عدلیہ یا حکومت کے کسی اور شعبے تک پہنچائے۔

یہ حق اجتماعی اور انفرادی دونوں صورتوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے ۔

شہری کے فرائض

ریاست جہاں شہریوں کو کچھ حقوق عطا کرتی ہے وہاں ان پر کچھ فرائض بھی عاید کرتی ہے ۔ شہریوں کے اہم فرائض مندرجہ ذیل ہیں ۔

۱۔ شعائر اسلام کی پابندی :

ہمارا ملک نظریاتی بنیادوں پر قائم ہوا ۔ بحیثیت مسلمان ہمارا اولین فرض ہے کہ قرآن اور حدیث کے احکامات کی پیروی کریں ۔

۲۔ وطن سے وفاداری :

ہر شہری کا فرض اولین ہے کہ وہ ریاست کا وفادار رہے ۔ اس کی بہتری کے لیے کسی قسم کی خدمت اور قربانی سے دریغ نہ کرے ۔ ریاست کو بیرونی حملوں سے بچانے اور ملکی دفاع کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے ۔ اگر ملک کے اندر بد امنی یا بغاوت کے آثار پیدا ہوں تو ان سے نمٹنے کے لیے حکومت سے پورا پورا تعاون کرے ۔

۳۔ قانون کی اطاعت :

ریاست عوام کی بھلائی اور ملک کا نظم و نسق چلانے کے لیے کچھ قانون بناتی ہے ۔ ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ ان قوانین کی پابندی کرے ۔ قانون شکنی ریاست کے نظم و نسق کو کمزور کر دیتی ہے جس سے ملک بد نظمی اور انتشار کا شکار ہو سکتا ہے ۔

۴۔ محاصل کی ادائیگی :

ملک کا کاروبار چلانے کے لیے حکومت کو روپے، پیسے کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے حصول کے لیے وہ شہریوں پر محصول اور ٹیکس لگاتی ہے ۔ ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ مقررہ ٹیکس اور محصول ایمانداری سے ادا کرے تاکہ حکومت عوام کی بہتری اور بھلائی کے لیے کام کر سکے ۔

۵۔ حکام سے تعاون :

ریاست کو اپنے فرائض ادا کرنے کے لیے عوام کے تعاون کی ضرورت پیش آتی ہے اس لیے شہریوں کا فرض ہے کہ ملک کے نظم و نسق اور معاشرتی بہبود کے لیے حکومت کے کارندوں سے پورا پورا تعاون کریں ۔

۶۔ ووٹ کا درست استعمال :

ووٹ ایک قومی امانت ہے، لہذا ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ اس حق کا استعمال قومی فلاح و بہبود اور دیانتداری کو پیش نظر رکھ کر کرے اور صرف ایسے لوگوں کے حق میں ووٹ ڈالے جو صحیح طور پر اس کے مستحق ہوں اور جو قومی اور ملکی مفاد کی خاطر کام کر سکتے ہوں ۔ اس معاملے میں لالچ، دباؤ خوف، ذات، برادری یا ذاتی تعلقات کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دی جائے ۔ ہر شہری کو چاہیے کہ وہ ایمانداری

اور دیانتداری سے اس حق کو استعمال کرے ۔

۷۔ خدمت خلق :

ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ خدمت اور رفاہ عامہ کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے اور اپنے ہم وطنوں اور دیگر انسانوں کو دکھوں اور پریشانیوں سے نجات دلانے کے لیے اپنی پوری کوشش صرف کر دے ۔ اگر وہ کسی عہدہ پر فائز ہو تو متعلقہ فرائض ایمانداری، محنت، لگن اور دیانتداری سے سر انجام دے ۔

۸۔ محنت و مشقت :

ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ دوسروں پر بوجھ نہ بنے، بلکہ محنت کرکے آمدنی میں اضافہ کرے ۔ صاحب دولت اور مال دار آدمیوں کو چاہیے کہ اپنا وقت فضول اور بیکار بیٹھکر ضائع کرنے کی بجائے کوئی ایسا کام کریں جس سے ملک و ملت کو کوئی فائدہ پہنچے ۔

۹۔ تعلیم کا حصول :

ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ خود تعلیم حاصل کرے اور اپنے عزیز و اقارب کو بھی تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دے ، کیونکہ تعلیم کے بغیر کوئی فرد بھی اچھا شہری نہیں بن سکتا اور نہ ہی با عزت زندگی بسر کر سکتا ہے۔جمہوریت کی کامیابی کے لیے تعلیم کا حصول ایک اہم فریضہ ہے اور اس کا حصول ہر شہری پر لازم ہے ۔

۱۰ ضبط نفس :

شہریوں کا فرض ہے کہ وہ خود غرضی، لالچ، جماعتی سازش اور ایسے کاموں سے احتراز کریں جو اجتماعی مفاد کے خلاف ہوں ۔

فرد اور معاشرہ

انسان کو قدرت نے بے شمار قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے ۔ قدرت نے انسان کی فطرت میں یہ داعیہ رکھ دیا ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرے ۔ قدرت کی ودیعت کردہ صلاحیتیں ایک معاشرے میں ہی رہ کر بروئے کار آ سکتی ہیں ۔ یہ معاشرے کی ہی برکت ہے کہ وہ گوشت پوست کے ایک لوتھڑے کو جیتا جاگتا، ہنستا بولتا فکر و شعور کا مالک بنا دیتا ہے اور اس کی خفتہ صلاحیتوں کو جلا دے کر اسے اشرف المخلوقات کے بلند مرتبے پر فائز کر دیتا ہے۔

معاشرہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی مل جل کر رہنا اور زندگی بسر کرنا ہے اصطلاحی لحاظ سے معاشرہ سے مراد افراد کا ایک ایسا گروہ ہوتا ہے جو ایک مخصوص طرز بود و باش رکھتا ہو۔ معاشرہ چند مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے وجود میں آتا ہے ۔ اس میں وہ تمام انجمنیں اور ادارے شامل ہیں جو زندگی کے مختلف پہلوؤں کی بہتری کے لیے کام کرتے ہیں ۔ معاشرے کی اصلاح اتنی جامع ہے

کہ اس میں افراد کے تمام شعوری اور غیرشعوری افعال، ان کی تمام منظم اور غیر منظم سرگرمیاں، ان کی ساری مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور علمی دلچسپیوں کی بنا پر قائم شدہ تعلقات شامل ہیں ۔ گویا معاشرہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوتا ہے ۔

فرد اور معاشرے کا تعلق

افراد اور معاشرہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں ۔ نہ افراد کے بغیر معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے اور نہ معاشرے کے بغیر فرد کی کوئی حیثیت ہوتی ہے ۔ اسی بنا پر ارسطو نے کہا تھا: "جو شخص معاشرے سے الگ تھلگ رہتا ہے، وہ یا تو دیوتا ہے یا پھر حیوان" ۔ انسان فطری طور پر ایک سماجی وجود ہے ۔ انسان کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے ایک سوسائٹی میں رہنا پڑتا ہے ۔ سوسائٹی بچپن سے لے کر بڑھاپے تک اس کی زندگی پر اثرانداز ہوتی ہے ۔ انسان جنگلوں، غاروں اور پہاڑوں کی تنہائیوں میں اعلیٰ زندگی بسر نہیں کر سکتا ۔ اعلیٰ، مکمل اور اچھی زندگی گزارنے کے لیے وہ سوسائٹی کا محتاج ہے ۔

انسان معاشرے میں رہ کر ہی اخلاق اقدار سیکھتا ہے .اور روحانی ترقی حاصل کرتا ہے ۔وہ معاشرے کے رسم و رواج، عادات، جذبات اور نصب العین سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور ان کے حصول کے لیے اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے ۔ انسان کے دل میں دوسروں کی بھلائی کا جذبہ صرف معاشرے میں ہی پیدا ہوتا ہے ۔ معاشرے ہی کی بدولت انسان مختلف اداروں سے منسلک ہوتا ہے اور ان سے فائدہ حاصل کرتا ہے، جو اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بقا اور ترقی کے لیے اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔

فرد اپنی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے معاشرے کا محتاج ہے ۔ انسان کو زندگی میں لامحدود احتیاجات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ خوراک، لباس، رہائش، علاج اور تعلیم جیسی اہم ضروریات زندگی کو تنہا پورا نہیں کر سکتا، بلکہ ان کے حصول کے لیے وہ دوسرے انسانوں کا دست نگر ہوتا ہے ۔ باہمی تعاون سے ہی ان ضروریات کی تکمیل ممکن ہے ۔

انسان کی موجودہ مادی ترقی، سائنسی آلات و اوزار اور مشینی ایجادات، معاشرتی ضرورتوں کی وجہ سے ظہور میں آئی ہیں ۔ علم و حکمت کے خزانے، فلسفہ و ادب، سیاسی اور معاشی اداروں کا وجود معاشرے کا ہی مرہون منت ہے اور معاشرہ ہی ان کی حفاظت اور منتقلی کا بڑا ذریعہ ہے ۔ لہٰذا فرد اور معاشرہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں ۔ افراد کے بغیر کسی معاشرہ کا تصور ناممکن ہے اور معاشرے کے بغیر کسی فرد کی کوئی حیثیت نہیں ، اس لیے افراد جتنے بہتر ہوں گے، معاشرہ بھی اتنا ہی اچھا ہوگا اور اگر معاشرہ اچھا نہ ہو تو پھر افراد کے رجحانات، اخلاق و کردار اور عادات و اطوار کے بارے میں کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی ۔ معاشرے کی ترقی افراد کی ترقی پر منحصر ہے اور معاشرہ کا مقصد افراد کی بہتری اور فلاح و بہبود کے سوا کچھ نہیں ۔

رفاہی ادارے

انسان اپنی اجتماعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مختلف انجمنوں اور اداروں سے منسلک ہونے پر مجبور ہے۔ انسانی اداروں میں سے کچھ ایسے ہیں جو فطری ادارے ہیں، یعنی جو قدرتی طور پر وجود میں آ جاتے ہیں اور ان کی رکنیت انسان خود بخود اختیار کر لیتا ہے۔ خاندان، برادری، قبیلہ، گاؤں، شہر، ملک اور دنیا ایسے ادارے ہیں جن کی رکنیت تمام افراد کو خود بخود حاصل ہو جاتی ہے۔ دوسری قسم کے ادارے انسان خود اپنی ضروریات کے مطابق تشکیل کرتا رہتا ہے، ان کی رکنیت سبھی افراد کے لیے لازمی نہیں۔ یہ ادارے مقامی، علاقائی، قومی یا بین الاقوامی سطح پر قائم کیے جا سکتے ہیں اور اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف انسانی شعبوں کی مخصوص ضرورتوں کے پیش نظر وجود میں آتے ہیں۔ اس میں مذہبی ادارے، پیشہ ورانہ ادارے، ثقافتی ادارے، تفریحی ادارے، سیاسی ادارے اور رفاہ عامہ کے ادارے شامل ہیں۔

معاشرے میں امیر اور غریب دونوں قسم کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ امراء تو اپنی ضروریات زندگی خود پوری کر لیتے ہیں، لیکن غریب لوگ اپنی بنیادی ضروریات زندگی کے لیے دوسروں کے دست نگر ہوتے ہیں۔ کچھ افراد غریبوں کی امداد کے لیے میدان عمل میں آتے ہیں اور اجتماعی طور پر کچھ رضاکارانہ ادارے قائم کرتے ہیں، جن کا مقصد خدمت خلق اور عوام کی بھلائی ہوتا ہے۔ ایسے اداروں کو رفاہ عامہ کے ادارے کہا جاتا ہے۔ ان رضاکارانہ اداروں کا مقصد غریب، نادار، بے یار و مددگار یتیم افراد اور بیواؤں کی حاجات اور ضروریات زندگی پورا کرنا اور انہیں مناسب امداد بہم پہنچا کر معاشرے کا کارآمد رکن بنانا ہوتا ہے۔ اس قسم کے اداروں میں محتاج خانے، ہسپتال، ہلال احمر، یتیم خانے، تعلیمی ادارے، ادارہ خدمت خلق اور تعلیم بالغاں کی انجمنیں وغیرہ شامل ہیں۔

معاشرے میں رفاہ عامہ کے رضاکارانہ اداروں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہ ادارے غربت و افلاس اور مجبوری کی بنا پر پیدا ہونے والی بہت سی برائیوں کے سدباب کا باعث بنتے ہیں۔

رفاہ عامہ کے ان اداروں کی رکنیت اگرچہ اختیاری ہوتی ہے، لیکن کوئی شہری ان اداروں کی رکنیت سے کلی طور پر بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اگر اسی معاشرے میں کچھ افراد ایسے بھی ہوں جو رضاکارانہ اداروں سے مکمل علیحدگی کی پالیسی پر گامزن ہوں تو ایسے افراد کی بے حسی کو ختم کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

قانون اور آزادی

بعض مفکرین کے خیال میں قانون اور آزادی دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک جگہ اکٹھی نہیں رہ سکتیں، لیکن غور سے دیکھا جائے تو قانون کے بغیر آزادی کا کوئی تصور قائم نہیں ہو سکتا۔ اگر آزادی سے ہر قسم کی پابندیاں ہٹا لی جائیں تو وہ آزادی نہیں افراتفری ہوگی۔ اگر ریاست میں کمزوروں کو

طاقتوروں کے ظلم سے محفوظ رکھنے کے لیے کوئی ادارہ موجود نہ ہو تو لاقانونیت پھیل جائے گی، جس کا سدباب کرنا ریاست کا اولین فرض ہے۔ قانون آزادی کی لازمی شرط اور آزادی کا ضامن ہے۔ ریاست افراد پر پابندیاں عائد کرتی ہے تاکہ تمام افراد یکساں طور پر حقوق اور آزادی سے لطف اندوز ہو سکیں۔ ریاست کا فرض ہے کہ تمام افراد کو اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانے کے مواقع مہیا کرے اس طرح کے حالات و اسباب قانون ہی پیدا کر سکتا ہے، گویا کہ قانون آزادی میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ ملک کے آئینی قوانین ہی افراد کو بنیادی حقوق کی حفاظت کی ضمانت مہیا کرتے ہیں۔ الغرض قانون اور آزادی متضاد حیثیت کے مالک ہرگز نہیں ہیں۔ ذیل میں قانون اور آزادی کے مفہوم و مقاصد الگ الگ درج کیے جاتے ہیں۔

انسان فطرتاً معاشرت پسند ہے۔ وہ اپنے ہم جنسوں سے مل جل کر زندگی گزارتا ہے۔ اس کی ضروریات کی تکمیل اور صلاحیتوں کی نشو و نما معاشرے میں ہی ہو سکتی ہے لیکن اکٹھے رہنے میں ذاتی اغراض کے ٹکراؤ اور تصادم کے امکانات بھی بہت زیادہ ہیں۔ جس سے عہدہ براہ ہونے اور انسانی زندگی کو پرسکون بنانے کے لیے قانون کا نفاذ ناگزیر ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں کمزور کے حقوق محفوظ نہیں رہ سکتے اور ظالم کو اس کے ظلم کا بدلہ نہیں مل سکتا۔ قانون کی عملداری سے لوگوں کو ذاتی تحفظ کا اطمینان نصیب ہوتا ہے اور اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔ ان کی زندگی سے خوف اور بے یقینی ختم ہو جاتی ہے۔ قانون کا نفاذ عوام کو ذمہ دار اور محتاط بنا دیتا ہے، جس سے لوگوں میں ہر کام کرنے سے پہلے سوچنے اور فکر و تدبر کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ قانون عوام کے حدود کار تعین کرکے انہیں ان کے حقوق اور ذمہ داریوں سے آشنا کرتا ہے۔ یہ معاشرے کو انتشار اور پراگندگی سے بچاتا ہے اور یہ افراد میں تنظیم پیدا کرتا ہے، یہی تنظیم بالآخر معاشرے کی ترقی اور خوشحالی کا باعث بنتی ہے۔

قانون سے مراد ایسے اصول اور قواعد ہیں جو ریاست میں رہنے والے افراد کی طرز زندگی کو واضح طور پر متعین کرتے ہیں تاکہ افراد کی معاشرتی زندگی سے الجھاؤ اور تصادم ختم ہو اور ان کی زندگی پرسکون ہو سکے۔ ان اصول و ضوابط کو عرف عام میں قانون کہا جاتا ہے۔ ریاست کے قوانین سب شہریوں پر یکساں طور پر لاگو ہوتے ہیں اور ان کے پیچھے حکومت کی قوت نافذہ موجود ہوتی ہے جو ان کی پابندی کرانے کے لیے بوقت ضرورت سختی اور جبر کرنے کی بھی مجاز ہے۔

جدید جمہوری ریاستوں میں مقننہ حکومت کا ایک ایسا شعبہ ہے جو ہر قسم کی قانون سازی کا مجاز ہوتا ہے۔ ملکی قانون کا ایک بڑا حصہ اسی کی بدولت وجود میں آتا ہے۔ مقننہ یا قانون ساز ادارہ عوام کا منتخب کردہ ہوتا ہے اور عوام کی مرضی کے مطابق قانون سازی کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔

اسلامی تصور حاکمیت میں مقتدر اعلیٰ صرف اللہ کی ذات ہے، اس لیے اسی کی ذات ہی قانون کا

سرچشمہ بھی ہے ۔ اسلامی نقطہ نگہ سے انسان کے لیے پوری شریعت خداوندی قانون کا درجہ رکھتی ہے ۔ قرآن پاک میں اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں کی تعمیر و تشکیل کے لیے بنیادی اور اساسی قوانین مقرر کیے گئے جو ہر زمانہ اور ہر قسم کے حالات میں قطعی اور ناقابل تغیر و تبدل ہیں ۔ البتہ تفصیلی اور جزوی معاملات میں خصوصی حالات کے تحت قرآن و سنت کی روشنی میں قانون سازی کی اجازت دی گئی ہے ۔ اسلامی نقطہ نگہ سے قرآن حکیم اور سنت رسول اسلامی قانون کے بنیادی مآخذ ہیں، کیونکہ انہی پر اسلامی شریعت کا دار و مدار ہے اور یہی اسلامی نظریہ زندگی کا منبع اور سرچشمہ ہیں ۔ قانون کی نگاہ میں سب شہری برابر ہیں، خواہ وہ افسران حکومت ہوں یا عام لوگ، غریب ہوں یا امیر ۔ قانون ان میں کوئی فرق روا نہیں رکھتا ۔ کسی ریاست کا بڑے سے بڑا عہدہ دار بھی اگر جرم کا ارتکاب کرے گا تو اس پر بھی قانون کا اطلاق ویسے ہی ہوگا جس طرح ایک عام شہری پر ۔

آزادی

فرد اور ریاست کا آپس میں تعلق معلوم کرتے وقت یہ مسئلہ در پیش ہوتا ہے کہ ریاست کے اقتدار اعلیٰ کی موجودگی میں فرد کی کیا حیثیت ہے ۔ اگر ریاست اپنی حاکمیت کو اندھا دھند استعمال کرتی ہے تو فرد کی آزادی خطرے میں پڑ جاتی ہے اور اگر فرد کو لامحدود آزادی عطا کر دی جاتی ہے تو پھر ریاست کے اقتدار اعلیٰ کی کوئی وقعت باقی نہیں رہ جاتی ۔ یہ پیچیدگیاں اسی صورت میں دور ہو سکتی ہیں کہ آزادی کا صحیح مفہوم متعین کر لیا جائے ۔

عام اصطلاح میں آزادی کے یہ معنی ہیں کہ ایک انسان ہر قسم کی پابندیوں سے بے نیاز ہو کر اپنی مرضی کے مطابق عمل کرے ۔ گویا عمل کی راہ میں کسی رکاوٹ کا نہ ہونا آزادی ہے ۔

آزادی برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ریاست کا قانون حقوق کی ضمانت دے ۔ یہ حقوق فرد کی معاشی، معاشرتی اور شہری زندگی سے متعلق ہوتے ہیں ۔ جب کسی ریاست کے شہریوں کو یہ حقوق حاصل ہوتے ہیں تو انہیں خود بخود شہری آزادیاں میسر آ جاتی ہیں ۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ آزادی جائز پابندیوں کے بغیر برقرار نہیں رہ سکتی، اس لیے ریاست کو ایسی پابندیاں ضرور عاید کرنی چاہییں ۔

حقیقی آزادی یہ ہے کہ افراد کے لیے حالات اور مواقع پیدا کیے جائیں تاکہ وہ اچھے طریقے سے اپنے حقوق حاصل کر سکیں اور اپنی فطری صلاحیتوں کو جلا دے کر اپنی شخصیت کی تعمیر کر سکیں ۔ جس قدر حقوق و مراعات زیادہ ہوں گی، اسی قدر آزادی کا دائرہ وسیع تر ہوگا ۔ اور افراد کی ذہانت اور قابلیت ترقی پذیر ہوگی اور معاشرہ بھی بحیثیت مجموعی ترقی کی منازل طے کرے گا ۔

آزادی کی اقسام

آزادی کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں ۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں :

۱۔ فطری آزادی :

فطری آزادی سے مراد ایسی مکمل آزادی ہے، جو ہر قسم کی خارجی پابندیوں سے آزاد ہو، اور

انسان کو اپنی من مانی کرنے کا حق حاصل ہو۔ اس قسم کی آزادی انسان کو ابتدائی زندگی میں حاصل تھی لیکن معاشرتی زندگی کے آغاز سے اس کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ موجودہ زمانے میں اس آزادی کا تصور بے معنی ہے، کیونکہ معاشرتی اصلاح و بہبود کے لیے اس پر چند پابندیوں کا عائد ہونا لازمی ہے۔

۲- شہری آزادی

معاشرے کا رکن ہونے کی حیثیت سے جو آزادی ایک فرد کو حاصل ہوتی ہے، اُسے معاشرتی یا شہری آزادی کہتے ہیں۔ اس آزادی کا مقصد فرد کو معاشرتی حقوق کے حصول کے مواقع فراہم کرنا ہے۔ معاشرتی حقوق کا تحفظ ریاست کا قانون کرتا ہے اور وہ اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ افراد جان و مال، تعلیم، نقل و حرکت، عقیدہ و خیال اور تحریر و تقریر کے حقوق سے پوری طرح مستفید ہو سکیں اور ان حقوق میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہونے پائے۔

۳- سیاسی آزادی

سیاسی آزادی سے مراد ہے عوام کا امور حکومت میں مکمل اختیار، یعنی عوام کو انتخابات کے ذریعے اپنے نمائندے چننے، حکومت پر تنقید کرنے، تحریر و تقریر کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرنے اور کاروبار حکومت میں شریک ہونے کا مکمل حق حاصل ہو۔

۴- معاشی آزادی

معاشی آزادی کا مطلب عوام کو معاشی جد و جہد کے مواقع فراہم کرنا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ حکومت کی طرف سے شہریوں کو معاشی تگ و دو کے مساوی مواقع فراہم کیے جائیں۔ انھیں بنیادی ضروریات زندگی کی ضمانت دی جائے اور روزگار کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ مزدوروں کے لیے مناسب اوقات کار اور موزوں اُجرت کا انتظام کیا جائے۔ بڑھاپے میں پنشن، بے روزگاری سے تحفظ اور معذور ہو جانے کی صورت میں امداد پانے کے قواعد موجود ہوں۔ ان کے لیے ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ وہ فکر و فاقہ اور بے روزگاری کے خوف سے بے نیاز ہو جائیں۔

۵- قومی آزادی

ملک کے داخلی اور خارجی معاملات میں مکمل آزادی، قومی آزادی کہلاتی ہے۔ فی الحقیقت قومی آزادی ہی شہری، سیاسی اور معاشی آزادی کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ جو قوم کسی غیر قوم کی غلام اور دست نگر ہو، وہ سیاسی، شہری اور معاشی آزادی سے بہرہ ور نہیں ہو سکتی۔ لہذا شہری، سیاسی اور معاشی آزادی کے حصول کے لیے پہلا قدم قومی آزادی کا حصول ہے۔

مقامی حکومت

مقامی حکومت اس حکومت کو کہتے ہیں جو کسی گاؤں، قصبے یا شہر کے معاملات کی دیکھ بھال اور اس کے مسائل کو حل کرنے کے لیے قائم کی گئی ہو۔ صوبائی حکومت ان مقامی اداروں کو

کچھ اختیارات سونپ دیتی ہے جن کی بدولت وہ مقامی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جمہوری نظام میں مقامی حکومت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ مقامی حکومت کے ادارے عوام کی سیاسی تربیت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان اداروں کی وساطت سے مقامی معاملات کو حالات کے مطابق طے کیا جاتا ہے۔ ان کی بدولت لوگوں میں سیاسی شعور پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے مسائل میں دلچسپی لینا شروع کر دیتے ہیں۔

پاکستان کے چاروں صوبوں میں جولائی۔ اگست ۱۹۷۹ء میں مقامی حکومت کا تین سطحی نظام نافذ کیا گیا ہے۔ بمطابق حکم مجریہ ۳۱ جولائی ۱۹۷۹ء پنجاب میں دیہاتی علاقوں کے لیے یونین کونسل، تحصیل کونسل اور ضلع کونسل قائم کی گئی ہیں، جب کہ شہری علاقوں کے لیے ٹاؤن کمیٹی، میونسپل کمیٹی اور میونسپل کارپوریشن۔

ان انتخابات میں ۲۱ سال یا اس سے زائد عمر کے شہری ووٹ دے سکتے ہیں۔ ہر ادارے کے لیے مسلم اور غیرمسلم نشستوں کا تعین علاقے میں آبادی کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ انتخابات کے لیے جداگانہ طریق انتخاب رائج ہے۔ کسانوں، مزدوروں اور عورتوں کی مخصوص نشستوں پر اُمیدواروں کا انتخاب مقامی حکومت کے منتخب ارکان کرتے ہیں۔

انتخابات میں اُمیدوار بننے کے لیے ضروری ہے کہ کم از کم عمر ۲۵ سال ہو اور متعلقہ انتخابی حلقے میں اس کا نام بطور ووٹر درج ہو۔ ایسا شخص اُمیدوار بننے کا اہل نہیں ہوتا جو:

(۱) بوقت نامزدگی پاکستان کا شہری نہ رہا ہو۔

(۲) منجانب عدالت مخبوط الحواس قرار دے دیا گیا ہو۔

(۳) بد اخلاق کے جرم میں چھ ماہ یا اس سے زائد سزایافتہ ہو اور ایسی سزا کو ختم ہوئے ابھی تین سال نہ ہوئے ہوں۔

(۴) وفاق، صوبائی یا مقامی حکومت یا ادارے کا تنخواہ دار ملازم ہو۔

(۵) صوبائی یا وفاق مقننہ کی رکنیت کے لیے نااہل قرار دیا جا چکا ہو۔

(۶) کسی سیاسی پارٹی کا رکن ہو۔

(۷) مقامی، صوبائی یا وفاق حکومت کی ملازمت سے برطرف ہو چکا ہو اور برطرف ہوئے ابھی تین سال نہ گزرے ہوں۔

(۸) مقامی حکومت کے کسی کام کا ٹھیکیدار ہو۔ اُسے کوئی سامان سپلائی کر رہا ہو یا اس کے کاروبار میں کوئی مالی مفاد رکھتا ہو۔

کوئی شخص ایک سے زائد مقامی حکومت کا رکن نہیں ہو سکتا۔ مقامی حکومتیں اپنا کاروبار چلانے کے لیے حسب ضرورت ملازم رکھ سکتی ہیں۔ مقامی حکومتی اداروں کے کوائف ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

یونین کونسل

ایک یونین کونسل ایک گاؤں یا چند گاؤں پر مشتمل ہوتی ہے - اس کے زیادہ سے زیادہ پندرہ ارکان ہوتے ہیں - ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار کی آبادی تک کے حلقے سے ایک رکن چنا جاتا ہے - یونین کونسل میں کسانوں کا ایک نمائندہ بھی ہوتا ہے - یونین کونسل کے ارکان اپنے میں سے ایک کو چیئرمین اور ایک کو نائب چیئرمین چن لیتے ہیں -

یونین کونسل کے اختیارات و فرائض کی فہرست کافی طویل ہے - ان میں سے چند اہم فرائض ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

(۱) راستوں، سڑکوں، کوچوں، پلوں، عمارتوں اور کھیل کے میدانوں کی تعمیر اور دیکھ بھال -

(۲) سرکاری باغوں، شام لاٹوں، قبرستانوں اور جلسہ گاہوں کا بندوبست اور دیکھ بھال -

(۳) صفائی اور حفظان صحت کا انتظام -

(۴) پینے کے پانی کی بہم رسانی اور دیکھ بھال -

(۵) خطرناک کاروبار اور لوگوں کو پریشان کرنے والی حرکات کی روک تھام -

(۶) اموات اور ولادات کا اندراج -

(۷) میلوں، نمائشوں اور تقریبات کا انعقاد -

(۸) جرائم کی نشان دہی اور مجرموں کی گرفتاری میں پولیس سے تعاون -

(۹) بیواؤں، یتیموں، غریبوں، مصیبت زدگان اور آفت رسیدگان کی امداد -

(۱۰) زرعی و صنعتی ترقی اور غذائی پیداوار میں اضافہ کے لیے اقدامات -

(۱۱) ابتدائی طبی امداد کے لیے مراکز، شہری دفاع اور فوجی تربیت کا انتظام -

(۱۲) بجلی کے بلوں کی تقسیم اور واجبات کی وصولی -

(۱۳) ضلع کونسل کی جانب سے مفوضہ کام کی انجام دہی اور یونین کونسل کی حدود کے اندر مختلف سہولیات کی فراہمی کے لیے ضلع کونسل کو سفارشات -

(۱۴) سرکاری فرائض کی بجا آوری میں سرکاری اہلکاروں کی امداد -

(۱۵) مدارس، مراکز صحت، آب رسانی، حفظان صحت اور سڑکوں کی تعمیر اور دیکھ بھال میں حکومت سے تعاون -

ان سارے کاموں کو کرنے کے لیے اور سرمایہ فراہم کرنے کے لیے اختیارات یونین کونسل کو تفویض کر دیے گئے ہیں - یونین کونسل ۱۹ قسم کے ٹیکس اور فیس وصول کر سکتی ہے - یہ ساری وصول شدہ رقوم متعلقہ یونین کونسل کے فنڈ میں جمع ہوتی ہیں -

تحصیل کونسل

ہر تحصیل کے لیے ایک تحصیل کونسل ہوتی ہے ۔ شہر اور چھاؤنی کے علاقوں کے ماسوا تحصیل کا تمام دیہاتی علاقہ تحصیل کونسل کے دائرہ اختیار میں ہوتا ہے ۔ تحصیل کی حدود کے اندر واقع تمام یونین کونسلوں کے چیئرمین تحصیل کونسل کے رکن ہوتے ہیں ۔ تحصیل کونسل کے ارکان اپنے میں سے ایک رکن کا بطور چیئرمین اور ایک کا بطور نائب چیئرمین انتخاب کرتے ہیں ۔ صوبہ سندھ میں تحصیل کونسل کی بجائے تعلقہ کونسل ہوتی ہے ۔

تحصیل کونسل کے حسب ذیل فرائض ہیں :

(۱) تحصیل کونسل کی حدود میں واقع ساری یونین کونسلوں کی کارروائیوں میں ارتباط ۔

(۲) ضلع کونسل کی طرف سے مفوضہ فرائض کی بجا آوری ۔

(۳) ترقیاتی منصوبوں کے معائنے اور جائزے ۔

(۴) تحصیل کے اندر مختلف شعبوں میں کوتاہیوں کی نشاندہی اور ان کو دور کرنے کے لیے اقدامات ۔

(۵) زرعی ساز و سامان کی فراہمی کی نگرانی اور اس میں کمی کی ضلع کونسل اور متعلقہ تنظیموں کو رپورٹ ۔

(۶) ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں معلومات کی تشہیر ۔

(۷) امداد باہمی کی انجمنوں کی تشکیل کی حوصلہ افزائی ۔

ضلع کونسل

ہر ضلع میں ایک ضلع کونسل ہوتی ہے ۔ شہروں اور چھاؤنی کے علاقے چھوڑ کر ضلع کا سارا دیہاتی علاقہ ضلع کونسل کا علاقہ ہوتا ہے ۔ تقریباً ہر پچاس ہزار کی آبادی کے لیے ضلع کونسل میں ایک نمائندہ ہوتا ہے ۔ ان کے علاوہ ضلع کونسل میں مزدوروں کا ایک نمائندہ، کسانوں اور عورتوں کا کم از کم ایک ایک اور زیادہ سے زیادہ تین تین نمائندے ہوتے ہیں ۔ ضلع کونسل کے ارکان اپنا ایک چیئرمین اور نائب چیئرمین چنتے ہیں ۔

ضلع کونسل کے فرائض و اختیارات کی فہرست خاصی طویل ہے ۔ اس میں سے کچھ اہم فرائض ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ۔

(۱) سڑکوں، راستوں، کوچوں، پلوں، عمارتوں، کنوؤں، نلکوں، تالابوں، سراؤں، ڈاک بنگلوں، آرام گھروں، کھیل کے میدانوں اور باغوں کی تعمیر و ترقی اور دیکھ بھال ۔

(۲) وبائی امراض کی روک تھام، شفاخانوں، ابتدائی طبی امداد کے مراکز، بچہ و زچہ، اور مراکز صحت کا قیام اور نظم و نسق، طبی امداد کے اداروں کی مالی امداد، یونانی، آیورویدک اور ہومیوپیتھی دواخانوں کا قیام، دیکھ بھال اور نظم و نسق، حفظان صحت، صحت عامہ اور تعلیم صحت کی حوصلہ افزائی ۔

(۳) ابتدائی اور ثانوی مدارس کا قیام و انتظام، طلبا کے لیے اقامت گاہوں کی تعمیر، وظائف کی فراہمی، تعلیمی ادارے چلانے والی تنظیموں کی مالی امداد، فروغ تعلیم بالغاں، بہم اور ادا ... کو مفت یا رعائتی درسی کتابوں کی فراہمی -

(۴) زرعی صنعتی اور معاشرتی ترقی، زرعی پیداوار میں اضافہ کے لیے اقدامات، مثلاً زرعی فارموں کا قیام و انتظام، ترقی دادہ زراعتی طریقوں، آلات اور مشینوں کو مقبول عام بنانے کے لیے اقدامات، بنجر اراضی کی آباد کاری، زرعی قرضوں اور زرعی تعلیم کی حوصلہ افزائی، منڈیوں کا قیام و انتظام، تحریک و تعلیم امداد باہمی کی حوصلہ افزائی، زراعت کے لیے پانی کے ذخیرہ اور فراہمی کے لیے بندوں کی تعمیر و مرمت، گھریلو دستکاریوں کے فروغ کے لیے اقدامات -

(۵) غذائی اشیاء کی حفاظت اور ملاوٹ کی روک تھام -

(۶) گندے پانی کے نکاس کے لیے نالوں اور نالیوں کا انتظام -

(۷) دریاؤں کو عبور کرنے کے لیے کشتیوں کا بندوبست -

(۸) مویشیوں کی خرید و فروخت کا اندراج ، جانوروں سے بے رحمی کا انسداد ، چراگاہوں کا بندوبست، دودھ کی فراہمی میں باقاعدگی کے لیے اقدامات، مویشیوں کی کالونیوں اور فارموں، ڈیریوں اور مرغی خانوں کا قیام و انتظام، پرندوں اور چرندوں کی بیماریوں کی روک تھام کے لیے اقدامات -

(۹) میلوں، کھیلوں، نمائشوں، عجائب خانوں، جلسہ گاہوں، بہبود خانوں اور قومی تقریبات کا انتظام، گداگری، عصمت فروشی، جؤا بازی، شراب نوشی و دیگر معاشرتی عوارض کا سدباب، کتب خانوں اور مراکز معلومات کا قیام و انصرام، قومی و علاقائی زبان کی حوصلہ افزائی، ممتاز مہمانوں کا استقبال -

(۱۰) سیلاب، طوفان، زلزلہ، قحط و دیگر سماوی آفات کے دوران لوگوں کی امداد -

(۱۱) تانگوں، ریہڑوں اور چھکڑوں کے لائسنسوں کا اجرا ، گاڑیوں کے لیے اڈوں کا قیام و انصرام -

(۱۲) ہوا اور پانی کو گندگی سے بچانے کے لیے اقدامات -

۱۳) دیہی ترقی کے کاموں میں یونین کونسلوں اور صوبائی حکومت سے تعاون -

ان فرائض کی ادائیگی کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کے لیے ہر ضلع کونسل کو ۱۶ قسم کے ٹیکس لگانے اور فیس وصول کرنے کا اختیار حاصل ہے - ہر ضلع کونسل کا اپنا فنڈ ہوتا ہے اور تمام وصول شدہ رقوم اس فنڈ میں جمع کروائی جاتی ہیں -

ٹاؤن کمیٹی

ٹاؤن کمیٹی ایسے قصبے میں قائم کی جاتی ہے - جس کی آبادی پانچ ہزار افراد سے زیادہ ہو اور ۲۰ ہزار سے کم - ٹاؤن کمیٹی کے ارکان کی تعداد قصبے کی آبادی کے مطابق مقرر کی جاتی ہے - اس مقصد کے لیے حسب ذیل فارمولہ پیش نظر رکھا جاتا ہے -

آبادی قصبہ	تعداد ارکان
پانچ ہزار سے دس ہزار تک	۹
دس ہزار سے پندرہ ہزار تک	۱۲
پندرہ ہزار سے بیس ہزار تک	۱۵

ٹاؤن کمیٹی میں مزدوروں کا کم از کم ایک اور زیادہ سے زیادہ تین نمائندے ہوتے ہیں۔ اسی حساب سے خواتین کو بھی نمائندگی دی جاتی ہے۔ ٹاؤن کمیٹی کے ارکان اپنے میں سے اپنا ایک چیئرمین اور ایک نائب چیئرمین چنتے ہیں۔

میونسپل کمیٹی

جن شہروں کی آبادی بیس ہزار سے زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی مقامی حکومت کو میونسپل کمیٹی کہتے ہیں۔ میونسپل کمیٹی کے ارکان کی تعداد حسب ذیل فارمولے کے مطابق مقرر کی جاتی ہے۔

آبادی شہر	تعداد ارکان
بیس ہزار سے ایک لاکھ تک	۱۵
ایک لاکھ سے دو لاکھ تک	۲۰
دو لاکھ سے تین لاکھ تک	۲۵
تین لاکھ سے پانچ لاکھ	۳۰
پانچ لاکھ سے زائد	۳۵

ان ارکان کے علاوہ میونسپل کمیٹی میں کسانوں اور عورتوں کا کم از کم ایک ایک نمائندہ ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ تین تین نمائندے، کمیٹی کے ارکان اپنے میں سے ایک کو اپنا چیئرمین اور ایک کو نائب چیئرمین منتخب کرتے ہیں۔

میونسپل کارپوریشن

جن شہروں کی آبادی پانچ لاکھ سے زیادہ ہوتی ہے۔ وہاں کی مقامی حکومت کو میونسپل کارپوریشن کہتے ہیں۔ اس کے ارکان کی تعداد حسب ذیل فارمولے کے مطابق مقرر کی جاتی ہے۔

آبادی شہر	تعداد ارکان
پانچ لاکھ سے دس لاکھ تک	۵۰
دس لاکھ سے بیس لاکھ تک	۷۵
بیس لاکھ سے زیادہ	۱۰۰

ارکان کی اس تعداد کے علاوہ کارپوریشن میں مزدوروں اور عورتوں کا کم از کم ایک ایک نمائندہ ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ تین تین نمائندے۔ میونسپل کارپوریشن کے ارکان اپنے میں سے ایک صاحب

کو کارپوریشن کا میئر اور ایک کو نائب میئر چن لیتے ہیں ۔

بلدیاتی اداروں یعنی ٹاؤن کمیٹیوں، میونسپل کمیٹیوں اور میونسپل کارپوریشنوں کے فرائض اور اختیارات بہت وسیع ہیں ۔ ان میں سے کچھ مختصراً نیچے دے جاتے ہیں ۔

لازمی فرائض :

(۱) شہر کی صفائی اور حفظان صحت، ٹٹی خانوں اور پیشاب خانوں کا انتظام، کوڑا کرکٹ اور گندگی ہٹانے کے انتظامات، گندے پانی کے نکاس کے لیے نالوں، نالیوں کا بندوبست ۔

(۲) پینے کے پانی کا انتظام ، غذائی اشیاء ، مشروبات، گوشت اور جانوروں کی خرید و فروخت کے لیے مارکیٹوں کے قیام کے لیے لائسنسوں کا اجرا ۔

(۳) شہر میں مویشیوں کو رکھنے پر پابندی ۔

(۴) تعلیم عامہ کے لیے مدارس کا قیام و انصرام، نجی تعلیمی اداروں کی مالی امداد ، لازمی تعلیم کے لیے اقدامات ۔

(۵) آتش زنی سے بچاؤ کے لیے فائر بریگیڈ کا اہتمام ، سیلاب سے بچاؤ کے لیے ضروری اقدامات ، خطرناک کاروبار کی ممانعت ۔

(۶) شہر میں نئی آبادیوں کی منصوبہ بندی اور تکمیل ۔

(۷) عمارات کی نگرانی، عمارات کی تعمیر کی منظوری، عمارات میں رد و بدل کی منظوری، خستہ حال عمارات کے انہدام کے لیے اقدامات ۔

(۸) کوچوں کی تعمیر، کوچوں میں روشنی اور پانی کے چھڑکاؤ کا انتظام ۔

(۹) موٹروں کے علاوہ گاڑیوں کے لیے لائسنسوں کا اجرا ، موٹروں کی پارکنگ کے لیے جگہ کی فراہمی ۔

(۱۰) سڑکوں کے کنارے اور کوچوں میں شجرکاری ۔

اختیاری فرائض

(۱) مراکز صحت ، مراکز بچہ و زچہ ، ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کا قیام و انصرام، طبی امداد کے لیے اقدامات، فضا اور پانی کو گندگی سے محفوظ رکھنے کے لیے انتظامات ۔

(۲) دھوبی گھاٹوں، حماموں، نہروں، کشتیوں وغیرہ کے بارے میں قواعد و ضوابط ۔

(۳) غذا، مشروبات، دودھ کے بارے میں قواعد و ضوابط ۔

(۴) جانوروں کے لیے ہسپتالوں کا قیام و انتظام، جانوروں کی وبائی امراض کی روک تھام کے لیے مویشی خانوں اور مرغی خانوں کا قیام و انتظام، جانوروں کی خرید و فروخت کا اندراج ،

مویشیوں کی منڈیوں اور نمائشوں کا انتظام ، چڑیا گھروں کا قیام ۔

(۵) زمانۂ قحط میں لوگوں کی امداد ، قبرستانوں اور خانقاہوں کی دیکھ بھال ۔

(٦) باغات، جنگلات اور میدانوں کی تیاری ۔

(۷) طلبا کے لیے ہوسٹلوں کی تعمیر ، ذہین طلبا کے لیے وظائف ، تربیت اساتذہ و تعلیم بالغاں کا انتظام ، یتیم اور نادار طلبا کے لیے درسی کتابوں کی مفت یا رعایتاً فراہمی، درسی کتابوں اور سامان نوشت و خواند کی فروخت کے لیے دکانوں کا بندوبست، بچوں کے سکولوں میں کھانے یا دودھ کی فراہمی ۔

(۸) لائبریریوں اور مراکز اطلاعات کا قیام و انصرام، سرکاری اداروں میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے سیٹوں کا انتظام، ممتاز مہمانوں کا استقبال، قومی اور علاقائی زبان کی حوصلہ افزائی، تن سازی، کھیلوں اور ٹورنامنٹوں کے لیے انتظامات، عوام کی تفریح کے لیے سہولیات کا بندوبست ۔

(۹) دارلامانوں، بہبود خانوں، یتیم خانوں اور بیوہ خانوں کا قیام و انصرام، گداگری، عصمت فروشی جوا بازی، نشہ خوری، بے راہروی اور دیگر معاشرتی برائیوں کے لیے اقدامات، پسماندہ طبقوں، فوجیوں کے خاندانوں، بچوں اور عورتوں کی بھلائی کے لیے اقدامات ۔

(۱۰) شہر میں امن و امان کے لیے ضروری پولیس فورس کا قیام و انتظام ۔

ان فرائض کی بجا آوری کے لیے بلدیاتی حکومتوں کو سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ضروری سرمایہ کی فراہمی کے لیے بلدیاتی حکومتوں کو ۲۷ قسم کے ٹیکس لگانے اور فیس وصول کرنے کا اختیار ہے ۔ یہ سرمایہ ہر بلدیاتی ادارے کے حساب میں جمع ہوتا ہے اور حسب ضرورت وہاں سے نکالا جاتا ہے ۔

صحت و صفائی

انسانی زندگی میں تندرستی سب سے بڑی نعمت ہے ۔ اگر صحت اچھی ہو تو انسان زندگی کی نعمتوں اور آسائشوں سے کما حقہ لطف اندوز ہو سکتا ہے ۔ صحت خراب ہو تو زندگی وبال جان بن جاتی ہے ۔ تندرست انسان اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی استعداد کار بڑھا سکتا ہے ۔ اچھی صحت حصول روزگار کے سلسلے میں بھی انسان کی ممد و معاون ہوتی ہے ۔ تندرست انسان پوری لگن اور دلجمعی سے اپنے فرائض کو سرانجام دے سکتا ہے ۔ تندرست جسم ہی تندرست دماغ پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے جب کہ مسلسل بیماری انسان کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو سلب کر لیتی ہے اور آہستہ آہستہ تمام قویٰ جواب دے جاتے ہیں ۔

جس طرح فرد کی زندگی میں تندرستی ایک بیش بہا نعمت ہے ۔ اسی طرح قومی زندگی میں پورے معاشرے کی صحت بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ معاشرے کے افراد اگر بحیثیت مجموعی تندرست و توانا ہوں گے تو اپنی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر قومی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں گے ۔ جس معاشرے میں بیماریاں عام ہوں وہاں ترقی کی رفتار سست پڑ جاتی ہے اور معاشرہ مختلف قسم کی معاشرتی اور معاشی

بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، لہٰذا قومی ترقی کے لیے صحت مند معاشرے کا قیام ناگزیر ہے۔

ہمارے ملک میں صحت کا معیار بہت پست ہے۔ بیماریاں عام ہیں جب کہ بیماریوں کی روک تھام کے لیے مؤثر اقدامات کی بے حد کمی ہے، صحت عامہ کی پستی کی وجوہات حسب ذیل ہیں :

۱- غربت :

ہمارے ملک میں عام لوگوں کا معیار زندگی بہت پست ہے۔ دوسرے ممالک کے مقابلے میں فی کس اوسط آمدنی کی شرح بہت کم ہے جس کی وجہ سے عوام کو نہ تو مناسب خوراک ملتی ہے اور نہ ہی مناسب طبی سہولتیں میسر آتی ہیں۔ غربت کی وجہ سے لوگ مجبوراً سستی اور غیرمتوازن غذا استعمال کرتے ہیں، جس کی وجہ سے جسمانی نشو و نما مناسب نہیں ہوتی۔ مناسب اور متوازن غذا کی کمی کے باعث جسم میں قوت مدافعت ختم ہو جاتی ہے اور لوگ بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

۲- طبی سہولتوں کی کمی :

صحت کی پستی کی وجہ طبی سہولتوں کی کمی ہے، طبی مراکز کی تعداد روز افزوں آبادی کی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ غربت کی وجہ سے لوگ علاج معالجہ کے اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ دوائیاں بہت مہنگی ہیں۔ سرکاری ہسپتالوں میں مریضوں کی تعداد کی زیادتی کی وجہ سے ڈاکٹر مریضوں کی طرف مناسب توجہ نہیں دے سکتے اور پرائیویٹ ڈاکٹروں کی فیسیں بہت زیادہ ہیں۔

۳- ناخواندگی :

عوام کی اکثریت ناخواندہ ہے۔ لوگ بیماری کا علاج بروقت نہیں کراتے جس کی وجہ سے بیماری بڑھتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ بیماری لاعلاج ہو جاتی ہے۔ جہالت کی وجہ سے لوگ متوازن غذا کے استعمال سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ انھیں یہ علم نہیں ہوتا کہ بعض سستی، سادہ اور زود ہضم غذائیں مرغن اور تلے ہوئے کھانوں سے زیادہ بہتر اور مفید ہوتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں کو متوازن غذا اور اس کے فائدوں سے روشناس کرایا جائے۔

۴- اشیائے خوردنی میں ملاوٹ :

صحت برقرار رکھنے کے لیے خالص خوراک بہت ضروری ہے مگر بد قسمتی سے خالص خوراک کا حصول ہمارے ملک میں خاصا مشکل ہے، کاروباری حضرات ذاتی منافع کی خاطر غذائی اجناس میں ملاوٹ کر لیتے ہیں۔ اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کی وجہ سے عوام کی صحت بہت متاثر ہوتی ہے۔ اس مسئلے کا حل عوام اور حکومت کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ یہ مسئلہ صرف قوانین اور سزاؤں کے ذریعے حل نہیں ہو سکتا۔ تعلیم و تربیت اور ابلاغ عامہ کے ذریعوں سے اس قسم کے تاجروں کی اخلاقی تربیت کا انتظام ہونا چاہیے، تاکہ انھیں اپنے گھناؤنے جرم کا احساس ہو اور وہ مخلوق خدا کو تکلیفوں میں مبتلا کرنے سے احتراز کریں۔

۵- حفظان صحت کے اصولوں سے عدم واقفیت :

عام لوگ حفظان صحت کے اصولوں سے ناواقف ہیں - گاؤں اور شہروں میں کوڑا کرکٹ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں - گندگی میں جراثیم پیدا ہوتے اور پرورش پاتے رہتے ہیں، جو بیماری پھیلانے کا باعث بنتے ہیں - شہروں میں تنگ و تاریک مکانات بھی بیماریوں میں اضافے کا باعث بنتے ہیں - عام لوگ سیر اور ورزش کے فوائد سے بھی ناواقف ہیں -

صفائی کی اہمیت

صحت اور صفائی کا چولی دامن کا ساتھ ہے - صفائی صحت کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے - اسی لیے اسلام میں صفائی اور پاکیزگی کو بے حد اہمیت حاصل ہے - ہمارے ملک میں صفائی کا معیار بے حد پست ہے - ماحول کی غلاظت اور گندگی صحت عامہ کو بری طرح متاثر کر رہی ہے - بیماریاں بڑھ رہی ہیں - شرح اموات میں اضافہ ہو رہا ہے اور اوسط عمر کم ہوتی جا رہی ہے - صفائی کا معیار بلند کرنے کے لیے جہاں مقامی متعلقہ شعبوں کی کارکردگی بہتر بنانے کی ضرورت ہے، وہاں عوام میں بھی صفائی کی اہمیت کا احساس پیدا کرنا ضروری ہے - صفائی کے ضمن میں سب سے پہلے جسمانی صفائی کا نمبر آتا ہے - جسمانی صفائی میں روزانہ غسل کرنا، صاف کپڑے پہننا، بال، ناخن، دانت اور کان صاف رکھنا، عام استعمال میں آنے والی اشیاء مثلاً کنگھی، تولیہ، برش، برتن وغیرہ صاف رکھنا شامل ہے -

جسمانی صفائی کے بعد مکان اور ماحول کی صفائی کا نمبر آتا ہے - جہالت کی وجہ سے عموماً یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ اپنے گھروں کی صفائی کرنے کے بعد کوڑا کرکٹ گلی میں پھینک دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے گلیوں میں غلاظت کے ڈھیر جمع ہو جاتے ہیں - بعض علاقوں میں پانی کے نکاس کا معقول انتظام نہیں ہوتا - گندا پانی جوہڑوں یا گڑھوں میں جمع ہوتا رہتا ہے جس سے تعفن اور بدبو پھیلتی ہے - گندگی میں جراثیم پرورش پاتے اور گندے پانی میں مچھر پیدا ہوتے ہیں جو مختلف بیماریاں پھیلانے کا سبب بنتے ہیں - صفائی کے سلسلے میں جہاں محکمہ صحت کا فرض ہے کہ وہ علاقے کی صحت و صفائی کا انتظام کرے وہاں تعلیم یافتہ افراد کا فرض بھی ہے کہ وہ لوگوں کو صفائی کی اہمیت بتائیں انھیں صفائی کے اصولوں سے روشناس کرائیں اور ان پر عمل درآمد کرانے کے لیے کوشش کریں -

دستور پاکستان ۱۹۷۳ء

دستور ان بنیادی اصولوں اور قاعدوں کا مجموعہ ہوتا ہے، جو شہریوں کے حقوق، حکومت کے اختیارات اور ان کے باہمی تعلقات کی وضاحت کرتا ہے اور ان کی روشنی میں کاروبار حکومت چلایا جاتا ہے - دستور کو قومی زندگی میں بے حد اہمیت حاصل ہوتی ہے - یہ ایک اہم دستاویز ہوتی ہے جسے بڑی احتیاط اور چھان بین کے بعد تیار کیا جاتا ہے -

پاکستان میں دستوری ارتقاء

قیام پاکستان کے وقت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو ضروری ترامیم کے ساتھ پاکستان میں نافذ کیا گیا لیکن پاکستان چونکہ اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا اس لیے قیام پاکستان کے فوراً بعد ملک میں اسلامی نظام کے قیام کا مطالبہ شدت اختیار کر گیا ۔ لہذا دستور ساز اسمبلی کو دستور کی اسلامی اساس کا اعلان کرنا پڑا، مارچ ۱۹۴۹ء میں وزیر اعظم پاکستان نوابزادہ لیاقت علی خان مرحوم نے دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد پیش کی ۔ پاکستان کی دستور سازی کی تاریخ میں قرارداد مقاصد بنیادی اہمیت کی حامل ہے ۔ یہ قوم کے مخصوص تاریخی ورثے کی عکاسی اور قومی نصب العین کی نشاندہی کرتی ہے ۔ اس قرارداد میں واضح طور پر بیان کیا گیا تھا کہ اقتدار اعلیٰ کی حامل صرف خداوند تعالیٰ کی ذات ہے اس لیے پاکستان میں تمام سیاسی اختیارات کا استعمال اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق کیا جائے گا ۔ حکومت کی طرف سے جمہوریت، آزادی، مساوات اور معاشرتی انصاف کے تصورات اسلام کے پیش کردہ اصولوں کے مطابق نافذ کیے جائیں گے ۔ قرارداد میں اس امر کا بھی اظہار کیا گیا کہ عوام کو اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں گے اور اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی ۔ نظام حکومت وفاقی ہوگا جس میں صوبائی خود مختاری کی پوری ضمانت دی جائے گی ۔ اس میں بنیادی حقوق کا تحفظ، عدل و انصاف کا قیام اور عدلیہ کی آزادی برقرار رکھنے کی یقین دہانی کرائی گئی تھی ۔ چنانچہ قرارداد مقاصد نے واضح طور پر ملک کے مستقبل کے آئینی نظام کے لیے بنیادیں فراہم کر دیں ۔

بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے قرارداد مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی سفارشات ۱۹۵۰ء میں پیش کر دیں ۔ کمیٹی کی رپورٹ پر مشرقی پاکستان میں بڑے شدید رد عمل کا اظہار کیا گیا ۔ ۵ نومبر ۱۹۵۰ء کو ڈھاکہ میں ایک کنونشن منعقد ہوا جس میں ایک متبادل آئین دینے کا وعدہ کیا گیا ۔ اے ۔ کے فضل حق نے کنونشن کے فیصلوں کی مخالفت کی اور کمیٹی کی رپورٹ پر کیے گئے اعتراضات اور خدشات کو بے بنیاد قرار دیا ۔ مشرقی پاکستان مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں لیگ کی مرکزی کمیٹی کو رپورٹ میں مؤثر تبدیلیاں کرنے کی سفارش کی گئی ۔ جس پر نوابزادہ لیاقت علی خان نے اسمبلی کے اجلاس میں رپورٹ میں تبدیلیاں کرنے کا اعلان کیا اور عوام سے اس سلسلے میں تجاویز طلب کر لیں ۔ اسی دوران میں قائد ملت کو شہید کر دیا گیا ۔ ان کی جگہ خواجہ ناظم الدین نے لے لی اور جلد ہی ایک نئی رپورٹ تیار کروا کر اسمبلی کے سامنے پیش کر دی ۔

دوسری رپورٹ پیش ہوئی تو بنگالیوں نے خوب تعریف کی لیکن اس پر پنجاب نے تنقید کی کہ اس رپورٹ پر عمل درآمد کے ذریعے مشرقی پاکستان کی کل پاکستان پر حکومت قائم ہو جائے گی ۔ لہذا اس کے نتائج مغربی حصے کے عوام کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں ۔ محمد علی بوگرا کو وزارت عظمی

پہر بھی تو آئین کے تعطل کو دور کرنے کے لیے ایک تجویز پیش کی گئی جسے بوگرا فارمولا کہا جاتا ہے ۔ بوگرا فارمولا بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی دونوں رپورٹوں کے مقابلے میں کامیاب رہا اور دونوں حصوں کے اخبارات اور عوام نے اس پر پسندیدگی کا اظہار کیا امید تھی کہ اس پر عمل کرتے ہوئے ایک آئین ترتیب دیا جا سکے گا لیکن وزیر اعظم محمد علی بوگرا اور گورنر جنرل غلام محمد ملک کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا جس کے نتیجے میں گورنر جنرل نے اسمبلی توڑ دی ۔

دوسری دستور ساز اسمبلی کا انتخاب ۱۹۵۵ء میں ہوا ۔ اس اسمبلی نے اپنی تمام تر توجہ دستور سازی پر لگا دی جس کے نتیجے میں مارچ ۱۹۵۶ء میں پاکستان کا دستور منظور ہوا اور ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو اسے ملک میں نافذ کر دیا گیا ۔ یہ دستور تقریباً اڑھائی سال تک نافذ رہا ۔ ۱۹۵۸ء کو بری فوج کے سربراہ محمد ایوب خان فوجی انقلاب کے ذریعے برسراقتدار آئے اور ملک کا دستور منسوخ کرکے مارشل لاء نافذ کر دیا ۔ ایوب خاں نے بنیادی جمہوریت کی بنیاد پر نیا دستور تیار کرایا ۔ جسے ۱۹۶۲ء میں نافذ کر دیا گیا ۔ اس کی رو سے قومی اسمبلی کے اختیارات محدود کرکے صدر مملکت کو بہت وسیع اختیارات دے دیے گئے اور بالواسطہ انتخابات کا طریقہ رائج کیا گیا ۔

۱۹۶۸ء کے آخر میں عوام نے ایوب خان کے خلاف تحریک شروع کی ۔ جس کے نتیجے میں اسے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو استعفیٰ دینا پڑا اور نظام اقتدار بری فوج کے سربراہ محمد یحییٰ خاں نے سنبھالی اور دستور منسوخ کرکے ایک بار پھر مارشل لاء لگا دیا ۔ نئی مارشل لاء حکومت نے اعلان کیا کہ بہت جلد آئینی حکومت قائم کرکے جمہوریت بحال کر دی جائے گی ۔ نئے آئین کی تیاری کے لیے انھوں نے ۲۹ مارچ ۱۹۷۰ء کو آئینی ڈھانچہ کا اعلان کیا ۔ قانونی ڈھانچہ کے مطابق سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا اور ۱۹۷۰ء میں انتخابات منعقد ہوئے ۔ انتخابات کے بعد ملک شدید بحران اور بیرونی سازشوں کا شکار ہو گیا، جس کے نتیجے میں دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کا صوبہ الگ ہو گیا ۔ مغربی پاکستان کے منتخب نمائندوں کا اجلاس ۱۹۷۲ء میں منعقد ہوا ، جس میں وقتی ضروریات پوری کرنے کے لیے عبوری دستور منظور ہوا ۔

ملک کا مستقل دستور تیار کرنے کے لیے قومی اسمبلی نے ۲۵ رکنی کمیٹی تشکیل دی ۔ اس کمیٹی نے دستوری مسودہ تیار کرکے ۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو قومی اسمبلی کے سامنے پیش کر دیا ۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد کچھ ترامیم کے ساتھ اپریل ۱۹۷۳ء میں یہ مسودہ منظور کر لیا گیا ، اور ۱۰ اگست ۱۹۷۳ء کو اسے ملک میں نافذ کر دیا گیا ۔

دستور ۱۹۷۳ء کی خصوصیات

۱۔ اسلامی آئین :

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے ۔ اس کی بنیاد اسلام کے اصولوں پر رکھی گئی ہے ۔ ۱۹۷۳ء

کہ آئین اسی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ آئین کی رو سے پاکستان کا نام "اسلامی جمہوریہ پاکستان" ہوگا۔ اسلام ملک کا سرکاری مذہب قرار پایا۔ آئین کی تمہید ہی میں مان لیا گیا کہ کائنات کا اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کی عظیم ذات کو حاصل ہے۔ پاکستانی حکومت ان اختیارات کو مقدس امانت سمجھ کر استعمال کرے گی۔ آئین میں ایسا نظام لانے کا دعویٰ کیا گیا ہے جس میں مسلمان اس قابل ہوں گے کہ وہ اپنی زندگیوں کو انفرادی اور اجتماعی دائروں میں اسلام کی ہدایات کے مطابق ڈھال سکیں۔ آئین میں اس بات کا عہد کیا گیا ہے کہ ملک کے مروجہ قوانین کو اسلامی طرز پر ڈھالا جائے گا اور آئندہ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائے گا جو اسلام کے بنیادی اصولوں کے منافی ہو۔ پارلیمنٹ، صوبائی اسمبلی، صدر اور گورنروں کو اسلامی فلسفے کے سلسلے میں رہنمائی مہیا کرنے کے لیے "اسلامی نظریاتی کونسل" کا قیام عمل میں لایا گیا۔

دستور میں مسلمان کی تعریف بھی کی گئی ہے۔ دستور کی رو سے جو شخص خدا کی وحدانیت اور پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کے آخری نبی کی حیثیت سے مکمل یقین رکھتا ہے۔ مسلمان متصور ہوگا۔ صرف مسلمان ہی پاکستان کے صدر اور وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہوں گے۔ کوئی غیرمسلم ان عہدوں پر فائز نہیں ہو سکتا۔ وفاقی وزراء، گورنر، قومی اسمبلی کا سپیکر، ڈپٹی سپیکر، سینٹ کے چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین اور صوبائی وزراء کو حلف اٹھاتے وقت اسلامی نظریے کے تحفظ کا اقرار کرنا ہوگا۔ قرآن پاک اور اسلامیات کی تعلیم لازمی قرار دی جائے گی اور حکومت اس امر کا خیال رکھے گی کہ قرآن مجید کی طباعت غلطیوں سے بالکل پاک اور مبرا ہو۔ ملک میں اسلام کا ضابطہ اخلاق نافذ کیا جائے گا۔ زکواۃ اوقاف اور مساجد کو مناسب طور پر منظم کیا جائے گا۔ آئین میں اقلیتوں کے حقوق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ اسلامی شقوں کی آئین میں موجودگی غیرمسلموں کے پرسنل لاء کو متاثر نہیں کرے گی اور نہ ہی ان کی شہری حیثیت میں کوئی تبدیلی ہوگی۔ آئین میں غیرمسلموں کو ضمانت دی گئی ہے کہ وہ اپنے اپنے مذاہب کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

۲۔ پارلیمانی طرز حکومت:

پاکستان کا موجودہ آئین پارلیمانی طرز کا حامل ہے۔ حکومت کا سربراہ وزیر اعظم ہوگا جو قومی اسمبلی میں اکثریتی جماعت کا لیڈر ہوگا۔ وزیر اعظم کو قومی اسمبلی کے کل ممبران کی اکثریت کی حمایت سے منتخب کیا جائے گا۔ پارلیمنٹ کو ملک کے سب سے بڑے قانون ساز ادارے کی حیثیت حاصل ہوگی۔ پارلیمنٹ قومی اسمبلی اور سینٹ پر مشتمل ہوگی۔

۳۔ وفاقی آئین:

موجودہ آئین وفاقی نوعیت کا ہے۔ آئین کی رو سے اختیارات کو مرکز اور صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک فہرست متصلہ امور کی دی گئی ہے، جن کے متعلق قانون سازی کا اختیار مرکزی اور صوبائی

دونوں اسمبلیوں کو حاصل ہے۔ اگر کسی معاملے میں دونوں اسمبلیاں قانون سازی کرتی ہیں تو مرکزی اسمبلی کے بنائے ہوئے قانون کو فوقیت حاصل ہوگی۔

وفاقی حکومت کا ڈھانچہ

ہر حکومت کے تین بنیادی شعبے ہوتے ہیں۔ انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ، مرکزی حکومت کے تینوں شعبوں کا حال الگ الگ درج ذیل ہے۔

۱- مرکزی انتظامیہ

صدر:

صدر، مملکت کا آئینی سربراہ ہوگا، جسے قومی اسمبلی اور سینٹ کے مشترکہ اجلاس میں پانچ سال کے لیے منتخب کیا جائے گا۔ صدر کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسلمان ہو۔ صدر کو قومی اسمبلی، سینٹ یا دونوں کے مشترکہ اجلاس بلانے اور ملتوی کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ وہ پارلیمنٹ کے کسی ایوان سے خطاب کر سکتا ہے اور وزیراعظم کے مشورے سے قومی اسمبلی کو بھی توڑ سکتا ہے۔ حالات کے تقاضوں کے پیش نظر صدر کو آرڈی نینس نافذ کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے، بشرطیکہ اس کے دوران اسمبلی کا اجلاس نہ ہو رہا ہو۔ اسے اٹارنی جنرل، آڈیٹر جنرل، چیف الیکشن کمشنر، اسلامی مشاورتی کونسل، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور دوسرے ججوں اور صوبائی گورنروں کے تقرر کا اختیار حاصل ہے، صدر کو اختیار حاصل ہے کہ وہ افواج پاکستان کو کمیشن عطا کرے۔ بری فوج، بحریہ اور فضائیہ کے چیف آف سٹاف کا تقرر کرے اور ان کی تنخواہوں کا تعین کرے۔ اس کے علاوہ قومی اقتصادی کونسل، کونسل برائے مشترکہ مفادات اور نیشنل فنانس کمیشن مقرر کرنے کا اختیار بھی صدر کو حاصل ہے۔

وزیر اعظم:

پارلیمانی نظام حکومت میں وزیر اعظم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وزیر اعظم کا انتخاب قومی اسمبلی کثرت رائے سے کرتی ہے اور وہ اپنے عہدے پر اس وقت تک فائز رہتا ہے جب تک اسے قومی اسمبلی کی حمایت حاصل رہتی ہے، قومی اسمبلی چاہے تو عدم اعتماد کی تحریک منظور کرکے وزیر اعظم کو اس کے عہدے سے سبکدوش کر سکتی ہے۔ عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں وزیر اعظم کے جانشین کا نام تجویز کیا گیا ہو۔

وزیر اعظم ملکی انتظامیہ کا سربراہ ہوتا ہے۔ وزیر اعظم کا عہدہ بہت بااختیار ہے۔ وہ وزراء اور وزرائے مملکت کا تقرر کرتا ہے۔ قومی اسمبلی میں اکثریتی جماعت کے قائد کی حیثیت سے قائد ایوان کے فرائض بھی سرانجام دیتا ہے۔ تمام حکومتی فیصلوں اور پالیسیوں کا اعلان کرتا ہے۔ اٹارنی جنرل، آڈیٹر جنرل، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں، مسلح افواج کے سربراہوں اور اعلیٰ سطح کے مختلف اداروں کے اراکین کے تقرر کے سلسلے میں صدر مملکت کو مشورہ دیتا ہے۔ قانون سازی میں پارلیمنٹ کی

رہنمائی کرتا ہے ۔ صدر کو ملک کے اندرونی معاملات، خارجہ پالیسی اور قانون سازی کے امور سے آگاہ رکھتا ہے ۔

صدر مملکت اپنے اختیارات کے استعمال کے سلسلے میں بھی وزیر اعظم کے مشوروں کا پابند ہے ۔ بیرونی جارحیت، اندرونی خلفشار یا شدید معاشی بحران کی وجہ سے ملک میں ہنگامی صورت حال پیدا ہو جائے تو وزیر اعظم کے مشورے سے صدر مملکت ملک میں ہنگامی صورت کا اعلان کر کے حکومت کو مزید اختیارات سونپ سکتا ہے ۔ آئین کی رو سے قومی اسمبلی کو معطل کرنے کا اختیار اگرچہ صدر کو حاصل ہے لیکن صدر یہ اختیار صرف وزیر اعظم کے مشورے پر استعمال کر سکتا ہے ۔ وزیر اعظم اپنے اختیارات کے استعمال اور فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں کسی عدالت کے سامنے جواب دہ نہیں ہے ۔

۲۔ وفاقی مقننہ :

پارلیمنٹ ملک کا اعلیٰ ترین قانون ساز ادارہ ہے جو دو ایوانوں پر مشتمل ہے ۔ ایوان بالا کا نام سینٹ اور ایوان زیرین کا نام قومی اسمبلی ہے ۔ ایوان بالا یعنی سینٹ میں تمام صوبوں کو یکساں نمائندگی دے دی گئی ہے ۔ ہر صوبے کے لیے ۱۴ نشستیں مخصوص ہیں اور یوں چاروں صوبوں کے منتخب ممبران کی تعداد ۵۶ ہے ۔ وفاق دارلحکومت کے لیے دو اور وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں کے لیے پانچ نشستیں مخصوص ہیں، اس طرح سینٹ کے کل ارکان کی تعداد ۶۳ ہے ۔ سینٹ ایک مستقل ادارہ ہے اور اسے معزول نہیں کیا جا سکتا، اس کے ممبران کی میعاد چار سال ہوتی ہے جن میں سے نصف ممبران ہر دو سال بعد ریٹائر ہوتے رہیں گے ۔ سینٹ اپنے پہلے اجلاس کے موقعہ پر ممبران میں سے ایک چیئرمین اور ایک ڈپٹی چیئرمین کا انتخاب کریں گے ۔ جن کے عہدے کی مدت دو سال ہوگی ۔

ایوان زیریں یعنی قومی اسمبلی کے ممبران کی تعداد ۲۰۰ مقرر کی گئی ہے ۔ ان کا انتخاب براہ راست بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہوگا ۔ اس کے علاوہ کچھ نشستیں خواتین اور اقلیتوں کے لیے مخصوص کی گئی ہیں ۔ قومی اسمبلی کی مدت پانچ سال مقرر کی گئی ہے ۔ پانچ سال کی مدت کا آغاز قومی اسمبلی کے پہلے اجلاس کے انعقاد سے ہوگا اور پانچ سال گزرنے کے بعد اسمبلی خود بخود ختم ہو جائے گی بشرطیکہ اس کی میعاد میں توسیع نہ کی جائے۔ اسمبلی پہلے اجلاس میں اپنے ممبروں میں سے سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کا انتخاب کرے گی ۔ سپیکر کا اہم فریضہ اسمبلی کے اجلاس کی صدارت کرنا اور ایوان میں نظم و ضبط قائم رکھنا ہے ۔ قومی اسمبلی یا سینٹ کا ممبر بننے کے لیے امیدوار کے لیے پاکستان کا شہری ہونا اور ووٹروں کی فہرست میں اس کا نام درج ہونا ضروری ہے ۔ سینٹ کی ممبر شپ کے لیے عمر ۳۰ سال اور قومی اسمبلی کے لیے ۲۵ سال سے کم نہیں ہونی چاہیے ۔

پارلیمنٹ کا سب سے اہم فریضہ قانون سازی ہے ۔ پارلیمنٹ کو وفاق قانون سازی کی فہرست میں شامل تمام امور پر مکمل کنٹرول حاصل ہے اور وہ ان پر قانون سازی کر سکتی ہے ۔ وفاق قانون سازی

کی فہرست دو حصوں میں منقسم ہے ۔ حصہ اول سے تعلق رکھنے والے بل کو پہلے قومی اسمبلی میں پیش کیا جائے گا اور یہاں سے پاس ہو جانے کی صورت میں اسے سینٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا ۔ حصہ دوم سے یا متصلہ امور سے تعلق رکھنے والا بل کسی بھی ایوان سے شروع کیا جا سکتا ہے اور وہاں منظور ہونے کے بعد دوسرے ایوان کو بھیج دیا جائے گا ۔ دوسرے ایوان کی منظوری کے بعد بل صدر مملکت کے سامنے توثیق کے لیے پیش ہوگا ۔ وفاق حکومت کی طرف سے کسی صوبے میں ہنگامی حالات کے اعلان کی صورت میں متعلقہ صوبے کے بارے میں قانون سازی کا اختیار بھی پارلیمنٹ کو حاصل ہو جاتا ہے، لیکن اس دوران بنائے ہوئے قوانین ہنگامی حالات کے خاتمے کے چھ ماہ بعد خود بخود ختم ہو جاتے ہیں ۔ صدر کی جانب سے ہنگامی حالات کے اعلان کی توثیق کا اختیار بھی پارلیمنٹ کو حاصل ہے ۔

پارلیمنٹ کو ملک کی مالیات پر پورا کنٹرول حاصل ہے ۔ آئین کے مطابق پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر نہ ہی ٹیکس لگائے جا سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی خرچ کیا جا سکتا ہے ۔ تمام وفاقی جمہوری مملکتوں کی طرح پاکستان میں بھی مالیات پر کنٹرول ایوان زیریں یعنی قومی اسمبلی کو حاصل ہے ۔ آئین کی رو سے مالی امور سے متعلقہ بل صرف قومی اسمبلی ہی میں پیش اور منظور کیا جا سکتا ہے ۔ وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک بھی صرف قومی اسمبلی ہی منظور کر سکتی ہے ۔ وزیر اعظم کی سفارش پر صدر مملکت قومی اسمبلی کو توڑ کر نئے انتخابات کا حکم دے سکتا ہے ۔ صدر مملکت کے لیے لازم ہے کہ وہ وزیر اعظم کی سفارش کے بعد اسمبلی کو اڑتالیس گھنٹے کے اندر توڑ دے بصورت دیگر اڑتالیس گھنٹے گزرنے کے بعد اسمبلی خود بخود ختم ہو جائے گی ۔

۳۔ مرکزی عدلیہ :

کسی بھی ملک میں آزادی اور جمہوریت کا اندازہ لگانے کے لیے واضح معیار وہاں کی عدلیہ ہے ۔ آزاد عدلیہ ملک میں جمہوریت کی روح اور عوام کے حقوق کی ضامن سمجھی جاتی ہے ۔ صرف آزاد عدلیہ ہی سے عوام انصاف کی توقع رکھ سکتے ہیں اور انتظامیہ کی زیادتیوں سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں ۔ دستور پاکستان کے مطابق ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کا نام سپریم کورٹ ہے، جو چیف جسٹس اور دیگر ججوں پر مشتمل ہے ۔ چیف جسٹس کے تقرر کا اختیار صدر مملکت کو حاصل ہے، جب کہ دیگر ججوں کا تقرر صدر مملکت چیف جسٹس کے مشورے سے کرتا ہے ۔ سپریم کورٹ کا جج بننے کا اہل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ پاکستان کا شہری ہو اور پانچ سال کے لیے ہائی کورٹ کا جج رہا ہو یا کسی ہائی کورٹ میں کم از کم پندرہ سال وکالت کا تجربہ رکھتا ہو ۔

آئین کی رو سے سپریم کورٹ کا جج ۶۵ سال کی عمر تک اپنے عہدے پر فائز رہ سکتا ہے، لیکن کوئی بھی جج اپنی مرضی سے کسی وقت بھی مستعفی ہو سکتا ہے ۔ سپریم جوڈیشل کونسل کی تحقیقاتی رپورٹ کے بغیر کسی جج کو برطرف نہیں کیا جا سکتا، کونسل کی کارروائی یا جج کی برطرفی کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا ۔

سپریم کورٹ :

عدلیہ کے پورے نظام میں سپریم کورٹ کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ عدالت عالیہ نہ صرف آئین کی تشریح کرتی ہے، بلکہ وہ مجالس قانون ساز کے بنائے ہوئے قوانین اور حکومت کے مختلف شعبوں کے احکام اور اقدامات کی آئینی حیثیت کو بھی جانچنے کی مجاز ہے۔ آئین کے منافی قوانین کو مسترد کرنے کے اختیار کے باعث سپریم کورٹ کو آئین کا محافظ قرار دیا جا سکتا ہے۔ سپریم کورٹ کو ہائی کورٹ کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت کا اختیار حاصل ہے۔ اگر حکومت کا کوئی کارندہ یا عہدے دار یا عام شہری دستور کی خلاف ورزی کرے تو سپریم کورٹ ایسے اقدام یا حکم نامے کو غیر قانونی قرار دے سکتی ہے۔ عدل و انصاف کے قیام کی خاطر سپریم کورٹ کسی بھی زیر سماعت مقدمے کے سلسلے میں خاص ہدایات یا احکام جاری کر سکتی ہے۔ اس مقصد کی خاطر وہ کسی بھی شخص یا دستاویز کی فراہمی کا حکم جاری کر سکتی ہے۔ اس قسم کی تمام ہدایات اور احکام کا اطلاق پورے ملک میں ہوگا۔

سپریم کورٹ کو مختلف قسم کے احکام جاری کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے، چنانچہ عدالت بنیادی حقوق کے نفاذ کے ضمن میں مفاد عامہ کے نکتہ نظر سے کسی مسئلے پر ایسا حکم جاری کر سکتی ہے۔ سپریم کورٹ اپنے کسی فیصلہ پر جاری کیے گئے احکام پر نظرثانی کا حق رکھتی ہے، لیکن ایسا کرتے وقت اسے پارلیمنٹ کے کسی قانون یا خود اپنے بنائے ہوئے ضوابط کو بھی مد نظر رکھنا ہوگا۔ سپریم کورٹ کے ایسے تمام فیصلوں کی پابندی ماتحت عدالتوں پر واجب ہوگی جو قانونی نکات کی تشریح سے متعلق ہوں گے۔ پاکستان کے اندر تمام عدالتی اور انتظامی افسران اور حکام سپریم کورٹ کی ہر طرح معاونت کرنے کے پابند ہوں گے۔

سپریم کورٹ کا صدر دفتر اسلام آباد میں قائم کیا گیا ہے، لیکن اس کے اجلاس ملک کے دوسرے شہروں میں بھی منعقد کیے جا سکتے ہیں۔

صوبائی حکومت کا ڈھانچہ

مرکزی حکومت کی طرح ہر صوبائی حکومت کے بھی تین بنیادی شعبے مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ ہیں۔

۱۔ صوبائی مقننہ :

پاکستان چار صوبوں پر مشتمل ہے، ہر صوبے کی اپنی اپنی اسمبلی ہے۔ اسمبلیوں کی عام نشستوں کی تفصیل حسب ذیل ہے :

صوبہ پنجاب	۲۴۰
صوبہ سرحد	۸۰
صوبہ سندھ	۱۰۰
صوبہ بلوچستان	۴۰

ان نشستوں کے علاوہ صوبائی اسمبلیوں میں خواتین اور اقلیتوں کے لیے نشستیں مخصوص کر دی گئی ہیں۔ ان کا انتخاب متعلقہ صوبائی اسمبلی کے ارکان کریں گے - ان نشستوں کے لیے انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہوں گے - صوبائی اسمبلی کی رکنیت کے لیے شرائط یہ ہیں :

(الف) پاکستان کا شہری ہو -

(ب) کم از کم عمر ۲۵ سال ہو -

(ج) امیدوار کا نام صوبائی اسمبلی کی انتخابی فہرست میں درج ہو -

(د) علاوہ ازیں ان تمام شرائط کو پورا کرکے جو پارلیمنٹ قوانین کے ذریعے وقتاً فوقتاً عائد کر دے -

صوبائی اسمبلی پانچ سال کے لیے منتخب کی جاتی ہے، یہ مدت اس کے پہلے اجلاس کے پہلے دن شروع ہوتی ہے - مقررہ مدت گزر جانے کے بعد اسمبلی خود بخود ختم ہو جاتی ہے، لیکن اس مدت کے مکمل ہونے سے قبل بھی اسے توڑا جاسکتا ہے - انتخاب مکمل ہونے کے بعد اسمبلی اپنا سپیکر اور ڈپٹی سپیکر چنتی ہے - سپیکر صوبائی اسمبلی کی صدارت کرتا ہے اور اسمبلی میں نظم و ضبط قائم رکھنے کا ذمہ دار ہوتا ہے - آئین کے مطابق اسمبلی کے سال بھر میں کم از کم دو اجلاس ضرور ہونے چاہییں - جن میں وقفہ ۱۲۰ دن سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے - اسمبلی کو سال بھر میں کم از کم ۱۳۰ دن ضرور کام کرنا چاہیے -

آئین کے اندر رہ کر صوبائی قانون سازی کا مکمل اختیار صوبائی اسمبلی کو حاصل ہے - صوبائی کابینہ قانون سازی میں اسمبلی کی رہنمائی کرتی ہے اور اکثر و بیشتر مسودات قانون حکومت کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں - اسمبلی نئے قانون بنانے کے علاوہ موجودہ قوانین میں بھی ترمیم کرنے کی مجاز ہے - صوبائی اسمبلی کوئی ایسا قانون بنانے کی مجاز نہیں جو وفاقی قانون سے متصادم ہو - اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو وفاقی قانون کو صوبائی قانون پر ہر حالت میں فوقیت حاصل ہوگی - اسمبلی کے ممبران وزیروں سے سوالات کر سکتے ہیں اور حکومتی پالیسی کا تنقیدی جائزہ لے سکتے ہیں - ممبران کو قراردادیں اور تحریک التوا پیش کرنے کا حق حاصل ہے -

صوبائی اسمبلی کو صوبائی مالیات پر پورا کنٹرول حاصل ہے - صوبائی حکومت ہر سال پورے صوبے کی آمدنی اور خرچ کا تخمینہ بجٹ کی صورت میں اسمبلی کے سامنے پیش کرتی ہے، صوبائی اسمبلی کو اسے منظور کرنے، مسترد کرنے یا اس میں ترمیم کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے - صوبائی اسمبلی کی منظوری کے بغیر نہ تو صوبائی خزانہ سے کوئی رقم خرچ کی جا سکتی ہے اور نہ ہی کوئی نیا ٹیکس لگایا جا سکتا ہے -

۲۔ صوبائی انتظامیہ :

صوبائی حکومت کا سربراہ گورنر ہوتا ہے جس کا تقرر صدر مملکت کرتا ہے۔ گورنر کے عہدہ کی میعاد مقرر نہیں، وہ اس وقت تک اپنے عہدے پر فائز رہ سکتا ہے جب تک اسے صدر کا اعتماد حاصل رہے، صدر کسی وقت بھی وجہ بتائے بغیر گورنر کو برطرف کر سکتا ہے۔ گورنر خود چاہے تو کسی وقت بھی مستعفی ہو سکتا ہے۔ عہدہ سنبھالنے سے قبل گورنر کو متعلقہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے سامنے اپنے عہدے کا حلف اٹھانا پڑتا ہے۔ صوبائی گورنر صرف ایسے شخص کو مقرر کیا جا سکتا ہے جو قومی اسمبلی کا رکن بننے کی اہلیت رکھتا ہو اور جس کی عمر کم از کم ۳۵ برس ہو۔

گورنر صوبے کا آئینی سربراہ ہوتا ہے وہ اپنے اختیارات کا استعمال وزیر اعلیٰ کے مشورے سے کرتا ہے۔ دستور کے مطابق گورنر کو وقتاً فوقتاً اسمبلی کا اجلاس بلانے اور اس کے مقام اور وقت کا تعین کرنے کا اختیار حاصل ہے وہ اسمبلی کو خطاب بھی کر سکتا ہے اور وزیر اعلیٰ کے مشورے سے اسے توڑ بھی سکتا ہے۔ صوبائی اسمبلی کے پاس شدہ بل توثیق کے لیے گورنر کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر اسمبلی کا اجلاس نہ ہو رہا ہو اور حالات کسی قانون کا تقاضا کریں تو گورنر اس سلسلے میں آرڈی نینس جاری کرنے کا مجاز ہے، لیکن یہ آرڈی نینس صرف تین ماہ تک نافذ رہ سکتا ہے۔ گورنر کسی ایسے شخص کو جو ہائیکورٹ کا جج بننے کی اہلیت رکھتا ہو، ایڈووکیٹ جنرل مقرر کر سکتا ہے۔ دستور کے مطابق ہائی کورٹ کے جج مقرر کرتے وقت صدر مملکت صوبائی گورنر کے مشورے کا پابند ہے۔ گورنر کو تنخواہ، الاؤنس، رہائش اور اسی قسم کی دیگر مراعات کے علاوہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کیے ہوئے اقدامات کے خلاف قانونی تحفظ حاصل ہے۔ صوبائی گورنر کے خلاف اس کی میعاد عہدہ کے دوران کسی بڑی عدالت میں فوجداری مقدمہ درج نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کوئی عدالت اسے گرفتار کرنے کے سلسلے میں کوئی کارروائی کرنے کی مجاز ہے۔

وزیر اعلیٰ :

صوبائی حکومت میں اصل اختیارات وزیر اعلیٰ کو حاصل ہوتے ہیں، جو صوبائی اسمبلی میں قائد ایوان بھی ہوتا ہے۔ وزیر اعلیٰ کو صوبائی اسمبلی منتخب کرتی ہے، اور وہ اس وقت تک اپنے عہدے پر فائز رہ سکتا ہے جب تک اُسے صوبائی اسمبلی کے ممبران کی اکثریت کی حمایت حاصل رہے۔ وزیر اعلیٰ عہدہ سنبھالنے سے قبل گورنر کے سامنے حلف اٹھاتا ہے۔ وزیر اعلیٰ اسمبلی کے ممبران میں سے صوبائی کابینہ کے لیے وزراء کا انتخاب کرتا ہے اور وہی ان کے درمیان محکموں کی تقسیم کرتا ہے۔ یہ وزراء وزیر اعلیٰ کے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ کابینہ اجتماعی طور پر صوبائی اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔ صوبائی اسمبلی چاہے تو وزیر اعلیٰ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور کرکے اسے اس کے عہدے سے علیحدہ کر سکتی ہے۔ عدم اعتماد کی قرارداد منظور کرنے کا طریق کار وہی ہے، جو وزیر اعظم کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد کے سلسلے میں بیان کیا جا چکا ہے۔ وزیر اعلیٰ خود

چاہے تو تحریری طور پر اپنا استعفیٰ گورنر کو پیش کر کے سبکدوش ہو سکتا ہے۔ وزیر اعلیٰ کی علیحدگی سے تمام کابینہ بھی خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

صوبے کے تمام انتظامی اختیارات وزیر اعلیٰ اور اس کی کابینہ کو حاصل ہوتے ہیں، اگرچہ انہیں گورنر کے نام سے استعمال کیا جاتا ہے۔ صوبے میں وزیر اعلیٰ کے فرائض و اختیارات تقریباً وہی ہوتے ہیں جو مرکز کے ضمن میں وزیر اعظم کو حاصل ہوتے ہیں۔ قانون سازی کے ضمن میں بھی وزیر اعلیٰ کی مرضی کو بڑا دخل حاصل ہے۔ قائد ایوان ہونے کی حیثیت سے کوئی بل وزیر اعلیٰ کی مرضی کے خلاف پاس نہیں ہو سکتا۔ وزیر اعلیٰ صوبائی اسمبلی توڑنے کے لیے گورنر کو مشورہ دے سکتا ہے، اگر وہ وزیر اعلیٰ کے مشورے پر عمل نہ بھی کرے تو اڑتالیس گھنٹوں کے بعد اسمبلی خود بخود ٹوٹ جاتی ہے۔ اپنے سرکاری فرائض کی انجام دہی اور اختیارات کے استعمال کے سلسلہ میں وزیر اعلیٰ کسی عدالت کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا۔

۳- صوبائی عدلیہ :

صوبے کی اعلیٰ عدالت کو ہائی کورٹ کہتے ہیں۔ ہر صوبے میں ایک ہائیکورٹ ہوتی ہے۔ ہر ہائیکورٹ ایک چیف جسٹس اور چند دیگر ججوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کی تعداد کا تعین قانون کے ذریعے دیا جاتا ہے۔ آئین کے مطابق ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کا تقرر صدر مملکت، چیف جسٹس آف پاکستان اور متعلقہ صوبے کے گورنر کے مشورے سے کرتا ہے۔ دوسرے ججوں کا تقرر متعلقہ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس اور گورنر کے مشورے سے کیا جاتا ہے۔ ہائیکورٹ کا جج مقرر ہونے کے لیے درج ذیل شرائط پر پورا اترنا لازمی ہے۔

(۱) پاکستان کا شہری ہو۔

(۲) عمر چالیس سال سے کم نہ ہو اور کم از کم دس سال تک ہائیکورٹ کا ایڈووکیٹ رہا ہو یا کم از کم دس سال تک سول سروس میں رہا ہو، جس میں سے کم از کم تین سال ڈسٹرکٹ جج یا سیشن جج رہا ہو۔

ہائیکورٹ کا چیف جسٹس صوبائی گورنر کے سامنے اور دوسرے جج چیف جسٹس کے سامنے اپنے عہدے کا حلف اٹھاتے ہیں۔ ہائیکورٹ کے جج کے لیے عمر کی حد باسٹھ سال رکھی گئی ہے۔ البتہ وہ خود چاہے تو اس سے پہلے بھی مستعفی ہو سکتا ہے۔ اگر کسی ہائیکورٹ کا چیف جسٹس بیمار ہو، چھٹی پر ہو یا کسی وجہ سے اپنے فرائض کی ادائیگی کے قابل نہ ہو تو سب سے سینیئر جج کو قائمقام چیف جسٹس مقرر کر دیا جاتا ہے۔

اختیارات و فرائض

ہائیکورٹ صوبے کی سب سے بڑی عدالت ہے، جس کے پاس عدالتی اور انتظامی نوعیت کے مقدمات

آتے ہیں - اس سلسلے میں اسے وسیع اختیارات حاصل ہیں - یہ شہریوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ کرتی ہے - اگر کسی فرد کا حق سلب ہو گیا ہے تو اس کی درخواست پر اسے اس کا حق دلاتی ہے - اگر کسی فرد کو ناجائز حراست میں رکھا گیا ہو یا وجہ بتائے بغیر گرفتار کر لیا گیا ہو یا مقدمہ چلائے بغیر سزا دی گئی ہو تو اس کی جانب سے کوئی شخص ہائیکورٹ کی طرف رجوع کرکے مبنی بر انصاف فیصلہ کرا سکتا ہے -

اگر ہائیکورٹ محسوس کرے کہ کوئی ماتحت عدالت ایسے مقدمہ کی سماعت کر رہی ہے جس کی سماعت کا اسے اختیار حاصل نہیں تو وہ اسے اس مقدمہ کے سماعت نہ کرنے کا حکم صادر کر سکتی ہے - اسی طرح اگر مرکزی، صوبائی یا مقامی اتھارٹی کا کوئی ملازم سرکاری فرائض کے ضمن میں اپنے اختیارات سے تجاوز کرے تو ہائیکورٹ اس کی کارروائی غیرقانونی قرار دےکر غیرمؤثر بنا سکتی ہے -

ہائیکورٹ کو اپنے صوبے کی تمام دیوانی اور فوجداری عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں سننے کا اختیار حاصل ہے - اگر کسی مجرم کو سیشن کورٹ کی طرف سے موت کی یا عمر قید کی سزا دی گئی ہو تو اپیل نہ کرنے کے باوجود سیشن کورٹ کے فیصلے پر ہائیکورٹ نظرثانی کرتی ہے - ہائیکورٹ ماتحت عدالتوں کے کام کی نگرانی کرتی ہے - اس کے روزمرہ کے کام کے بارے میں قواعد و ضوابط مرتب کرتی ہے اور وقتاً فوقتاً انھیں ہدایات جاری کرتی رہتی ہے - ہائیکورٹ کے فیصلے ماتحت عدالتوں کے لیے قانون کا درجہ رکھتے ہیں اور اسی نوعیت کے مقدمات کے فیصلے کرتے وقت ماتحت عدالتیں انھیں بطور نظیر سامنے رکھتی ہیں - ہائیکورٹ کے فیصلوں کے خلاف صرف سپریم کورٹ میں ہی اپیل کی جا سکتی ہے -

سوالات

۱- تمدنی زندگی کی اہمیت بیان کیجیے اور وضاحت کیجیے کہ انسان کو "سماجی مخلوق" کیوں کہا جاتا ہے -

۲- "موجودہ جمہوری نظام میں رائے عامہ کو فیصلہ‌کن اہمیت حاصل ہے" وضاحت کیجیے -

۳- جمہوریت کسے کہتے ہیں، اس کی اقسام بیان کیجیے -

۴- فلاحی ریاست سے کیا مراد ہے ؟ اس میں معاشرتی عدل کی کیا اہمیت ہے ؟

۵- فلاحی ریاست کے مقاصد بیان کیجیے -

۶- حقوق سے کیا مراد ہے ؟ شہریوں کے چند بنیادی حقوق بیان کیجیے -

۷- فرائض سے کیا مراد ہے ؟ ریاست کی طرف سے شہری پر کون کون سے فرائض عاید ہوتے ہیں ؟

۸- معاشرے سے کیا مراد ہے ؟ فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق کی وضاحت کیجیے -

۹- معاشرہ فرد کی صلاحیتوں کی جلا بخشتا ہے اور معاشرتی ضروریات انسان کی روحانی اور مادی ترقی کا سبب بنتی ہیں - وضاحت کیجیے -

۱۰- رفاہی اداروں سے کیا مراد ہے اور ان کی کتنی قسمیں ہیں ؟

۱۱- اسلامی تصور حاکمیت سے کیا مراد ہے ؟ اسلامی قانون کے مآخذ بیان کیجیے -

۱۲- آزادی کی تعریف کیجیے - نیز آزادی کی مختلف اقسام کی تشریح کیجیے -

۱۳- مقامی حکومت خود اختیاری سے کیا مراد ہے ؟ مقامی حکومت کے ڈھانچہ کی تشریح کیجیے -

۱۴- میونسپل کمیٹی کی تشکیل اور اس کے فرائض بیان کیجیے -

۱۵- "صحت اور صفائی کا چولی دامن کا ساتھ ہے" وضاحت کیجیے -

۱۶- صحت عامہ برقرار رکھنے میں حکومت کے فرائض اور افراد کی ذمہ داریوں پر تبصرہ کیجیے -

۱۷- "قرارداد مقاصد" پاکستان کی دستور سازی کی تاریخ میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے - وضاحت کیجیے -

۱۸- پاکستان میں دستوری ارتقاء کی تاریخ مختصر طور پر بیان کیجیے -

۱۹- ۱۹۷۳ء کے آئین میں شامل اسلامی دفعات پر مفصل تبصرہ کیجیے -

۲۰- اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ۱۹۷۳ء کے آئین کی نمایاں خصوصیات بیان کیجیے -

۲۱- نئے آئین کے تحت کابینہ کی تشکیل اور فرائض کی وضاحت کیجیے -

۲۲- قومی اسمبلی کی تنظیم اور فرائض پر بحث کیجیے -

۲۳- سینٹ کے ارکان کے طریق انتخاب اور فرائض پر روشنی ڈالیے -

۲۴- پارلیمنٹ میں قانون سازی کے طریق کار کی وضاحت کیجیے -

۲۵- پاکستان کی سپریم کورٹ کی تنظیم اور دائرہ اختیار پر بحث کیجیے -

۲۶- صوبائی گورنر کے طریق تقرر ، شرائط عہدہ اور دائرہ اختیارات کا تفصیلاً جائزہ لیجیے -

۲۷- صوبائی کابینہ کی تشکیل اور اختیارات پر روشنی ڈالیے -

۲۸- صوبائی اسمبلی کی تنظیم اور فرائض کا تفصیلی جائزہ لیجیے -

ساتواں باب

برصغیر پاک و ہند

محل وقوع

براعظم ایشیا کے نقشے پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ اس براعظم کے جنوبی حصے میں ایک وسیع مثلث نما سرزمین پھیلی ہوئی ہے ۔ اس سرزمین کو برصغیر پاک و ہند کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ یہ برصغیر بھارت، بنگلہ دیش، نیپال، پاکستان اور متنازعہ ریاست جموں و کشمیر پر مشتمل ہے ۔ وسعت کے لحاظ سے برصغیر پاک و ہند ۸ درجے عرض بلد شمالی سے ۳۷ درجے عرض بلد شمالی اور ۶۱ درجے طول بلد مشرق سے ۹۲.۵ درجے طول بلد مشرق کے درمیان پھیلا ہوا ہے ۔

حدود اربعہ

برصغیر پاک و ہند کے شمال مشرق میں عوامی جمہوریہ چین، مشرق میں برما، مغرب میں افغانستان اور ایران اور جنوب میں بحر ہند واقع ہے ۔ بحر ہند کے مشرقی حصے کو خلیج بنگال اور مغربی حصے کو بحیرہ عرب کہتے ہیں ۔

برصغیر پاک و ہند میں پاکستان کا محل وقوع

پاکستان برصغیر کے مغربی اور شمال مغربی حصے پر مشتمل ہے ۔ وسعت کے اعتبار سے پاکستان ۶۱ درجے سے ۷۵.۵ درجے طول بلد مشرق اور ۲۳.۵ درجے سے ۳۶.۷۵ درجے عرض بلد شمالی کے درمیان پھیلا ہوا ہے یعنی اس کا بیشتر حصہ منطقہ معتدلہ میں واقع ہے ۔ اس کے شمال مشرق میں چین، جنوب مشرق میں بھارت، بحیرہ عرب اور مغرب میں افغانستان اور ایران واقع ہیں ۔

طبعی حالات

طبعی حالات کا انسانی زندگی پر بڑا اثر ہوتا ہے ۔ لوگوں کی بود و باش، خورد و نوش، ذرائع معاش، کام کاج اور تہذیب و تمدن پر اس کی گہری چھاپ ہوتی ہے، لہذا کسی سر زمین کے حالات بیان کرنے سے پہلے اس کے طبعی حالات اور جغرافیائی خصوصیات کا علم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے ۔ طبعی خصوصیات کے لحاظ سے برصغیر پاک و ہند کو مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

(۱) شمالی پہاڑ اور اس کی مشرقی اور مغربی شاخیں ۔

(۲) شمالی میدان ۔

(۳) سطح مرتفع -
(۴) ساحلی میدان -
(۵) صحرا -

۱- شمالی پہاڑ اور اس کی مشرقی اور مغربی شاخیں

برصغیر پاک و ہند کے شمال میں ایک وسیع سلسلہ کوہ مسلسل دیوار کی صورت میں تقریباً ۲۵۶۰ کلو میٹر تک پھیلا ہوا ہے جسے کوہ ہمالیہ کہتے ہیں - یہ پہاڑ دنیا میں سب سے اُونچا پہاڑ ہے - ان پہاڑوں کی اوسط اونچائی تقریباً پانچ کلومیٹر اور اوسط چوڑائی تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر ہے - کوہ ہمالیہ پہاڑوں کی صرف ایک قطار نہیں، بلکہ اس میں تین متوازی قطاریں ہیں جو ایک دوسرے کے پیچھے اونچی اٹھتی چلی گئی ہیں -

اگر ہم جنوب کی طرف سے کوہ ہمالیہ کا رخ کریں تو پہلے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ملے گا - یہ پہاڑیاں سطح سمندر سے ۶۰۰ سے ۱۵۰۰ کلومیٹر تک اونچی ہیں - انھیں "کوہستان شوالک" یا "تلہٹی کے پہاڑ" کہتے ہیں - پہاڑوں کا دوسرا سلسلہ "ہمالیہ صغیر" کہلاتا ہے - یہ پہاڑ سطح سمندر سے پندرہ ہزار فٹ تک اونچے ہیں - پاکستان کا بیشتر پہاڑی علاقہ انھی سلسلوں میں واقع ہے - برصغیر کے صحت افزا مقامات شملہ، ڈلہوزی، مسوری، ڈیرہ دون، نینی تال، دارجلنگ، مری، ایوبیہ اور نتھیا گلی وغیرہ انھی سلسلوں میں واقع ہیں - ان پہاڑوں کو عبور کرکے شمال کی طرف بڑھیں تو "ہمالیہ کبیر" کا عظیم الشان سلسلۂ کوہ شروع ہو جاتا ہے، جس کی اوسط بلندی بیس ہزار فٹ سے بھی زیادہ ہے - اس کی چوٹیاں سارا سال برف سے ڈھکی رہتی ہیں - اسی سلسلے میں دنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ بھی ہے - جو ۸۲۲۰۳ میٹر بلند ہے - اس سلسلے کی دوسری مشہور چوٹیاں ماؤنٹ کن چن چنگا، گڈون آسٹن، نانگا پربت، دھونگری اور نندا دیوی ہیں - کوہ ہمالیہ کے شمال مغرب میں کوہ قراقرم کے بلند پہاڑی سلسلے ہیں، جو جموں و کشمیر کے شمالی حصے اور گلگت میں پھیلے ہوئے ہیں - ان سلسلوں میں دنیا کی دوسرے نمبر پر کی بلند چوٹی "کے - ٹو" واقع ہے جس کی بلندی ۸۴۷۵ میٹر ہے - ہمالیہ کبیر کے شمال کی طرف کوہ لداخ کا پہاڑی سلسلہ ہے جو نسبتاً کم بلند ہے - مزید شمال میں سطح مرتفع تبت واقع ہے - جو سطح سمندر سے تقریباً بارہ ہزار فٹ بلند ہے -

پہاڑوں کی یہ دیوار برصغیر کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے - موسم سرما میں وسط ایشیا سے جو سرد ہوائیں چلتی ہیں، ان پہاڑوں کی وجہ سے برصغیر ان سے بچا رہتا ہے - گرمیوں میں جنوب مغرب کی طرف سے جو مون سون ہوائیں چلتی ہیں یہ پہاڑ ان کا راستہ روک کر میدانی علاقوں میں بارش برسانے کا سبب بنتے ہیں - برصغیر کے مشہور دریا بھی انھی پہاڑوں سے نکلتے ہیں -

مشرقی شاخیں

کوہ ہمالیہ کے مشرق سرے سے ایک پہاڑی سلسلہ جنوب کی طرف مڑ جاتا ہے، جو برما اور بھارت

کے درمیان حائل ہے، اسے کوہ اراکان کہا جاتا ہے - اس کے شمالی حصے میں پٹکوئی کے پہاڑ ہیں، جو جنوب کی طرف پھیلتے ہوئے زیادہ فراخ ہوگئے ہیں - یہاں یہ ناگا کی پہاڑیاں اور سطح مرتفع منی پور کہلاتے ہیں - اس پہاڑی سلسلے کی ایک شاخ عموداً مغرب کی طرف پھیلی ہوئی ہے، جو جنتیا، کھاسی اور گارو کی پہاڑیاں کہلاتی ہیں - انھی پہاڑیوں کے سلسلے بنگلہ دیش میں چٹاگانگ تک پھیلے ہوئے ہیں - ان پہاڑیوں پر گرمیوں میں خوب بارش ہوتی ہے - دنیا میں سب سے زیادہ بارش والا مقام چراپونجی اسی سلسلہ کوہ میں کھاسی کی پہاڑیوں پر واقع ہے، جہاں اوسطاً ۱۲۵۰ سینٹی میٹر سالانہ بارش ہوتی ہے - ان پہاڑیوں کی ڈھلانیں گھنے جنگلات سے ڈھکی ہوتی ہیں، جن میں خاص طور پر ساگوان کے درخت پائے جاتے ہیں -

مغربی شاخیں :

پاکستان کی مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ پہاڑوں کے سلسلے شمال سے جنوب کی طرف پھیلے ہوئے ہیں - ان میں کوہ ہندوکش کی شاخیں کوہ سفید، کوہ سلیمان اور کوہ کرتھار شامل ہیں - ان میں شمالی سلسلہ کوہ ہندوکش سے دریائے کابل تک پھیلا ہوا ہے - اس میں دریائے سوات، پنجکوڑا اور کنہار بہتے ہیں - دریائے کابل کے جنوب میں درہ خیبر واقع ہے اور یہاں سے کوہ سفید شروع ہو جاتا ہے - ان کی اوسط بلندی ۳۶۰۰ میٹر ہے - اس سلسلے کے جنوب میں دریائے کرم بہتا ہے، جس کے کنارے کم بلند ہونے کی وجہ سے درے کا کام دیتے ہیں - دریا کی نسبت سے اس درے کا نام درہ کرم ہے - اس کے علاوہ اس میں درہ ٹوچی اور درہ گومل شامل ہیں - دریائے گومل کے جنوب سے کوہ سلیمان کے سلسلے شروع ہو جاتے ہیں - ان سلسلوں کا رخ شمالاً جنوباً ہے - ان سلسلوں کی سب سے بلند چوٹی تخت سلیمان ہے، جس کی بلندی ۳۳۰۰ میٹر ہے، اس سلسلے میں درہ بولان واقع ہے - کوہ سلیمان کے جنوب میں دریائے سندھ کی زیریں وادی کی مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ کوہ کرتھار واقع ہے - یہ کم بلند اور خشک پہاڑ ہے، ان کی بلندی ۲۱۰۰ میٹر ہے - مغربی سلسلہ کوہ کے تمام پہاڑ بنجر ہیں، کیونکہ یہاں بارش کم ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہاں درخت کم پائے جاتے ہیں، البتہ چھوٹی چھوٹی گھاس اُگتی ہے جس پر بھیڑ، بکری اور اُونٹ پالے جاتے ہیں -

۲- شمالی میدان :

اس میں دریائے گنگا کا میدان اور دریائے سندھ کا میدان ہیں - یہ میدان شمال میں کوہ ہمالیہ سے جنوب میں کوہ بندھیا چل تک اور مشرق میں کوہ لوشائی سے مغرب میں کوہ سلیمان تک پھیلا ہوا ہے - اس میدان کے پاکستانی حصے کو دریائے سندھ اور اس کے معاون سیراب کرتے ہیں اور بھارتی حصے میں دریائے گنگا، اس کے معاون اور برہم پتر بہتے ہیں - یہ تمام دریا ہمالیہ کے پہاڑوں سے نکلتے ہیں اور سارا سال بہتے رہتے ہیں - یہ میدان اس زرخیز مٹی سے بنا ہوا ہے، جو اس میں بہنے والے دریا ہزاروں سال سے لاکر اس میں بچھا رہے ہیں - اس میدان میں بارش بھی کافی ہوتی ہے، لہٰذا یہاں ہر قسم کی زرعی پیداوار

کثرت سے ہوتی ہے۔ آبادی بہت گنجان ہے۔ ذرائع آمد و رفت بہت آسان ہیں۔ اس لیے اس میں ریلوں اور سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ برصغیر کے بڑے بڑے شہر زیادہ تر اسی حصے میں واقع ہیں۔

۳- سطح مرتفع

برصغیر میں سطح مرتفع دو حصوں پر مشتمل ہے:

(الف) سطح مرتفع دکن۔

(ب) سطح مرتفع پوٹھوہار اور بلوچستان۔

(الف) سطح مرتفع دکن:

شمالی ہند کے میدان کے جنوب میں بھارت کا تقریباً تمام علاقہ سطح مرتفع ہے جو ایک ہزار سے تین ہزار فٹ بلند ہے۔ سطح مرتفع دکن کے مشرقی کنارے کو مشرقی گھاٹ اور مغربی کنارے کو مغربی گھاٹ کہتے ہیں۔ مغربی گھاٹ کے پہاڑی سلسلے کی چوٹیاں ڈیڑھ ہزار میٹر سے بھی زیادہ اونچی ہیں۔ مشرقی گھاٹ نسبتاً کم بلند ہے۔ جنوب کی طرف سطح مرتفع کی بلندی بڑھتی جاتی ہے، حتیٰ کہ میسور میں نیلگری کے پہاڑ نو ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ سطح مرتفع ناہموار اور نشیب و فراز سے معمور ہے۔ سطح مرتفع دکن کے مشہور دریا گوداوری، مہاندی، کرشنا، کاویری، نربدا اور تاپتی ہیں جو تیز رفتار ہیں اور آبشاریں بناتے ہیں۔ یہاں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ آب و ہوا سارا سال گرم اور یکساں ہے۔ زمین عام طور پر پتھریلی ہے، اس لیے پیداوار کم ہوتی ہے۔ البتہ اس کے شمال مغربی حصے میں سیاہ مٹی کی تہہ دیسی کپاس کے لیے خاص طور پر مفید ہے۔ یہ مٹی لاوے سے بنی ہے جس کی موٹی تہہ پرانے وقتوں سے اس حصے کو ڈھانپے ہوئے ہے۔

(ب) سطح مرتفع پوٹھوہار اور بلوچستان:

دریائے جہلم اور دریائے سندھ کے درمیان کوہستان نمک اور سطح مرتفع پوٹھوہار واقع ہے۔ کوہستان نمک کی عام بلندی ۶۶۰ میٹر سے ۱۵۰۰ میٹر تک جا پہنچتی ہے۔ کوہستان نمک کا ایک حصہ دریائے سندھ سے پار تک بھی چلا گیا ہے۔ اس پہاڑ میں نمک کے بہت سے ذخیرے موجود ہیں، اس کے علاوہ جپسم، کوئلہ اور دوسری معدنیات بھی پائی جاتی ہیں۔ کوہستان نمک اور شمال مغربی پہاڑوں کے درمیان سطح مرتفع پوٹھوہار واقع ہے، اس سطح مرتفع کی بلندی ۵۰۰ میٹر ہے۔ اس علاقے میں بہنے والے ندی نالوں نے اس میں بہت سے کٹاؤ پیدا کر دیے ہیں۔ یہاں بہت سے پتھر ہر طرف بکھرے پڑے ہیں، اس سطح مرتفع میں دو اہم دریا سون اور ہرو ہیں۔

کوہ سلیمان اور کوہ کرتھار کے مغرب میں سطح مرتفع بلوچستان واقع ہے۔ اس سطح مرتفع میں چند پہاڑی سلسلے شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سلسلوں میں زیارت اور مسلم باغ کی چوٹیاں زیادہ بلند ہیں۔ سطح مرتفع بلوچستان کا شمال مغربی حصہ ریگستان ہے۔ یہاں نمکین

پانی کی ایک بڑی جھیل ہے جس کا نام ہامون شحیل ہے، یہاں کے دریا مستقل نہیں ہیں - شمال مشرق میں پہاڑی سلسلے جنوب کی نسبت زیادہ بلند ہیں، ان میں کوئلہ، لوہا، کرومیم، کرومائیٹ اور قدرتی گیس کے ذخیرے بہت اہم ہیں -

۴- ساحلی میدان :

سطح مرتفع دکن کے دونوں طرف مغربی گھاٹ اور مشرقی گھاٹ اور سمندر کے درمیان ایک تنگ اور ہموار میدان ہے، جسے ساحلی میدان کہتے ہیں، اس میدان کی مٹی بھی گنگا اور سندھ کے میدان کی طرح نرم اور زرخیز ہے اس کے دو حصے ہیں - ایک مغربی ساحلی میدان اور دوسرا مشرقی ساحلی میدان - مغربی ساحلی میدان، مغربی گھاٹ اور بحیرہ عرب کے درمیان واقع ہے - اس کے شمالی حصے کو کونکن اور جنوبی حصے کو مالا بار کہتے ہیں - اس میدان کی چوڑائی چالیس میل سے زیادہ نہیں، یہ میدان بڑا زرخیز ہے، یہاں بارش کافی ہوتی ہے - ساحل کے ساتھ ساتھ ناریل بہت ہوتا ہے - آب و ہوا معتدل اور مرطوب ہے اور آبادی کافی گنجان ہے -

مشرقی گھاٹ اور خلیج بنگال کے درمیان مشرقی ساحلی میدان واقع ہے - اس کے شمالی حصے کو شمالی سرکار اور جنوبی حصے کو کرناٹک کہتے ہیں - یہ میدان مغربی ساحلی میدان سے نسبتاً کم چوڑا ہے، بارش بھی مغربی میدان کی نسبت کم ہوتی ہے - آب و ہوا معتدل ہے، آبادی خاصی ہے -

بنگلہ دیش میں ساحلی میدان دریائے گنگا اور برہم پتر کے ڈیلٹائی علاقے پر مشتمل ہے، یہاں اکثر پانی کھڑا رہتا ہے - سندر بن کے جنگلات اسی علاقے میں پائے جاتے ہیں - پاکستانی ساحل کے ساتھ ساتھ ایک ساحلی میدان ہے، جہاں مد و جزر کے دوران پانی اترتا اور چڑھتا ہے - اس علاقے میں بارش کم ہوتی ہے، بعض جگہوں پر ناریل کے جھنڈ پائے جاتے ہیں -

۵- صحرائے تھار :

پاکستان کے صوبہ سندھ اور بھارت کے صوبہ راجستھان میں ایک وسیع ریگستانی علاقہ واقع ہے، جسے تھار کا صحرا کہتے ہیں، اس میں دور دور تک ریت ہی ریت دکھائی دیتی ہے - موسم گرما میں تیز آندھیاں چلتی ہیں تو ریت کے یہ ٹیلے اپنا رخ تبدیل کر لیتے ہیں - اسی طرح کا ایک ریگستان بھاولپور کے علاقے میں بھی واقع ہے، جسے "چولستان" کہتے ہیں، لیکن اس ریگستان کا کافی حصہ آباد ہو چکا ہے -

آب و ہوا

برصغیر پاک و ہند کا جنوبی حصہ منطقہ حارہ اور باقی حصہ گرم منطقہ معتدلہ میں واقع ہے، اس لیے یہاں کی آب و ہوا بالعموم گرم ہے - درجہ حرارت کے لحاظ سے برصغیر میں دو اہم موسم ہیں - موسم گرما جو اپریل سے ستمبر تک اور موسم سرما جو نومبر سے فروری تک رہتا ہے - مارچ اور اکتوبر میں موسم عام طور پر معتدل رہتا ہے، جس میں نہ زیادہ گرمی ہوتی ہے نہ سردی - موسم گرما کے آخری

تین مہینوں میں بارش ہوتی ہے جس کی وجہ سے موسم قدرے خوشگوار ہو جاتا ہے۔

برصغیر ایک وسیع خطہ اراضی ہے، جس کی آب و ہوا پر دیگر جغرافیائی عوامل بھی اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے آب و ہوا میں ہر جگہ یکسانیت نہیں ہے۔ برصغیر کو آب و ہوا کے لحاظ سے مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ سرد کوہستانی آب و ہوا کا علاقہ:

یہ علاقہ کوہ ہمالیہ اور اس کی مشرق اور مغربی شاخوں پر مشتمل ہے۔ یہاں سردیوں کے موسم میں سخت سردی پڑتی ہے۔ اکثر علاقوں میں شدید برفباری ہوتی ہے اور درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی گر جاتا ہے۔ ان علاقوں میں سردیوں کا موسم بالعموم چھ سے آٹھ ماہ تک رہتا ہے، البتہ موسم گرما معتدل اور خوشگوار ہوتا ہے۔

۲۔ بری آب و ہوا کا علاقہ:

شمالی پہاڑی علاقے کے جنوب میں وسیع میدانی علاقہ ہے، اس کی آب و ہوا شدید قسم کی ہے۔ یعنی گرمیوں میں سخت گرم اور سردیوں میں سخت سرد۔ موسم گرما میں میدانی علاقے خوب گرم ہو جاتے ہیں۔ دن کے وقت لو چلتی ہے اور کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی آندھیاں اور جھکڑ بھی چلتے ہیں۔ گرمی کی وجہ سے ہوا گرم ہوکر اوپر کی طرف اٹھتی ہے اور یہاں کم دباؤ والا علاقہ پیدا ہو جاتا ہے، اس لیے سمندر کی طرف سے ہوائیں بڑی تیزی سے میدانی علاقے کی طرف بڑھتی ہیں۔ یہ ہوائیں بخارات سے لدی ہوتی ہیں اور کوہ ہمالیہ سے ٹکرا کر یہاں خوب بارش برساتی ہیں، جس کی وجہ سے درجہ حرارت میں کچھ کمی آجاتی ہے اور موسم قدرے خوشگوار ہو جاتا ہے۔ سردیوں میں عموماً موسم سرد اور خشک ہوتا ہے، البتہ سرمائی مون سون ہواؤں اور گرد باد کی وجہ سے کبھی کبھی بارش ہو جاتی ہے، لیکن اس بارش کی مقدار گرمیوں میں ہونے والی بارش سے کم ہوتی ہے۔

۳۔ صحرائی آب و ہوا کا علاقہ:

اس میں تھار، تھل اور بلوچستان کا علاقہ شامل ہے۔ یہ ایک لق و دق صحرا ہے، یہاں بحیرہ عرب کی مون سون ہوائیں چلتی ہیں، لیکن کوئی پہاڑ ان کے راستے میں حائل نہیں اس لیے بغیر بارش برسائے آگے گزر جاتی ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا خشک ہے اور خشک ہونے کی وجہ سے گرمیوں کا موسم سخت گرم اور سردیوں کا موسم سخت سرد ہے۔ علاقہ ریتلا ہے، اس لیے دن کو سخت گرمی پڑتی ہے، لیکن راتیں قدرے ٹھنڈی ہوتی ہیں۔

۴۔ مرطوب آب و ہوا کا علاقہ:

اس میں بنگلہ دیش، آسام اور دکن کے علاقے شامل ہیں۔ یہ علاقے سمندر سے زیادہ دور نہیں اور مون سون ہواؤں کی زد میں واقع ہیں، اس لیے یہاں بارش خوب ہوتی ہے۔ خط سرطان بھی ان علاقوں

کے قریب سے گزرتا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر یہاں کی آب و ہوا یکساں اور مرطوب ہے۔ وادی سندھ کا زیریں علاقہ جو ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ ۳۵ کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے، ساحلی آب و ہوا کے زیر اثر ہے۔ نسیم بری اور بحری کی وجہ سے یہاں کا درجہ حرارت بڑھنے نہیں پاتا۔ اس لیے یہاں کی آب و ہوا معتدل ہے، یعنی گرمیوں میں کم گرم اور سردیوں میں کم سرد۔

برصغیر کے وسائل

خالق کائنات نے انسان کو تخلیق کیا تو اس کی ضروریات بھی ساتھ ہی پیدا فرما دیں۔ پھر انسان کو فہم و فراست کا وافر حصہ عطا فرما کر اُسے حکم دیا کہ وہ موجودات عالم پر غور و فکر کرے اور اس کی عطا کردہ نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ قادر مطلق نے اپنی یہ نعمتیں بنی نوع انسان کو بلا تخصیص مذہب و ملت عطا فرمائی ہیں۔ ان نعمتوں کو ہم قدرتی وسائل کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان وسائل میں نباتات، حیوانات، معدنیات، زرعی پیداوار، پانی اور موسم وغیرہ شامل ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کو بھی ان قدرتی وسائل سے وافر حصہ ملا ہے۔ اس باب میں ہم ان وسائل کا مختصر جائزہ لیں گے۔

قدرتی نباتات

قدرتی نباتات کا تفصیلی مطالعہ ایک مشکل امر ہے، کیونکہ زمین کی تاثیر بارش اور درجہ حرارت کے معمولی فرق سے پودوں میں بہت سی جنسی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور علم نباتات ایک پیچیدہ مسئلہ بن جاتا ہے۔ نیز بہت سے گنجان آباد علاقوں سے قدرتی نباتات معدوم ہو چکی ہیں اور انسان اس سر زمین کو کسی دوسرے مصرف میں لے آیا ہے۔ اس لیے قدرتی نباتات کا صحیح جائزہ لینا اور بھی مشکل ہو گیا ہے تاہم یہ ایک مسلم امر ہے کہ آب و ہوا اور جغرافیائی خصوصیات کا نباتات سے گہرا تعلق ہے۔ برصغیر میں چونکہ مختلف قسم کی آب و ہوا اور مختلف جغرافیائی خصوصیات پائی جاتی ہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ مختلف علاقوں میں قدرتی نباتات بھی مختلف قسم کی ہوگی۔

نباتات میں سب سے زیادہ اہمیت جنگلات کو حاصل ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں پر نظر ڈالیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بہترین جنگلات ایسے علاقوں میں پائے جاتے ہیں، جہاں بارش بکثرت ہوتی ہے۔ برصغیر مون سون ہواؤں کے خطے میں واقع ہے اور کوہ ہمالیہ کے جنوبی سلسلوں، اس کی مغربی اور مشرقی شاخوں اور تلہٹی کے علاقوں میں جہاں بارش خوب ہوتی ہے، گھنے جنگلات پائے جاتے ہیں۔ برصغیر کے شمالی پہاڑی علاقے جن کی بلندی ہزار میٹر سے زیادہ ہے اور جہاں ہزار ملی میٹر سے زائد بارش ہوتی ہے وہاں سدا بہار جنگلات پائے جاتے ہیں۔ یہ جنگلات نوکیلے پتوں والے درختوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں زیادہ تر دیودار، کیل، پڑتل، چیل اور صنوبر کے درخت شامل ہیں۔ اس قسم کے جنگلات صوبہ آسام، اتر پردیش، پوربی پنجاب، نیپال، کشمیر، دکن کے مغربی گھاٹ، دیر، سوات، چترال اور مالا کنڈ

میں پائے جاتے ہیں ۔ ان علاقوں میں سدا بہار درختوں کے علاوہ شاہ بلوط، اخروٹ اور کالا کاٹھ کے ملتے جلتے درخت بھی پائے جاتے ہیں، جن کے پتے سردیوں میں جھڑ جاتے ہیں ۔ نچلی ڈھلانوں پر چیری. سنبل. چنار، املتاس اور چوڑے پتوں والے درخت پائے جاتے ہیں ۔

دامن کوہ کے جنگلات :

دامن کوہ کے جنگلات سطح سمندر سے ایک ہزار میٹر کی بلندی تک پائے جاتے ہیں ۔ ان میں زیادہ تر پھلائی، کاہو، جنڈ، ریٹھا، کچنار وغیرہ کے درخت شامل ہیں ۔

میدانی علاقوں کے جنگلات

یہ جنگلات دریائے گنگا کے میدان اور دریائے سندھ کے میدان میں پائے جاتے ہیں ۔ ان جنگلات میں پیپل، شہتوت، شیشم، کیکر ، سرس، آم ، جامن، اخروٹ، سفیدہ ، پاپولر، سنبل، ولو وغیرہ کے درخت پائے جاتے ہیں ۔ خشک موسم میں ان درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں ۔

سخت لکڑی کے سدا بہار جنگلات

یہ جنگلات ایسے گرم علاقوں میں پائے جاتے ہیں جہاں بارش زیادہ ہوتی ہے ۔ ان میں سہاگنی، ساگوان، بانس، سال، کارجان اور سندری کے درخت شامل ہیں ۔ یہ درخت چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں اور گنگا کے ڈیلٹائی علاقوں میں پائے جاتے ہیں ۔

ساحلی جنگلات

ساحلی علاقوں میں سمندر کا پانی مد و جذر کی وجہ سے چڑھتا اور اترتا رہتا ہے ۔ جس کی بدولت یہاں ناریل کے جھنڈ اور گھاس پیدا ہوتی ہے ۔

صحرائی نباتات

برصغیر کے جن علاقوں میں بارش کم ہوتی ہے اور آب و ہوا بھی گرم ہے، وہاں چھوٹے قد کے درخت، خاردار جھاڑیاں اور ناگ پھنی کی بہت سی قسمیں پیدا ہوتی ہیں ۔ اس قسم کی جھاڑیاں سطح مرتفع پوٹھوہار، بلوچستان، سندھ، پوربی پنجاب، راجستھان اور سطح مرتفع دکن میں پائی جاتی ہیں ۔

ذرائع آبپاشی

قدرت نے برصغیر پاک و ہند کو وسیع میدانی علاقوں سے نوازا ہے ۔ یہ میدان دریاؤں کی لائی ہوئی زرخیز مٹی سے بنے ہیں، اس لیے زرعی پیداوار کے لیے بے حد مفید ہیں، لیکن برصغیر کے شمالی اور شمال مشرق پہاڑی علاقوں اور مغربی گھاٹ کو چھوڑ کر باقی علاقوں میں بارش اتنی نہیں ہوتی کہ آبپاشی کے بغیر گزارہ ہو سکے ۔ اس کمی کو دریاؤں نے پورا کر دیا ہے ۔ یہ دریا سارا سال بہتے ہیں ۔ میدانی علاقوں کی زمین نرم اور بتدریج ڈھلوان ہے ۔ اس بنا پر برصغیر میں دنیا کا سب سے بڑا اور بہترین نظام آبپاشی موجود ہے ۔ برصغیر میں آبپاشی کے لیے تین بڑے طریقوں سے کام لیا جاتا ہے ۔ جس میں کنویں،

نہریں اور تالاب شامل ہیں جن کا ذکر درج ذیل ہے ۔

پاکستان کا نظام آبپاشی

۱۔ کنویں

کنویں سے کھیتوں کو سیراب کرنے کا طریقہ بہت پرانا ہے ۔ پاکستان میں یہ زرعی آبپاشی عام طور پر تلہٹی کے علاقوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ یہاں زمین نرم ہے اور پانی کی تہہ بھی زیادہ گہری نہیں ۔ اس لیے کنویں کھودنے میں زیادہ لاگت نہیں آتی، کنویں زیادہ تر گجرات، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، ڈیرہ غازی خاں کے اضلاع اور کابل کی وادی میں لگائے گئے ہیں ۔ آج کل ان کی جگہ ٹیوب ویلوں نے لے لی ہے ۔ جو ان اضلاع میں کثرت سے پائے جاتے ہیں ۔

۲۔ تالاب اور جھیلیں

مغربی پہاڑی علاقوں میں جہاں بارش کم ہوتی ہے وہاں برسات کے دنوں میں ندی نالوں پر چھوٹے چھوٹے بند باندھ کر پانی جمع کر لیا جاتا ہے اور خشک موسم میں اسے آبپاشی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ۔ اب زرعی ترقیاتی کارپوریشن نے وہاں چھوٹے چھوٹے مستقل بند باندھنے کا منصوبہ بنایا ہے جس کے تحت تقریباً ۹۱ بند بنائے جا چکے ہیں ۔ جن سے تقریباً ایک لاکھ ایکڑ زمین سیراب کی جاتی ہے ۔ اس قسم کی آبپاشی بلوچستان، سکیسر اور مغربی پہاڑوں کے دامنی علاقوں میں ہوتی ہے ۔

۳۔ کاریز

آبپاشی کے اس خاص طریقے سے صرف بلوچستان کے بعض حصوں میں کام لیا جاتا ہے ۔ کاریز زمین دوز نالیاں ہیں، جن کے ذریعے پانی دور تک جا پہنچتا ہے ۔ پہاڑوں کے دامنی علاقوں میں کنویں کھود کر پانی جمع کر لیا جاتا ہے اور زمین دوز نالیوں کے ذریعے قابل کاشت زمینوں تک لا کر انہیں سیراب کیا جاتا ہے، اس طریقے کا فائدہ یہ ہے عمل تبخیر کے ذریعے سے پانی بھاپ بن کر ضائع نہیں ہوتا ۔

۴۔ نہریں

نہریں دو قسم کی ہیں ۔ دوامی اور غیر دوامی ۔ ایسی نہریں جن میں سارا سال پانی چلتا رہتا ہے ۔ دوامی نہریں کہلاتی ہیں ۔ یہ نہریں زیادہ تر ایسے دریاؤں سے نکالی گئی ہیں جن میں ہر موسم میں پانی رہتا ہے ۔ صوبہ پنجاب اور صوبہ سندھ کی اکثر نہریں اسی قسم کی ہیں ۔ غیر دوامی نہریں وہ ہیں جو گرمی اور برسات کے مہینوں میں جاری رہتی ہیں، لیکن سردی کے موسم میں دریاؤں میں پانی کی کمی کی وجہ سے بند ہو جاتی ہیں ۔

صوبہ پنجاب کی اہم دوامی نہریں اپر باری دوآب، لوئر باری دواب، اپر چناب، لوئر چناب، اپر جہلم، لوئر جہلم، حویلی، سدھنائی اور ستلج ویلی پروجیکٹ کی نہریں ہیں ۔ ان کے علاوہ سندھ طاس معاہدہ کے تحت منگلا ڈیم اور تربیلا ڈیم سے نکلنے والی نہریں اور سات رابطہ نہریں بھی شامل ہیں ۔

دریائے سندھ کی نہریں

یہ نہریں جناح بیراج، چشمہ بیراج، تونسہ بیراج، گڈو بیراج، سکھر بیراج اور کوٹری بیراج سے نکلتی ہیں - ان نہروں سے اضلاع میانوالی، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان اور صوبہ سندھ کے علاقے سیراب ہوتے ہیں -

پوٹھوہار کے علاقے کی نہریں

اس علاقے میں راول ڈیم، چراہ ڈیم اور سون ڈیم تعمیر کیے گئے ہیں - جن سے نہریں نکال کر پوٹھوہار کے علاقے کو سیراب کیا گیا ہے - نیز راول ڈیم سے اسلام آباد اور راولپنڈی کو پینے کا پانی مہیا کیا گیا ہے -

شمال مغربی سرحدی صوبے کی نہریں

ان میں نہر اپر سوات اور لوئر سوات کے علاوہ وارسک ڈیم، کرم گڑھی پراجیکٹ، ناری بولان پراجیکٹ، ٹانڈا ڈیم پراجیکٹ، گومل کرم پراجیکٹ اور خانپور ڈیم کی نہریں شامل ہیں - ان نہروں سے مردان، پشاور، ہزارہ اور ڈیرہ اسماعیل خان وغیرہ کے علاقوں کو سیراب کیا جاتا ہے -

بنگلہ دیش کا نظام آبپاشی

بنگلہ دیش میں کھیتی باڑی کے لیے پانی کی کوئی کمی نہیں - البتہ اس کے شمال مغربی حصے میں آبپاشی کی ضرورت ہے جس کے لیے درج ذیل منصوبے تیار کیے گئے ہیں -

۱- گنگا کمباڈک پراجیکٹ

یہ پانی کو پمپ کرنے کی ایک سکیم ہے جس کے ذریعے دریائے گنگا سے پانی پمپ کر کے نہر کے ذریعے دریائے کمباڈک میں ڈالا جائے گا - اس سے تقریباً بیس لاکھ ایکڑ زمین کو سیراب کیا جائے گا نیز اس منصوبے میں ایسے پمپ بھی لگائے گئے ہیں جو کھیتوں سے بھی فالتو پانی نکال کر دریا میں پھینکتے ہیں -

۲- تیتا بیراج

دریائے تیتا پر بند باندھ کر نہریں نکالی جائیں گی جس میں تقریباً آٹھ لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہوگی -

۳- کرنافلی پراجیکٹ

اگرچہ یہ پن بجلی کا ایک منصوبہ ہے تاہم یہ بجلی پانی پمپ کرنے کے لیے استعمال کی جائے گی جس سے تقریباً دس لاکھ ایکڑ رقبہ سیراب ہوگا اس کے علاوہ ایک منصوبہ سمندر سے آنے والی لہروں کو روکنے کے لیے اور ایک منصوبہ دریائے برہم پتر کے سیلاب سے بچنے کے لیے بنایا گیا ہے تاکہ فصلوں کو سمندر کے نمکین پانی اور برہم پتر کے سیلاب سے خراب ہونے سے بچایا جا سکے -

زرعی پیداوار

برصغیر کی معیشت کا دارومدار زیادہ تر زراعت پر ہے۔ زرعی پیداوار کا انحصار بڑی حد تک زمین کی نوعیت پر ہے۔ میدانی اور زرخیز زمین کاشت کے لیے زیادہ مفید ہے۔ جب کہ پتھریلی اور بنجر زمین میں زراعت کم ہوتی ہے۔ برصغیر کے مختلف حصوں کی زمین مختلف قسم کی ہے اس میں چکنی، پتھریلی، ریگستانی، دلدلی، ریتلی، میرا وغیرہ قسم کی زمین شامل ہے۔ لہذا برصغیر کی زمین میں مختلف قسم کی پیداوار کی صلاحیت موجود ہے۔ برصغیر میں عام طور پر سال میں دو فصلیں پیدا ہوتی ہیں:

۱۔ فصل ربیع

یہ موسم سرما کی فصل ہے جو سردیوں کے شروع میں بوئی جاتی ہے اور گرمیوں کے شروع میں کاٹ لی جاتی ہے۔ ان میں گیہوں، جو، چنے، سرسوں وغیرہ شامل ہیں۔

۲۔ فصل خریف

یہ فصل گرمیوں کے شروع میں بوئی جاتی ہے اور سردی شروع ہوتے ہی کاٹ لی جاتی ہے۔ ان میں چاول، گنا، کپاس، جوار اور باجرہ شامل ہیں۔

فصلوں کی پیداوار کا انحصار موسم، آب و ہوا، بارش اور زمین کی قسم پر ہے۔ اس لیے مختلف علاقوں میں مختلف قسم کی پیداوار ہوتی ہے۔ برصغیر کی مشہور فصلوں کا حال درج ذیل ہے:

گندم

گندم برصغیر کی اہم فصل ہے اس کی کاشت کے وقت سردی اور پکتے وقت گرمی اور خشکی درکار ہے۔ زیادہ گرمی اور زیادہ نمی اس کے لیے نقصان دہ ہے۔ پاکستان میں پنجاب، سندھ اور سرحد، بھارت میں پوربی پنجاب، اتر پردیش اور مدھیا پردیش، بنگلہ دیش کے شمال مغربی علاقے اور ریاست جموں و کشمیر کے کچھ علاقوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ گندم برصغیر میں کافی مقدار میں پیدا ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود برصغیر اس کے استعمال میں خود کفیل نہیں ہے۔

چاول

اس کے لیے گرم اور مرطوب آب و ہوا کی ضرورت ہے۔ اس کی کاشت موسم برسات میں اور کٹائی سردیوں کے آغاز میں ہوتی ہے۔ چاول کی فصل کے لیے پانی کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ دلدلی مٹی اس کے لیے خاص طور پر موزوں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دریاؤں کے ڈیلٹاؤں میں یہ خوب پھلتا پھولتا ہے چاول کی فصل پاکستان میں صوبہ پنجاب اور سندھ، بھارت میں مغربی بنگال، گوالیار، آسام، پوربی پنجاب، دکن کے ڈیلٹاؤں، مغربی ساحلی میدان اور اتر پردیش میں بنگلہ دیش میں پہاڑی علاقے کو چھوڑ کر تقریباً ہر جگہ پیدا ہوتا ہے اس کے علاوہ نیپال اور سرینگر کی وادی میں بھی چاول کی مخصوص اقسام کی کاشت ہوتی ہے۔

گنا

گنے کے لیے گرم مرطوب آب و ہوا ، زرخیز مٹی اور زیادہ پانی کی ضرورت ہے ۔ یہ پاکستان میں دریائے سندھ کے میدانی علاقے ، بھارت میں پوربی پنجاب ، اتر پردیش ، بہار ، مغربی بنگال اور تامل ناڈ میں اور بنگلہ دیش کے تقریباً تمام علاقے میں پیدا ہوتا ہے ۔ گنے سے کھانڈ تیار ہوتی ہے ۔ نیپال کے علاوہ برصغیر کے تمام ممالک چینی کی ضروریات میں خود کفیل ہو چکے ہیں ۔

مکئی

مکئی کے لیے گرم مرطوب آب و ہوا اور زرخیز زمین درکار ہے ۔ پاکستان میں پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور پہاڑی علاقوں میں، بھارت میں پوربی پنجاب، بہار، اتر پردیش اور دامنی علاقوں میں، بنگلہ دیش ، نیپال اور جموں و کشمیر میں پیدا ہوتی ہے پہاڑی علاقوں میں مکئی بطور انسانی غذا اور باقی علاقوں میں زیادہ تر چارے کے لیے استعمال ہوتی ہے ۔

جوار ، باجرا

جوار، باجرہ خشک، بارانی اور کم زرخیز علاقوں کی پیداوار ہے ۔ ان کی کاشت پاکستان میں زیادہ تر صوبہ سندھ اور صوبہ پنجاب کے بارانی علاقوں میں ، بھارت میں راجستھان اور دکن میں ہوتی ہے پاکستان میں بالعموم چارے کے طور پر کام آتا ہے جب کہ بھارت میں زیادہ‌تر بطور انسانی خوراک استعمال ہوتا ہے ۔

تیل نکالنے کے بیج

تیل نکالنے کے بیجوں میں سرسوں ، تل ، ارنڈ ، السی ، توریا ، بنولے اور مونگ پھلی شامل ہیں ان کے لیے مرطوب آب و ہوا درکار ہے ۔ یہ عام طور پر متوسط درجے کی بارش والے علاقوں میں کاشت کیے جاتے ہیں ۔ اگرچہ ان کی کاشت برصغیر کے تقریباً ہر علاقے میں ہوتی ہے تاہم بنگلہ دیش ، بھارت کے صوبہ بہار ، مغربی بنگال اور پوربی پنجاب ، پاکستان میں راولپنڈی، میانوالی ، جہلم اور گجرات کے اضلاع میں ان کی کاشت زیادہ ہوتی ہے ۔

تمباکو

اس کے لیے زرخیز مٹی اور گرم مرطوب ہوا کی ضرورت ہے ۔ بنگلہ دیش، پاکستان میں صوبہ سرحد اور پنجاب ، بھارت میں پوربی پنجاب ، بہار ، مغربی بنگال ، اتر پردیش اور تامل ناڈ میں پیدا ہوتا ہے ۔

چائے

چائے کے لیے گرم مرطوب آب و ہوا اور ڈھلان زمین درکار ہے اس کی کاشت پہاڑوں کی ڈھلانوں پر ہوتی ہے جہاں بارش کافی ہو، لیکن پانی پودوں کی جڑوں میں نہ ٹھہر سکے ۔ بھارت کے صوبہ آسام، دارجلنگ ، ڈیرہ دون ، کانگڑہ ، پالم پور ، نیلگری کی پہاڑیوں ، میسور ، ٹراونکور اور چھوٹا ناگپور ،

بنگلہ دیش کے ضلع سلہٹ اور چٹاگانگ میں پیدا ہوتی ہے۔ پاکستان کے ضلع ہزارہ میں اس کی کاشت شروع کی گئی ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں بھی چائے کی کاشت ہوتی ہے۔

کپاس :

یہ خشک علاقے کی فصل ہے اس کے لیے گرم اور یکساں آب و ہوا کی ضرورت ہے زیادہ نمی اس کے لیے نقصان دہ ہے۔ کالی مٹی جو رطوبت کو دیر تک محفوظ رکھ سکے اس کی کاشت کے لیے خاص طور پر مفید ہے، پاکستان کے صوبے پنجاب اور سندھ اس کی کاشت کے لیے مشہور ہیں۔ بھارت میں سطح مرتفع، دکن کے شمال مغربی علاقوں، اتر پردیش، پوربی پنجاب، مہاراشٹر اور مدھیا پردیش میں کاشت کی جاتی ہے۔ بنگلہ دیش میں اس کی کاشت صرف شمال مغربی علاقوں میں ہوتی ہے۔

پٹ سن :

پٹ سن کے لیے گرم مرطوب آب و ہوا اور زرخیز زمین چاہیے۔ یہ فصل زمین کو بہت کمزور کر دیتی ہے، اس لیے اس کی کاشت کے لیے ایسی زمین درکار ہے جس کی مٹی ہر سال بدلتی رہے۔ دنیا کی ۶۵ فیصد پٹ سن بنگلہ دیش میں پیدا ہوتی ہے۔ بھارت میں دریائے گنگا اور برہم پتر کے زیرین حصے یعنی مغربی بنگال میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ آسام، بہار اور اڑیسہ میں بھی تھوڑی مقدار میں کاشت کی جاتی ہے۔ پاکستان میں بھی اب پٹ سن کی کاشت شروع ہو چکی ہے۔

معدنیات :

موجودہ دور میں معدنیات کی اہمیت محتاج بیان نہیں۔ صنعتی ترقی کے لیے معدنیات اور وسائل قوت کی دریافت بے حد ضروری ہے۔ جن ممالک کے پاس معدنی وسائل کی کثرت ہے وہاں کی معیشت کافی مستحکم ہے۔ ملکی ترقی کے لیے جن معدنیات کی ضرورت ہے وہ برصغیر میں کافی مقدار میں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے برصغیر کو معدنی پیداوار کے لحاظ سے دنیا میں کوئی خاص شہرت حاصل نہیں، تاہم بعض معدنیات کے سلسلے میں برصغیر کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ذیل میں برصغیر کی معدنی پیداوار کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

لوہا :

صنعتی ترقی میں لوہے کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، لیکن پاکستان اس معاملے میں زیادہ خوش قسمت نہیں ہے۔ اول تو لوہا یہاں بہت کم مقدار میں ملتا ہے اور جو ملتا ہے وہ بھی اچھی قسم کا نہیں، اس میں پائی جانے والی کثافتیں اتنی پیچیدہ ہیں کہ ان کو صاف کرنا آسان نہیں۔ پاکستان میں کوئلے کے ذخائر کالا باغ، سکڑوال، لنگڑیال، چترال، خضدار، سبی اور چاغی میں اور بنگلہ دیش میں چٹاگانگ اور کاکس بازار میں پائے جاتے ہیں۔ بھارت میں لوہے کی دھات کا بڑا حصہ بہار اور اڑیسہ میں سارندا کی پہاڑیوں سے حاصل ہوتا ہے۔ کچھ مقدار میں میسور کے علاقے کیمن گندی، مدھیا پردیش میں ڈرگ اور

تامل ناڈ میں رام گڑھ اور سالم کے علاقوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ بھارت لوہے کی پیداوار میں دفی حد تک خود کفیل ہے۔ تاہم اعلیٰ کوالٹی کا لوہا بھی درآمد کرنا پڑتا ہے۔

کوئلہ :

صنعتی شعبے میں کوئلے کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایندھن کا کام دیتا ہے اور طاقت کا سرچشمہ بھی ہے۔ پاکستان کوئلے کے سلسلے میں خود کفیل نہیں ہے، علاوہ ازیں جو کوئلہ کانوں سے دستیاب ہوتا ہے۔ وہ مطلوبہ معیار پر پورا نہیں اترتا، لہذا اس کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دوسرے ممالک سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان میں کوئلہ ڈنڈوت، پڈھ، مکڑوال، کھوسٹ، شارگ، ہرنائی، سار، ڈیگائی، شیرین آب، مچھ، جھمپیر، مستونگ اور لاکھڑا کی کانوں سے نکالا جاتا ہے۔ بنگلہ دیش میں کوئلہ سونام گنج، راجشاہی اور گچھا ضلع بوگرا میں ملتا ہے۔ بھارت میں کوئلے کی بڑی بڑی کانیں رانی گنج جھریا، ڈالٹن گنج، سنگھ بھوم میں ہیں۔ جب کہ معمولی مقدار میں کوئلہ کی پیداوار کے علاقے حیدر آباد، مدھیا پردیش اور آسام میں ہیں۔

معدنی تیل :

طاقتی وسائل میں معدنی تیل کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، لیکن برصغیر میں اس کی پیداوار ملکی ضروریات کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے، لہذا اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے بیرونی ممالک سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان میں اس وقت معدنی تیل کھوڑ، کرسال، ڈھلیان، جویا میر، بلکسر، چکوال، توت، کوٹ سارنگ اور میال اور اوھی سے نکالا جاتا ہے۔ تیل کی اہمیت کے پیش نظر روسی ماہرین کے علاوہ کئی غیر ملکی کمپنیاں بھی تیل کی تلاش میں مصروف عمل ہیں۔ امید ہے کہ یہ کوششیں کامیاب ہوں گی اور پاکستان تیل کی ضروریات کے معاملے میں خود کفیل ہو جائے گا۔ پاکستان کی طرح بنگلہ دیش میں بھی تیل کی تلاش جاری ہے۔ بھارت میں تیل صوبہ آسام میں ڈگبوئی کے مقام پر اور تھوڑا سا کھاسی اور جنتا کی پہاڑیوں کے پاس ملتا ہے۔

تانبا :

پاکستان میں ضلع چاغی میں سین ڈک کے مقام پر تقریباً ۲۵ کروڑ ٹن تانبے کے ذخائر موجود ہیں۔ بھارت میں اس کی کانیں سنگھ بھوم (صوبہ بہار) دارجلنگ، سکم اور نیلور کے نواحی علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔

معدنی نمک :

دنیا کا ۸۰ فیصد معدنی نمک پاکستان میں ملتا ہے۔ پاکستان میں نمک کی کانیں کھیوڑہ، وارچھا، کالا باغ، جٹا، بہادر خیل اور تھرپارکر میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ماڑی پور، مکران اور لس بیلہ میں سمندری پانی کو خشک کرکے نمک حاصل کیا جاتا ہے۔ بھارت میں خلیج کچھ، بمبئی، کاٹھیاواڑ اور

مدراس کے علاقوں میں سمندری پانی کو اور راجستھان میں واقع جھیل سانبھر کے پانی کو خشک کر کے نمک حاصل کیا جاتا ہے۔ بنگلہ دیش میں بھی نمک سمندری پانی کو خشک کر کے حاصل کیا جاتا ہے۔

سونا:

میسور (بھارت) میں کولدر کی کانیں سونے کی پیداوار کے لیے مشہور ہیں۔ معمولی مقدار میں سونا اننت پور اور حیدر آباد میں پایا جاتا ہے۔

میگنیز:

میگنیز فولاد بنانے کے کام آتا ہے۔ بھارت میگنیز کی پیداوار میں دنیا میں دوسرے درجے پر ہے۔ بھارت میں مدھیا پردیش، بال گھاٹ، ناگ پور، جبل پور، سنگھ بھوم، کاٹھیاواڑ، بلیری اور سانڈور میں نکالا جاتا ہے۔ پاکستان میں میگنیز ضلع چترال میں ملتا ہے۔

کرومائیٹ:

کرومائیٹ دنیا میں سب سے زیادہ پاکستان میں ملتا ہے۔ پاکستان میں اس کے سب سے بڑے ذخائر مسلم باغ (بلوچستان) میں پائے جاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ذخیرے چاغی، خاران، مالاکنڈ، مہمند اور شمالی وزیرستان میں ہیں۔ بھارت میں اس کی کانیں میسور میں واقع ہیں۔

سنگ مرمر:

بھارت میں سنگ مرمر زیادہ تر جے پور، جودھ پور، کشن گڑھ، اجمیر، الور، چتوڑ اور مدھیا پردیش میں جبل پور کے پاس ملتا ہے۔ پاکستان میں اس کے ذخائر اضلاع مردان، سوات، چاغی اور اٹک میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان میں جپسم، چونے کا پتھر، قلمی شورہ اور برتن بنانے والی مٹی کے وسیع ذخائر سطح مرتفع پوٹھوہار میں پائے جاتے ہیں، جب کہ بھارت میں شورہ، باکسائٹ ایس بیسٹوز، جپسم، چونے کا پتھر، سیسہ اور جست ملک کے بہت سے حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ابرق بھارت کی مشہور معدنیات میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی مشہور کانیں تامل ناڈ میں ضلع نیلور، بہار میں حضوری باغ، گیا اور ہنگھپر میں پائی جاتی ہیں۔

صنعتی پیداوار

کسی ملک کی معیشت میں صنعتی ترقی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ صنعتی ترقی سے قومی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کے باشندوں کا معیار زندگی بلند ہوتا ہے۔ برصغیر کے عوام کے پست معیار زندگی کا بڑا سبب یہاں کی صنعتی پس ماندگی ہے جس کی سب سے بڑی وجہ برصغیر پر انگریزوں کی طویل حکمرانی ہے، جنھوں نے تجارتی مقاصد کے لیے یہاں کی صنعتوں کو تباہ کیا اور ان کی سوچی سمجھی پالیسی اس ملک کی صنعتی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنی رہی، تاہم آزادی حاصل کرنے کے بعد برصغیر کے ممالک نے صنعتی ترقی کے لیے بہت کوششیں کیں۔ انھوں نے نئی صنعتوں

کے قیام کی طرف پوری توجہ دی ۔ وسائل قوت کی کمی کو پورا کرنے کے لیے برقابی وسائل کو بروئے کار لایا گیا اور معدنی وسائل کی تلاش میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا ۔ نتیجتاً اب برصغیر کے ممالک نے صنعتی میدان میں کافی ترقی حاصل کر لی ہے ۔ بعض صنعتوں میں نہ صرف یہ خود کفیل ہیں بلکہ انھیں برآمد کرکے کافی زر مبادلہ بھی کما رہے ہیں ۔ باقی صنعتوں کی ترقی کے لیے دن رات کوششیں جاری ہیں جن کا اندازہ ذیل کی تفصیل سے لگایا جا سکتا ہے ۔

سوتی کپڑے کے کارخانے :

برصغیر میں پارچہ بافی کی صنعت بہت پرانی ہے ۔ بھارت میں کپڑے کا سب سے پہلا کارخانہ ۱۸۱۸ء میں کلکتہ میں قائم ہوا۔ اس کے پندرہ سال بعد دوسرا کارخانہ بمبئی میں قائم ہوا ۔ اور اسی طرح کارخانوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی ۔ اس وقت بھارت میں سوتی کپڑے کے بڑے بڑے کارخانے کلکتہ اور بمبئی کے علاوہ احمد آباد ، ناگپور ، کانپور ، شولا پور ، مدراس ، بنگلور ، دہلی ، امراوتی ، مدورا ، امرتسر اور لدھیانہ میں قائم ہیں ۔

قیام پاکستان کے وقت پاکستان کے حصے میں سوتی کپڑا بنانے کے صرف تین کارخانے آئے تھے لیکن قیام پاکستان کے بعد سب سے زیادہ ترقی اسی صنعت نے کی ۔ چنانچہ اس وقت ملک بھر میں تقریباً ۱۵۰ سے زائد کارخانے کام کر رہے ہیں ۔ یہ کارخانے کراچی ، بھاول پور ، رحیم یار خاں ، فیصل آباد ، ملتان ، اوکاڑہ ، راولپنڈی ، لیاقت آباد ، بھکر ، نوشہرہ ، چار سدہ ، ہری پور ، حیدر آباد ، خیر پور ، ٹنڈو آدم اور ٹنڈو جام میں کام کر رہے ہیں ۔ بنگلہ دیش میں سوتی کپڑا بنانے کے کارخانے ڈھاکہ ، نارائن گنج ، کالی گنج ، کھلنا ، میمن سنگھ اور چاٹگانگ میں قائم ہیں ۔

اونی کپڑے کے کارخانے :

قیام پاکستان کے وقت اونی کپڑے کا کوئی کارخانہ پاکستان میں موجود نہ تھا ۔ اس وقت پاکستان میں اونی کپڑا بنانے کے کارخانے کراچی ، لارنس پور ، ہرنائی ، بنوں ، نوشہرہ ، قائد آباد ، اسماعیل آباد ، جھنگ اور ملتان میں قائم ہیں ۔ بھارت میں اُونی کپڑے کے کارخانے بنارس، بمبئی، کانپور، دھاریوال، بنگلور اور لدھیانہ میں کام کر رہے ہیں ۔

ریشمی کپڑے کے کارخانے :

بھارت میں ریشمی کپڑا تیار کرنے کے کارخانے مرشد آباد، آگرہ، بھاگل پور، بنارس، بنگلور، سورت، ترچنا پلی، احمد آباد، امرتسر، لدھیانہ میں ہیں ۔ جب کہ پاکستان میں ریشمی کپڑے کی صنعت کے مراکز کراچی، گوجرانوالہ اور فیصل آباد میں قائم ہیں ۔

پٹ سن کے کارخانے :

پٹ سن کی کاشت دنیا میں سب سے زیادہ بنگلہ دیش میں ہوتی ہے ۔ لہذا یہاں پٹ سن کی

مصنوعات بنانے کے کارخانے ڈھاکہ، نارائن گنج، میمن سنگھ اور چٹا گانگ میں قائم ہیں - بھارتی بنگال میں دریائے ہگلی کے کنارے سو سے زائد کارخانے قائم ہیں - بھارت میں پٹ سن کی مصنوعات کا سب سے بڑا مرکز کلکتہ ہے - پاکستان میں اس کی مصنوعات کے کارخانے جڑانوالہ اور مظفر گڑھ میں قائم ہیں -

کھانڈ بنانے کے کارخانے:

برصغیر میں گنا کافی مقدار میں پیدا ہوتا ہے - اس لیے شکر سازی کی صنعت کو خاصی اہمیت حاصل ہے - برصغیر کافی حد تک اس معاملے میں خود کفیل ہے - پاکستان نے آزادی کے بعد اس میدان میں بہت ترقی کی ہے، اس وقت پاکستان میں چینی کے کارخانے مردان، چار سدہ، تخت بھائی، نوشہرہ، راہوالی، جوہرآباد، لیہ، فیصل آباد، جڑانوالہ، بھلوال، فیروزہ، صادق آباد، ٹنڈو آدم، جھنگ، گجرات اور چشتیاں، سانگلہ ہل میں قائم ہیں - اس کے علاوہ ہر صوبے میں مزید کارخانے لگانے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے - بنگلہ دیش میں چینی کے کارخانے دیناج پور، رنگ پور، راج شاہی، میمن سنگھ، کشتیا، گوپال پور، ستیاب گنج، ڈھاکہ اور بوگرا میں قائم ہیں -

بھارت میں کانپور، گورکھ پور، سہارن پور، بریلی، بستی نواب گنج، پھگواڑہ ، امرتسر، ڈالمیا نگر اور چھپرا میں کھانڈ تیار کرنے کے کارخانے کام کر رہے ہیں -

فولاد کی صنعت:

برصغیر میں لوہے کا سب سے بڑا کارخانہ بھارت میں جمشید پور میں قائم ہے، جس کا نام ٹاٹا آئرن اینڈ سٹیل ورکس ہے - کٹی میں بنگال آئرن اینڈ سٹیل کمپنی، سیتا رام پور میں کرتیا نند آئرن فیکٹری قائم ہے، ہرن پور اور بھدرا وتی کے مشہور کارخانوں کے علاوہ مدھیا پردیش میں بھی کئی چھوٹے کارخانے قائم ہیں -

پاکستان اگرچہ فولاد کی صنعت میں غیرممالک پر انحصار کرتا ہے تاہم کراچی اور لاہور میں ناکارہ لوہے کو پگھلا کر سامان بنانے کے کارخانے قائم ہیں - اس کے علاوہ پیپری اور کالا باغ میں فولاد کے کارخانے قائم کیے جا رہے ہیں - مشین سازی کا ایک کارخانہ ٹیکسلا کے مقام پر واقع ہو چکا ہے - بنگلہ دیش میں فولاد کا کارخانہ چٹا گانگ میں قائم ہے -

سیمنٹ کے کارخانے:

قیام پاکستان کے وقت پاکستان میں سیمنٹ بنانے کا صرف ایک کارخانہ قائم تھا - اس وقت یہاں واہ، ڈنڈوٹ، داؤد خیل، روہڑی، حیدرآباد، کراچی، ہزارہ اور جہلم میں سیمنٹ کے کارخانے کام کر رہے ہیں - اس کے علاوہ سپن تنگی اور لس بیلہ میں بھی کارخانے قائم کیے جا رہے ہیں - بنگلہ دیش میں سیمنٹ کے کارخانے چھتک، ستیاب گنج اور سلہٹ میں قائم ہیں - بھارت میں کٹنی، شاہ آباد، گوالیار، روتری، پور بندر، ڈالمیا نگر میں قائم ہیں -

کاغذ بنانے کے کارخانے:

کاغذ مختلف قسم کے گھاس، بانس، چیتھڑوں اور صنوبر کے گودے سے تیار ہوتا ہے۔ بھارت میں دریائے ہگلی کا کنارہ کاغذ کی صنعت کا مرکز ہے، جہاں ٹیٹا گڑھ میں ایک مشہور کارخانہ قائم ہے۔ اس کے علاوہ کلکتہ، نیتھائی، جگادھری، حیدر آباد، میسور، آسام اور اتر پردیش میں کاغذ بنانے کے کئی کارخانے قائم ہیں۔

بنگلہ دیش میں کرنافلی پیپر مل چندر گوند کے مقام پر قائم ہے، جو جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی مل ہے۔ اس کے علاوہ کھلنا میں بھی کاغذ بنانے کا ایک بہت بڑا کارخانہ قائم ہے۔ بنگلہ دیش نہ صرف کاغذ کی صنعت میں خود کفیل ہے، بلکہ بہت سا کاغذ برآمد کر کے زر مبادلہ بھی کماتا ہے۔

قیام پاکستان کے وقت پاکستان میں کاغذ بنانے کا کوئی کارخانہ نہ تھا، لیکن اب لاہور، گھارو، چارسدہ، نوشہرہ، کراچی اور حیدرآباد میں کاغذ بنانے کے کارخانے قائم ہو چکے ہیں۔ تاہم پاکستان اس سلسلے میں خود کفیل نہیں، اسے اپنی ضرورت کے لیے کافی مقدار میں کاغذ درآمد کرنا پڑتا ہے۔

جہاز سازی کے کارخانے:

پاکستان میں "کراچی شپ یارڈ اینڈ انجینیئرنگ ورکس لمیٹڈ" کے نام سے بحری جہاز سازی کا کارخانہ قائم ہے۔ یہ کارخانہ ملکی ضروریات کے علاوہ دیگر ممالک کے لیے بھی جہاز تیار کرتا ہے۔ بھارت میں بحری جہاز سازی کا کارخانہ بمبئی میں قائم ہے۔

اس کے علاوہ برصغیر میں کیمیاوی کھاد، گتہ، ربڑ کی مصنوعات، بجلی کا سامان، بناسپتی گھی، کیمیکلز اور ادویات سازی، چمڑا رنگنے، سگریٹ بنانے اور ہوزری کے سامان کے کئی چھوٹے بڑے کارخانے قائم ہیں۔ جو ملکی ضروریات کو پورا کر کے ملکی معیشت میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

تجارت

دنیا کا کوئی ملک بھی ضروریات زندگی میں مکمل طور پر خود کفیل نہیں۔ معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ قوموں کا ایک دوسرے پر انحصار بڑھتا چلا جا رہا ہے، جس قدر ایک دوسرے پر انحصار بڑھتا ہے۔ بین الاقوامی تجارت کو اتنا ہی فروغ حاصل ہوتا ہے۔ تجارت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تجارت داخلہ یا اندرونی تجارت، یہ وہ کاروبار ہے جو ایک ہی ملک کے شہریوں کے درمیان ہوتا ہے۔ دوسری تجارت خارجہ یا بیرونی تجارت جو دو مختلف ممالک کے باشندوں کے درمیان ہوتی ہے۔ تجارت خارجہ ملک کی معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے، ضرورت سے زائد اشیاء دوسرے ملکوں کے ہاتھوں فروخت کر کے زرمبادلہ کمایا جاتا ہے۔ اس زرمبادلہ سے مختلف قسم کی اشیاء جو اندرون ملک دستیاب نہیں، درآمد کی جاتی ہیں۔ جن مصنوعات کو برآمد کیا جاتا ہے انھیں ترقی کے مواقع میسر آتے ہیں۔ سرمایہ کاری میں اضافہ ہوتا ہے۔ روزگار میں وسعت ہوتی ہے، معاشی خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے اور لوگوں کا معیار زندگی بلند ہوتا ہے۔

برصغیر زرعی ممالک پر مشتمل ہے، اس لیے اس کی برآمدات زیادہ تر زرعی خام مال پر مشتمل ہیں، البتہ صنعتی ترقی کی وجہ سے اب بعض مصنوعات بھی برآمد کی جا رہی ہیں - برصغیر کی تجارت تقریباً دنیا کے ہر ملک سے ہے جس کا مختصر خاکہ ذیل میں دیا جا رہا ہے -

برآمدات

پاکستان کی برآمدات :

کپاس :

کپاس پاکستان کی اہم برآمدات میں سے ہے - دنیا کی کپاس کی برآمدات کا ۲۰ فیصد پاکستان برآمد کرتا ہے - کپاس زیادہ تر چین، جاپان، بلجیم اور ہانگ کانگ کو برآمد کی جاتی ہے -

سوت اور سوتی کپڑا :

سوتی کپڑا زیادہ تر برطانیہ، امریکہ، کینیڈا، سری لنکا، ایران، سعودی عرب، افغانستان اور روس کو برآمد کیا جاتا ہے - سوتی دھاگہ برما، سری لنکا اور ہانگ کانگ کو بھیجا جاتا ہے -

چاول :

زیادہ تر سعودی عرب، برطانیہ، کویت، قطر، روس اور عراق کو بھیجا جاتا ہے -

چمڑا اور کھالیں :

خام مال کے علاوہ چمڑے کی مصنوعات بھی برآمد کی جاتی ہیں، جس کے خریدار ایران، اٹلی، جاپان، مغربی جرمنی، فرانس، امریکہ، برطانیہ اور سویڈن ہیں -

اُون :

امریکہ، برطانیہ اور جرمنی کو برآمد کی جاتی ہے -

مچھلی :

زیادہ تر سری لنکا کو برآمد کی جاتی ہے -

کھیلوں کا سامان، آلات جراحی اور کٹلری :

مشرق وسطیٰ، افریقہ اور یورپی ممالک منگواتے ہیں -

اس کے علاوہ قالین، دریاں، سیمنٹ کی ٹائیلیں، کاٹن، کینوس، سلے ہوئے کپڑے، سبزیاں اور پھل بھی بعض ملکوں کو برآمد کیے جاتے ہیں -

بھارت کی برآمدات

کپاس، کوئلہ، چائے، چمڑا اور کھالیں مختلف ملکوں کو برآمد کی جاتی ہیں - اس کے علاوہ لاکھ، ربڑ، ناریل کا چھلکا، گرم مصالحہ اور پٹ سن کی مصنوعات بھی برآمد کی جاتی ہیں -

بنگلہ دیش :

بنگلہ دیش کی برآمدات میں پٹ سن اور اس کی مصنوعات چائے ، تیل نکالنے کے بیج، دیا سلائی، کاغذ اور چمڑا شامل ہیں - پٹ سن اور اس کی مصنوعات زیادہ تر برطانیہ، مغربی جرمنی، ریاستہائے متحدہ امریکہ، فرانس، بلجیم، جاپان اور روس کو بھیجی جاتی ہیں -

ریاست جموں کشمیر کی اہم برآمدات پھل، گرم کپڑے اور عمارتی لکڑی ہے، جب کہ نیپال صرف عمدہ قسم کی لکڑی برآمد کرتا ہے -

درآمدات

پاکستان ترقی پذیر ملک ہے - اس لیے سب سے زیادہ مشینری اور لوہے کا سامان درآمد کرتا ہے - درآمدات کی فہرست اگرچہ طویل ہے تاہم اہم درآمدات کا ذکر درج ذیل ہے :

مشینری :

زیادہ تر برطانیہ، امریکہ، مغربی جرمنی، جاپان، اٹلی اور بلجیم سے درآمد کی جاتی ہے -

فولاد اور فولادی سامان :

بلجیم، لیکسمبرگ، جاپان، برطانیہ، امریکہ، فرانس، آسٹریلیا، چیکوسلواکیہ، کنیڈا اور مغربی جرمنی سے منگوایا جاتا ہے -

معدنی تیل :

سعودی عرب، ایران، عرب امارات اور کویت سے درآمد ہوتا ہے -

سامان نقل و حمل :

مغربی جرمنی، اٹلی، برطانیہ، فرانس اور امریکہ سے منگوایا جاتا ہے -

ادویات :

فرانس، مغربی جرمنی، سوئٹزرلینڈ، امریکہ اور برطانیہ سے منگوائی جاتی ہیں -

رنگ و روغن :

سوئٹزرلینڈ، فرانس اور برطانیہ سے درآمد کیا جاتا ہے -

کیمیاوی اشیاء :

فرانس، مغربی جرمنی، سوئٹزرلینڈ اور برطانیہ سے منگوائی جاتی ہے - کیمرے، چینی کے برتن، گھڑیاں اوردوربینیں وغیرہ جاپان، برطانیہ، مغربی جرمنی اور سوئٹزرلینڈ سے منگوائی جاتی ہیں -

اس کے علاوہ گندم، کاغذ، چائے، خوردنی تیل، ربڑ کی مصنوعات، کتابیں، پیتل، چاندی، جست، ایلومینیم، نکل، تانبا وغیرہ بھی کافی مقدار میں درآمد کیا جاتا ہے -

بھارت کی درآمدات میں دھاتیں، مشینری، لوہے اور فولاد کا سامان، کاغذ، دوائیاں، کپاس، چاول،

گندم، سٹیشنری، کیمیائی اشیاء، شیشے کا سامان اور پٹرولیم وغیرہ ہیں۔ یہ سامان برطانیہ، فرانس، امریکہ، روس، مشرق وسطیٰ کے ممالک اور افریقی ممالک سے درآمد کیا جاتا ہے۔

بنگلہ دیش بھی ایک زرعی ملک ہے۔ اس لیے اکثر مصنوعات بیرونی ممالک سے درآمد کرتا ہے جن میں مشینری، ادویات، لوہے اور فولاد کا سامان، بجلی کا سامان، کیمیائی اشیاء، کیمیائی کھاد، سامان نقل و حمل کے علاوہ چاول بھی شامل ہیں۔

نیپال اور متنازعہ ریاست جموں و کشمیر ضروریات زندگی کی اکثر چیزیں درآمد کرتے ہیں۔ نیپال اور مقبوضہ کشمیر کی درآمدات بھارت کے ساتھ اور آزاد کشمیر کی درآمدات پاکستان کے ساتھ منسلک ہیں۔

برصغیر کے ممالک آپس میں بھی تجارت کرتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان اور بھارت کے درمیان کافی تجارت ہوتی تھی۔ لیکن بعد میں پاک بھارت جنگوں کی وجہ سے یہ تجارت منقطع ہو گئی، لیکن اب پھر محدود پیمانے پر آپس میں تجارت شروع ہو گئی ہے۔ بنگلہ دیش کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم ہو چکے ہیں اور دونوں ممالک باہمی تجارت کو فروغ دینے میں کوشاں ہیں۔

سوالات

۱۔ برصغیر پاک و ہند کا محل وقوع اور حدود اربعہ لکھیے۔

۲۔ سطح کے لحاظ سے برصغیر پاک و ہند کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟ ہر حصے کا مختصر حال لکھیے۔

۳۔ طبعی خصوصیات کے لحاظ سے کوہ ہمالیہ کی مشرقی اور مغربی شاخوں میں کیا فرق ہے؟

۴۔ آب و ہوا کے لحاظ سے برصغیر کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟ ہر حصے کی خصوصیات لکھیے۔

۵۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کی آب و ہوا کا مقابلہ کیجیے اور فرق کی وجہ بتائیے۔

۶۔ کسی علاقے کی نباتات پر کون سے جغرافیائی عوامل اثر انداز ہوتے ہیں اور کس طرح؟ وضاحت کیجیے۔

۷۔ جنگلات کا دار و مدار کس بات پر ہے؟ پاکستان میں بہترین جنگلات کن علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔

۸۔ جنگلات کی مشہور قسمیں کون کون سی ہیں اور یہ اقسام پاکستان کے کن علاقوں میں ملتی ہیں۔

۹۔ پاکستان کے لیے آبپاشی کی اہمیت واضح کیجیے اور اس کے نہری نظام پر مختصر نوٹ لکھیے۔

۱۰- مندرجہ ذیل فصلوں کے لیے کون سے جغرافیائی حالات درکار ہیں اور یہ فصلیں پاکستان میں کہاں کہاں پیدا ہوتی ہیں ؟

گندم، چاول، گنا، کپاس، پٹ سن، چائے ، تیل نکالنے کے بیج ۔

۱۱- مندرجہ ذیل معدنیات برصغیر میں کہاں کہاں ملتی ہیں ؟

لوہا ، کوئلہ ، معدنی تیل، نمک ، کرومائٹ، سنگ مرمر ۔

۱۲- صنعتی ترقی، ملکی معیشت میں کیا کردار ادا کرتی ہے ؟ وضاحت کیجیے ۔

۱۳- پاکستان میں مندرجہ ذیل مصنوعات تیار کرنے کے کارخانے کہاں کہاں واقع ہیں ؟

سوتی کپڑا ، اُونی کپڑا ، ریشمی کپڑا ، کھانڈ ، فولاد، سیمنٹ، کاغذ ۔

۱۴- پاکستان کی مشہور اشیائے برآمدات کون سی ہیں اور وہ کن ملکوں کو برآمد کی جاتی ہیں ؟

۱۵- پاکستان کون کون سی اشیاء کہاں کہاں سے درآمد کرتا ہے ؟

آٹھواں باب

اسلامی معاشرہ

ظہور اسلام سے قبل عربوں کی حالت

اسلامی تاریخ میں ظہور اسلام سے قبل عربوں کی حالت کو زمانہ جاہلیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں عربوں میں نہ صرف ہر قسم کی برائیاں رواج پا چکی تھیں بلکہ انھیں علی الاعلان فخریہ طور پر بیان بھی کیا جاتا تھا۔ ظہور اسلام سے قبل عربوں کی اس حالت کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ سیاسی، معاشرتی، مذہبی، اخلاق، معاشی اور تعلیمی۔

مذہبی حالت:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پیشتر جزیرۃ العرب میں عموماً لوگ بت پرست تھے اور بتوں کو خدا تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ خانہ کعبہ کے تین سو ساٹھ بتوں کے علاوہ قبیلے اپنے بت الگ بھی رکھتے تھے۔ بلکہ ہر گھر میں الگ الگ بت ہوتے تھے۔ انھی بتوں میں سے لات منات اور عزی تھے جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ ان کے افعال و اعمال کی کوئی کل ایسی نہ تھی جو بگڑی نہ ہو۔ غرض کہ وہ شرک میں اس قدر مستغرق تھے کہ معبود کا ایک ہونا ان کے لیے عجوبہ تھا۔ عرب میں بت پرستی کے علاوہ تمام مشہور مذاہب موجود تھے مثلاً یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور دہریت وغیرہ اگرچہ زمانے اور مدت کا تعین مشکل ہے لیکن اول الذکر تینوں مذاہب ایک مدت دراز سے عرب میں رائج ہو چکے تھے۔

معاشی حالت:

ملک عرب کی معاشیات کا تمام تر دارومدار تجارت اور مویشیوں پر تھا۔ ملک کا زیادہ حصہ غیرآباد اور ریگستان ہے۔ اس لیے وہاں زراعت سے زیادہ تجارت کو فروغ تھا۔ اس کے آباد حصے ملک کے تین طرف بحری سواحل پر واقع ہیں۔ مشرق کی طرف بحرین اور عمان خلیج فارس پر۔ جنوب میں حضر موت اور عدن بحرہ عرب پر اور مغرب میں حجاز اور یمن بحر احمر پر واقع ہیں۔

تجارت:

عرب میں مختلف جگہوں پر تجارتی بازار لگتے تھے۔ وہاں خرید و فروخت کا بازار گرم رہتا تھا۔ عکاظ اور ذوالمجاز کے تجارتی میلے خاص طور پر مشہور تھے۔

کا معجزہ تھا کہ وہی لوگ جن کو بیرونی ممالک کے لوگ ان پڑھ کے نام سے یاد کرتے تھے اس قابل ہوگئے کہ پھر ان جتنا اہل علم و بصیرت ڈھونڈنا مشکل تھا۔

مذہبی اور اخلاقی حالت :

"دعوت اسلامی کے نکات اولین میں سے سب سے اہم اور بنیادی نکتہ توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال تھا۔ عرب کے مشرک معاشرے میں اصل مسئلہ اللہ تعالیٰ کے وجود کو نہیں بلکہ اس کی وحدانیت کو تسلیم کرانے کا تھا۔ مشرکین اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے۔ وہ اسی کو اپنا اور ساری کائنات کا خالق مانتے تھے۔ انھیں اس کے رب اور اللہ ہونے میں بھی کوئی شک نہ تھا۔ اور اس کی عبادت کے بھی وہ مخالف نہ تھے۔ البتہ جس گمراہی میں وہ مبتلا تھے وہ یہ تھی کہ وہ الوہیت اور ربوبیت کو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اس کے ساتھ دوسرے بہت سے النھوں کو بھی خدائی میں شریک ٹھہراتے تھے اور اللہ کے ساتھ ان کی عبادت کے بھی قائل تھے"۔

اس معاشرے اور اس مذہب کے لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھ کر بار بار اور بہ تکرار اوز پورے زور کے ساتھ اعلان کیا کہ اللہ ایک ہے اور اللہ ہی رب ہے اور کسی دوسرے کا الوہیت اور ربوبیت میں کوئی حصہ نہیں۔

مشرکین نے حضور سے پوچھا کہ جس رب کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کا نسب ہمیں بتاؤ وہ کس چیز سے بنا ہوا ہے کس سے اس نے دنیا کی وراثت پائی ہے اور کون اس کے بعد یہ وراثت پائے گا ؟ اس کے جواب میں سورہ اخلاص میں توحید کی ایسی واضح جامع اور مختصر تعریف بیان کی گئی جو دلوں میں تیر کی طرح پیوست ہو جانے والی تھی جس کے ساتھ شرک کا شائبہ تک نہ تھا جس کا ایک ایک لفظ توحید کے تصور کو نکھار کر پیش کر رہا تھا اور اس کے ساتھ کمال یہ تھا کہ چار مختصر اور بلیغ فقروں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے کسی سننے والے کے بس میں یہ نہ تھا کہ اسے اپنے حافظہ سے نکال دے اور وہ زبانوں پر چڑھے بغیر رہ جائے۔

یہی کام تھا جو منصب رسالت پر مامور ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اوز یہی کفار سے آپ کے نزاع کا پہلا سبب بنا۔ کیونکہ اس کا ہر جزو ان کے عقائد، تعصبات اور صدیوں کے جمے ہوئے تصورات سے ٹکراتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تعلیمات اور اپنے اخلاق حسنہ سے لوگوں کی مذہبی حالت بدلی اور بتوں کی پوجا کی جگہ خدا کی عبادت نے اور جاہلیت کے عقائد کی جگہ قرآنی تعلیمات اور ارشادات نبوی نے لے لی۔

"اسلام کی اخلاق ہدایات بجائے خود ایسی تھیں جن سے کوئی اصلاح پسند انسان جس میں کچھ بھی اخلاق حس اور خیر و شر کی تمیز موجود تھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ لیکن قرآن نے صرف انھی پر اکتفا نہ کیا بلکہ فضائل اخلاق میں سے ایک ایک کو نمایاں کر کے بتایا کہ اسلام انسان کو

کن بھلائیوں سے آراستہ کرنا چاہتا ہے۔ جاہلیت کے تمام برے کاموں مثلاً شراب نوشی، جوا، زنا وغیرہ سے کنارہ کشی اختیار کرنا اور حلال و حرام کی حدود قائم کرنا اور انسان کو خدا کے سوا دوسروں کی عائد کردہ پابندیوں سے آزاد اور ان کے لادے ہوئے بوجھوں سے ہلکا کرنا اخلاق تعلیمات کا حصہ تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے عملاً یہ سب کچھ کرکے دکھایا کہ بھلائیاں صرف زبان سے کہنے ہی کی نہیں بلکہ اسلام نے جس زندگی میں بھی راہ پا لی ہے وہ ان بھلائیوں سے آراستہ ہو گئی ہے۔

سیاسی حالت:

بعثت سے پہلے عرب کی سیاسی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ہر قبیلہ اپنے طور پر دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن اسلام نے جو مکمل ضابطہ حیات دیا اس میں اسلامی نظام حکومت پر بھی توجہ دی۔ اسلام کے اس سیاسی نظام کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں نافذ کیا جس سے بعثت سے پہلے کی سیاسی حالت یکسر بدل گئی۔ آپ نے امور سلطنت مختلف شعبوں میں تقسیم کیے اور قابل اعتماد لوگوں کو ان کی ذمہ داری سونپی۔ آپ نے عربوں کی خانہ جنگی اور بد نظمی کو دور کرکے ایک مرکزی حکومت کے تحت زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھایا۔ اور ان کو ایک ملت میں تبدیل کر دیا۔ ہم اس سیاسی نظام کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) مرکزی نظام حکومت۔

(۲) صوبائی نظام حکومت۔

۱۔ مرکزی نظامِ حکومت:

اسلام کے سیاسی نظام میں اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی اصل دستور ساز اور مقنن حقیقی ہے۔ انسان اس کے نائب کی حیثیت سے خداوندی قوانین کو نافذ کرتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ مسلمانوں کے دینی اور دنیاوی ہادی و مرشد تھے۔ اس لیے آپ کو تمام اختیارات حاصل تھے۔ آپ بیک وقت ریاست کے سربراہ، سرچشمہ انصاف اور سالار فوج تھے۔ اس طرح آپ پورے نظام کے نگران اعلیٰ تھے۔ لیکن آپ کو ایک مطلق العنان حکمران نہیں کہا جا سکتا کیونکہ آپ جو قدم اُٹھاتے اس میں حکم خداوندی شامل ہوتا تھا۔

جہاں حکم خداوندی موجود نہ ہوتا وہاں صحابہ کرام سے مشورہ کرتے تھے۔ اور جس امر پر اتفاق رائے ہو جاتا اس پر عمل کرتے تھے۔ اس طرح آپ کی حکومت نہ شخصی تھی نہ جمہوری بلکہ دونوں کا حسین امتزاج تھی۔ بہرحال آپ اکثر معاملات میں جمہوری طریقے اختیار کرتے تھے۔ حکومت کا باقاعدہ کوئی دفتر نہ تھا۔ عموماً مسجد نبوی میں مرکزی حکومت کا سارا کام ہوتا تھا۔ وہیں مشورے ہوتے تھے اور اگر ضرورت ہوتی تو عوام کی رائے بھی وہیں معلوم کر لی جاتی تھی۔ آپ نے حکومت کے کام

کو بہ احسن و خوبی چلانے کے لیے مختلف عہدے اور شعبے قائم کیے تھے۔ آپ نے چند صحابہ کو دستاویزات، یادداشتیں اور قرآن لکھنے اور آمدنی وغیرہ کا حساب رکھنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ یہ لوگ عامل کہلاتے تھے۔ ان کی تعداد بیالیس تھی۔

(۱) کتابت وحی :

بعض صحابہ کتابت وحی کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ یہ لوگ وحی نازل ہونے کے بعد اس کو لکھ دیا کرتے تھے۔ وحی کے کاتبوں میں حضرت زید رضی‌اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت علی کرم اللہ وجہ، حضرت عثمان رضی‌اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت ابی بن لعب اور حضرت معاویہ رضی‌اللہ تعالیٰ عنہ قابل ذکر ہیں۔

(۲) رسل و رسائل :

کچھ صحابہ سلاطین اور امراء عرب کے ساتھ خط و کتابت کے فرائض سرانجام دیتے اور حکام اور مبلغین کے نام احکام بھیجتے تھے۔ اس شعبہ میں حضرت زید بن ثابت، حضرت معاویہ، حضرت علی اور عبداللہ بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کام کرتے تھے۔ آپ کچھ صحابہ کو سفیر بنا کر سلاطین کے پاس بھیجتے تھے وہ آپ کے خطوط لے کر جاتے تھے۔ سات ہجری میں آپ نے اس طرح کے بہت سے سفیر مختلف حکمرانوں کے پاس روانہ کیے تھے۔ آپ خطوط اور فرامین پر اپنی مہر لگاتے تھے۔ یہ مہر حضرت حنظلہ بن ربیع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس رہتی تھی۔ ایک صیغہ راز بھی تھا جس کے ذمہ دار حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔

(۳) مالیات :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حساب کتاب کے لیے ایک شعبہ بنایا تھا۔ اس میں کئی صحابہ کام کرتے تھے۔ حضرت زبیر بن عوام اور حضرت جہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہما صدقات کی آمدنی کا حساب رکھتے تھے۔ حضرت معیقب بن ابی فاطمہ اور حضرت کعب بن عمر رضی‌اللہ تعالیٰ عنہما مال غنیمت کا اندراج کرتے تھے۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھجوروں کی آمدنی لکھنے پر مامور تھے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حصین بن نمیر رضی اللہ‌تعالیٰ عنہما قرضے اور دیگر تجارتی لین دین کا حساب کرتے تھے۔

(۴) دعوت تبلیغ :

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ و اشاعت کا خاص طور پر خیال تھا۔ مختلف قبائل جب اسلام سے مشرف ہو کر واپس جاتے تو ان کے ساتھ کسی صحابی کو مبلغ بنا کر بھیجتے تھے۔ آپ نے ثابت بن قیس کو خطیب اور حضرت معصب بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو پہلا مبلغ مقرر کیا تھا۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ اہل صفہ کو قرآن پڑھاتے تھے۔ آپ عورتوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ دیتے۔

۲- صوبائی نظام :

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صوبائی نظم و نسق کی داغ بیل ڈالی - ملک کو صوبوں میں تقسیم کر دیا -

مدینہ مرکزی صوبہ تھا جو براہ راست حضور کی نگرانی میں تھا - اس کے علاوہ مکہ، یمن، نجران، تہامہ، عمان، حضر موت اور بحرین دوسرے صوبے تھے - صوبے کے حاکم کو والی کہتے تھے اور وہ اپنے علاقے کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوتا تھا - صوبے کی زکواۃ کی فراہمی کے لیے محصل مقرر تھے - آنحضور گورنروں اور محصلوں کو خود مقرر کرتے تھے - ان کا تقرر ان کی ذاتی لیاقت، دینداری اور علم و فضل کے پیش نظر کیا جاتا تھا - آپ ایسے لوگوں کو مقرر کرتے تھے جو قابل احترام ہوں - جن پر لوگوں کو اعتماد ہو اور ناسقبول حاکموں کو معزول کر دیتے تھے - والیوں کی تنخواہیں نقد یا جنس کی صورت میں ادا ہوتی تھیں -

معاشرتی حالت

اسلام کا مقصود صالح افراد تیار کرنا ہی نہیں تھا، بلکہ انھیں جوڑ کر ایک صالح معاشرہ بنانا بھی تھا کیونکہ اس کے بغیر عربوں کی معاشرتی برائیوں کا خاتمہ ممکن نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ معاشرتی اصلاح کے بغیر نوع انسانی کا خسران سے بچنا اور فلاح پانا ممکن نہیں ہے -

اصل میں غلام کو آزاد کرانا یا قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا انفرادی نیکیاں ہیں، جن کو ان بے شمار انفرادی نیکیوں میں سے بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے - یہ ہر فرد میں ہونی چاہییں - لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ایسے نیک افراد بکھرے ہوئے نہ رہیں بلکہ ان لوگوں کے ساتھ مل کر ایک جماعت بن جائیں جو ایمان لانے والے اور ایک دوسرے کو صبر اور خلق خدا پر رحم کھانے کی تلقین کرتے ہیں - تاکہ ان میں ایک صابر اور رحیم معاشرہ وجود میں آئے - ایسا معاشرہ جو پاکیزہ اخلاق پر ثابت قدم ہو، برائیوں کی ترغیبات سے اپنے آپ کو روکے، راہ حق کی مشکلات اور مزاحمتوں کا پامردی سے مقابلہ کرے، راستی پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے، اور خلق خدا کے لیے ظالم اور جابر نہ ہو بلکہ رحیم و شفیق ہو، اس قسم کا معاشرہ خدا، رسول اور آخرت پر ایمان اور خدائی قانون پر غیرمتزلزل یقین و اعتماد کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا - اس لیے لا محالہ یہ خوبیاں ایک مومن معاشرے میں ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو سکتی ہیں جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والی کسی آزمائش میں بھی اپنی خوبیوں سے منحرف نہ ہو سکیں -

لامحالہ یہی وہ تمام خصوصیات تھیں جو کہ اس وقت کے اس معاشرے میں موجود تویں، جو انقلاب اسلام کے بعد وجود میں آیا - رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے ان تمام باتوں پر عمل کرکے آنے والی اُمت مسلمہ کے لیے یہ پیغام چھوڑا کہ

پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

معاشی حالت:

جس طرح نرا مسئلہ معاش لے کے اٹھنا انسانیت کو اخلاقی لحاظ سے ہلاکت میں ڈالنا ہے، اسی طرح اخلاقی اصلاح کے کام کو زندگی کے معاشی تقاضوں سے الگ کر لینا سرے سے اخلاقی اصلاح ہی کو ناکام بنا دیتا ہے۔ اسلام دونوں ضرورتوں کا جامع ہے۔ محسن انسانیت نے جو تحریک چلائی وہ جہاں دلوں کو نور ایمان اور روحوں کو اخلاقی اقدار دیتی تھی، وہاں وہ پیٹ کو روٹی بہم پہنچانے کے لیے بھی بہترین تدابیر عمل میں لاتی تھی۔ عین آغاز ہی میں اسلام کے مختصر سے اخلاقی ضابطہ میں "اطعام مسکین" بڑی اہمیت کے ساتھ شامل تھا اور پھر یتیموں، بیواؤں اور مسافروں کی خبرگیری کرنا ہر مسلم پر لازم تھا۔ اسلام دولت کی مناسب تقسیم اور یتیموں، مسکینوں، رشتہ داروں اور دوسرے حق داروں پر مال خرچ کرنے کی بہت ترغیب دیتا ہے۔

اسلامی نظام جنگ بھی بالکل نیا اخلاق ساتھ لایا۔ اس کے تحت سارا مال سوئی سوئی اور پائی پائی یکجا ہونے کے بعد کمانڈر کے حکم سے تقسیم ہوتا، پھر اس میں بیس فیصد حصہ اسلامی خزانہ میں جاتا اور بڑی حد تک غرباء اور حاجت مند طبقوں تک پہنچایا جاتا، اس طرح ساکن دولت میں ایک عمومی حرکت آ گئی اور بعد میں جوں جوں معاشی قانون نافذ ہوتے گئے اس کے بہاؤ کو انضباط میں لے لیا گیا۔

پھر اسلامی ریاست نے تمام ان طبقوں سے جو زمینوں، مویشیوں یا تجارتی سرمایہ کے مالک تھے۔ مسلم ہونے کی صورت میں زکواۃ اور غیر مسلم ہونے کی صورت میں خراج اور جزیہ کی آمدنیاں حاصل کیں اور ان آمدنیوں (خصوصاً زکواۃ) کا ایک عظیم حصہ غریب طبقوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ ہر سال غلے، کھجوروں اور مویشیوں کی ایک بھاری مقدار امراء سے غرباء کی طرف منتقل ہونے لگی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زکواۃ اور صدقات کی فراہمی کا باقاعدہ انتظام کیا تاکہ غریبوں کو امیروں کی دولت سے کچھ حصہ ملتا رہے۔ آپ کے عہد میں آمدنی کے ذرائع مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) زکواۃ:

صرف ان مسلمانوں سے لی جاتی، جن کی دولت ایک خاص معیار تک پہنچ جائے۔ اس کی شرح میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی اور نہ معاف ہو سکتی ہے۔ زکواۃ کی وصولی کرنے پر عمال مقرر تھے جو زکواۃ وصول کر کے مدینہ بھیجتے تھے، نقدی کی صورت میں رقم کا ڈھائی فیصد بیت المال کو دینا پڑتا تھا۔ زکواۃ ہر صاحب نصاب عاقل و بالغ پر فرض ہے۔ اس کا منکر کافر اور بلا وجہ نہ ادا کرنے والا فاسق ہے۔

(۲) عطیات:

حکومت کا کوئی مستقل بیت المال نہ تھا، جب قومی معاملات کے لیے اچانک روپے کی ضرورت

پڑ جاتی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو مالی امداد کی دعوت دیتے تھے - صحابہ کرام حتی المقدور مدد کرتے تھے -

(۳) فے :

فے اس مال کو کہتے ہیں جو دشمن سے بلامقابلہ ہاتھ آئے - اس قسم کا مال مسلمانوں پر تقسیم نہیں کیا جاتا بلکہ مرکزی حکومت کے تصرف میں رہتا ہے - اس کی آمدنی قومی امور پر خرچ کی جاتی تھی -

(۴) خمس :

میدان جنگ میں جس قدر مال غنیمت اکٹھا ہوتا تھا اس کا خمس (پانچواں حصہ) مرکزی حکومت کو بھیجا جاتا تھا اور چار حصے فوج میں تقسیم کر دیے جاتے تھے -

(۵) جذیہ :

غیر مسلم رعایا سے جبراً فوجی خدمت نہیں لی جاتی - چونکہ مسلمان ان کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری لیتے تھے اس لیے غیر مسلم رعایا کو جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا - یہ ٹیکس بہت معمولی تھا اور معذور اور ضعیف، بچے، عورتیں اور راہب اس سے مستثنیٰ تھے - عہد نبوی میں صرف اہل کتاب سے ٹیکس وصول کیا جاتا تھا، مشرکین سے نہیں - اگر کوئی غیرمسلم فوجی خدمات سر انجام دیتا تو اس کو جزیہ ادا نہیں کرنا پڑتا تھا - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شام و نجران کے عیسائیوں اور بحرین کے مجوس سے جزیہ وصول کرتے تھے -

(۶) خراج :

جو علاقے مسلمان فتح کرتے تھے اور جن کی زمینیں غیر مسلموں کے قبضے میں رہتی تھیں - ان کو لگان ادا کرنا پڑتا تھا یہ خراج کہلاتا تھا - اس کی شرح پیداوار کے نصف حصہ تک مقرر ہوتی تھی - خراج کی ابتدا فتح خیبر کے موقع پر ہوئی جب یہودیوں کی زمینیں خراج کی ادائیگی کے بعد آپ نے واپس کر دیں -

(۷) عشر :

جو زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں تھیں ان سے پیداوار کا دسواں حصہ بطور عشر وصول کیا جاتا تھا - اگر زمین کا کوئی قطعہ مصنوعی آبپاشی سے سیراب کیا جاتا تھا تو اس کا مطالبہ دسویں حصے کی بجائے بیسواں حصہ مقرر کر دیا جاتا تھا -

(۸) صدقات :

یہ وہ رقم تھی جو مسلمان خود ہی بیت المال کے اخراجات پورے کرنے کے لیے دیتے تھے - اس کو انفاق فی سبیل اللہ کہتے تھے -

مندرجہ بالا ذرائع سے جو رقم فراہم ہوتی تھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اپنی مرضی سے خرچ کرتے تھے یا عوام میں تقسیم کر دیتے تھے۔ تقسیم کے وقت اہل اسلام کی حاجات و ضروریات کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ آمدنی اور خرچ کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا تھا۔ بیت المال کی کوئی عمارت نہ تھی اور نہ ہی اس کا کوئی مستقل عملہ تھا۔

پھر معاشی مسئلہ کو تنہا قانون ہی کے زور سے حل نہیں کیا گیا بلکہ اخلاقی ذرائع سے بھی اسے سلجھانے کی کوشش کی گئی۔ مدینہ کی مرکزی سوسائٹی میں سماجی مساوات کے ساتھ اقتصادی اخوت کا انتہائی کامیاب تجربہ محسن انسانیت نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ سارا عرب دیکھ رہا تھا کہ گھروں سے اکھڑے ہوئے لوگ تہی دست، غلام، فاقہ مست بدو، اللہ مست قسم کے نوجوان جب اسلام کے سایہ رحمت میں چلے جاتے ہیں تو ایک طرف تو وہ بڑے بڑے خاندانی اشراف کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ اور پھر وہ کس بے خوفی سے متکبر ترین مخالفین کو چیلنج کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف ان کی ساری پریشانیوں کا مداوا ہونے لگتا ہے۔ ٹھکانہ بھی مل جاتا ہے، روزگار بھی پیدا ہو جاتا ہے، اسلحہ بھی مہیا ہو جاتا ہے۔ اسلام کی یہ برکات صرف مدینہ تک ہی محدود نہ تھیں، بلکہ چاروں طرف آہستہ آہستہ پھیلنے لگی تھیں اور ایک دن آیا کہ سارا عرب ان سے یکساں فیض یاب تھا۔

سوالات

۱۔ اسلام کے ظہور سے قبل عربوں کی تاریخ کو زمانہ جاہلیت کیوں کہتے ہیں۔

۲۔ اسلام کے ظہور سے قبل عربوں کی تعلیمی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور اخلاقی حالت کیا تھی۔

۳۔ اسلامی تعلیمات کی بدولت عربوں کے تعلیمی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور اخلاقی حالات میں کیا تغیرات وقوع پذیر ہوئے؟

۴۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلامی ریاست کا نظام حکومت کیا تھا؟

۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اسلامی ریاست کی آمدنی کے وسائل کیا تھے؟

نواں باب

قائدین بیداری و آزادی ملت اسلامیہ

تاریخ اسلام عروج و زوال کی داستانوں سے بھری پڑی ہے - جہاں ملت اسلامیہ نے عہد رسالت، خلافت راشدہ ، دور بنو اُمیہ ، خلافت عباسیہ ، خلافت عثمانیہ ، سلطنت دہلی، سلطنت مغلیہ وغیرہ کی صورت میں عروج و کمال اور شوکت و جلال دیکھا ہے، وہاں بغداد کی تباہی، اندلس سے مسلمانوں کے اخراج ، سلطنت مغلیہ کی بربادی، خلافت عثمانیہ کے خاتمہ وغیرہ کی صورت میں زوال سے بھی دوچار ہونا پڑا- اٹھارویں صدی عیسوی میں ملت اسلامیہ کے جس زوال کا آغاز ہوا وہ ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم اول کے خاتمہ پر نقطہ انتہا تک پہنچ گیا - مسلمانوں کی سلطنتوں اور وطنوں پر یورپ کے نصرانی سامراجی بالواسطہ و بلاواسطہ قابض ہو گئے - عرب میں صرف نجد کا ریگستان ان کی دستبرد سے باہر رہ گیا تھا - گذشتہ دو صدیوں میں بے شمار مسلمان قائدین ملت اسلامیہ کو اس زوال سے بچانے اور اس زوال کی حالت سے نکالنے کے لیے جد و جہد کرتے رہے ہیں - ملت اسلامیہ ان سب قائدین کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے - لیکن ان میں سے چار قائدین، سید جمال الدین افغانی، مولانا محمد علی جوہر، علامہ محمد اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح کی خدمات مسلمانوں کو بیدار کرنے اور انہیں آزادی دلانے کے سلسلے میں بہت نمایاں ہیں - ان قائدین کے حالات زندگی کی تفصیلات ذیل کے صفحات میں بیان کی جا رہی ہیں -

سید جمال الدین افغانی (رح)

"شیر جہاں جاتا ہے اپنی غذا خود تلاش کر لیتا ہے"- یہ ہیں اس سیاسی شہباز کے تاریخی الفاظ جس نے ایران چھوڑتے وقت شاہ ایران کی مالی اعانت کو ٹھکراتے ہوئے کہے تھے - اور انتہائی بے سرو سامانی کے باوجود قلندرانہ اعتماد کے ساتھ عازم سفر ہو گئے - دنیا انہیں جمال الدین افغانی کے نام سے جانتی پہچانتی ہے - دشمن بھی آپ کی انقلابی شخصیت کے معترف ہیں - حق یہ ہے کہ انیسویں صدی عیسوی میں دنیائے اسلام میں اتنی جامع الحیثیات اور فعال شخصیت ان سے بڑھ کر کوئی اور تھی ہی نہیں -

سید موصوف عالم اسلام کے اتحاد کے پرجوش مبلغ اور آزادی و شوکت اسلام کے زبردست داعی تھے - ان کی مضطرب طبیعت انہیں تمام عمر ملک بہ ملک لیے پھری - کبھی ہندوستان ، کبھی ایران ، کبھی مصر ، کبھی ترکیہ ، کبھی فرانس اور کبھی روس میں - گویا آپ ساری عمر جہاں گرد مبلغ اسلام

بنے رہے ۔ اور جہاں جہاں گئے اپنی مقناطیسی شخصیت اور مسحور کن انداز بیان کے طفیل سب کو گرویدہ بنا لیا ۔

سید جمال الدین افغانی ۱۸۳۸ء میں افغانستان میں اسد آباد کے مقام پر پیدا ہوئے ۔ بعض لوگ آپ کا مولد ایران بھی بتلاتے ہیں ۔ مگر زیادہ تر نسبت افغانستان کے ساتھ ہی دی جاتی ہے، اور یہی قرین قیاس بھی ہے ۔

آپ کے والد محترم کا نام سید صفدر تھا، جو سید علی الترمذی کی اولاد میں سے تھے اور کابل میں آکر قیام پذیر ہوگئے تھے ۔ انھیں آپ کی تعلیم و تربیت میں بے حد دلچسپی تھی ۔ چونکہ جمال الدین بچپن سے ذکی اور ہونہار تھے اس لیے بہت جلد مختلف علوم میں دسترس حاصل کرلی ۔ ۱۸ سال کی عمر سے قبل آپ اکثر اسلامی علوم و فنون بشمول فلسفہ، تاریخ، حدیث، تفسیر، فقہ، ریاضی، طب، تصوف، نجوم اور دیگر سائنسی علوم سے فارغ ہو چکے تھے ۔ آپ علم کے بحر ذخار اور حقیقی مضمون میں نابغہ روزگار تھے ۔

علم سے آراستہ ہونے کے بعد آپ جہاد زندگی پہ کمر بستہ ہوگئے ۔ آپ کا مشن بالکل واضح تھا ۔ مسلمانان عالم کو محکومی سے نجات دلانا اور انھیں آپس میں متحد کرنا ۔ احیائے اسلامی اور شوکت اسلام ان کے حقیقی مطلوب و مقصود تھے ۔ یہ بڑا کٹھن کام تھا، مگر جمال الدین کے آگے کٹھن سے کٹھن کام موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا، بلکہ مشکلات سے کھیلنا ان کا مشغلہ تھا ۔ چنانچہ آپ بد سے بد تر حالات سے کبھی بے دل نہ ہوئے ۔ ہمیشہ امید و عمل اور یقین و اعتماد کے سہارے آگے اور آگے ہی بڑھتے رہے ۔ دنیا حیران ہے کہ کس طرح ایک غریب پہاڑی نوجوان اپنے وقت کے بڑے بڑے تاجداروں اور عظیم شخصیتوں کی توجہ کا مرکز بن گیا ۔ حق یہ ہے آپ کے انقلابی پروگرام اور زبردست تحریک عمل سے تمام سامراجی طاقتیں ہر وقت لرزہ براندام رہتی تھیں ۔ جس ملک میں آپ قدم رکھتے، شاہوں کو اپنے تاج کے چھن جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا تھا ۔

کہتے ہیں آپ بمشکل اٹھارہ سال کے ہوں گے کہ ہندوستان تشریف لے گئے اور سال بھر پھرتے پھراتے رہے، اس وقت انگریز حکمران تھے اور صورت حال سخت پریشان کن تھی ۔ چنانچہ لاوا پھٹا اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اہل ہند نے بدیشی حکمرانوں پر زبردست وار کیا مگر ناکامی ہوئی ۔ اس وقت سید صاحب مکہ شریف میں تھے ۔ اور سعادت حج سے سرفراز ہو چکے تھے ۔ حج کے بعد آپ کابل آئے جہاں دوست محمد والی افغانستان نے آپ کا پرجوش استقبال کیا اور حکومت میں اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا ۔ چنانچہ بہت جلد آپ عوام اور خواص میں مقبول ہو گئے ۔ جب دوست محمد کی وفات پر شیر علی تخت نشین ہوا تو وہ سید صاحب کے خلاف ہوگیا، کیونکہ وہ آپ کے ترقی پسندانہ خیالات اور اصلاحی اقدامات سے سخت خائف تھا ۔ لہذا آپ نے کابل کو خیرباد کہا ۔

کابل سے آپ حج کی نیت سے عازم حجاز ہو گئے ۔ چونکہ ایران نے خشکی کے راستے نہ جانے دیا لہذا آپ ۱۸۶۹ء میں ہندوستان میں داخل ہوگئے ۔ یہاں حکومت وقت نے آپ کو عزت و احترام سے رکھا ۔ انگریز عیار اور چالاک تھے، اس لیے آپ کو یہاں کے دیسی رہنماؤں سے کھلے بندوں نہ ملنے دیا ۔ آپ پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی ۔ کہتے ہیں آپ نے ایک موقعہ پر اہل ہند کو خطاب کرکے کہا تھا کہ تم تعداد میں اتنے زیادہ ہو اگر تم صرف مکھیاں ہی بن جاؤ تو انگریزوں کو ملیا میٹ کر دوگے ۔ ظاہر ہے انگریز ایسے انقلابی انسان سے کیسے چشم پوشی کر لیتے ۔ چنانچہ انہوں نے آپ کو حکومت کے بحری جہاز میں سویز بھجوا دیا ۔

مصر سے آپ سیدھے استنبول پہنچے جو سلطنت عثمانیہ کا دارالسلطنت تھا ۔ یہاں حکومت وقت نے آپ کو اعزاز و احترام سے رکھا ۔ علما و فضلا اور عوام میں بہت جلد مقبولیت حاصل کرلی ۔ وہی احیائے اسلام کی باتیں اور شوکت اسلام کے ترانے ۔ کون سنگدل تھا جو وجد میں نہ آ جاتا ۔ آپ کی بڑھتی ہوئی شہرت سے سلطنت عثمانیہ کے شیخ الاسلام سخت گھبرائے ۔ چنانچہ استنبول یونیورسٹی میں سید صاحب کی تقریر کے بعض اقتباسات پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرکے آپ کے خلاف فتنہ کی آگ کو خوب بھڑکا دیا ۔ حکومت عثمانیہ صورت حال سے خائف ہو گئی اور مرد قلندر کو سلطنت عثمانیہ سے چلے جانے کا حکم دے دیا ۔ آپ پھر ۱۸۷۱ء میں دوبارہ قاہرہ چلے گئے ۔

آپ ۱۸۷۱ء سے مارچ ۱۸۷۹ء تک قاہرہ میں مقیم رہے ۔ تعلیم یافتہ حضرات سے آپ کے تعلقات کہیں زیادہ گہرے اور مضبوط تر ہوگئے ۔ اسلامی فلسفہ، فقہ، مذہب اور سائنسی علوم پر آپ کے پرجوش لیکچروں سے مصری فضلا اور نوجوان بہت زیادہ متاثر ہوئے ۔ آپ بہت سے نوجوانوں میں اسلامی روح پیدا کرنے میں خاصے کامیاب ہوئے ۔ چونکہ عالم اسلام کا احیا اور اتحاد آپ کا محبوب موضوع ہوتا تھا ۔ اس لیے انگریزوں کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ سید موصوف کو اپنے لیے خطرے کی گھنٹی سمجھنے لگے ۔ چنانچہ انہوں نے بڑی عیاری سے قدامت پسند علما کو سید صاحب کے خلاف محاذ آرا کر دیا ۔ اب برطانوی گورنر جنرل کو موقع مل گیا کہ اپنا الو سیدھا کر سکے ۔ چنانچہ مصری حکومت کو مشورہ دیا گیا کہ جمال الدین کو فی الفور مصر سے نکال دیا جائے اور اسی میں ہی مصری حکومت کی بھلائی کا راز مضمر ہے ۔ نتیجتاً ہم دیکھتے ہیں کہ سید موصوف مارچ ۱۸۷۹ء میں قاہرہ کو الوداع کہتے ہوئے حیدر آباد دکن کی جانب عازم سفر ہو جاتے ہیں ۔ حیدر آباد میں قیام کے دوران آپ نے مشہور مقالہ "رد مادیین" لکھا جو اس موضوع پر بڑی دقیع تحریر سمجھی جاتی ہے ۔ یہاں رہ کر سید صاحب نے کیا کیا امور سرانجام دیے ان کا پتہ نہیں چل سکا ۔ البتہ ظاہر ہے آپ برابر اپنے محبوب خیالات کو پھیلاتے رہے ہوں گے ۔ بہر حال جب ۱۸۸۲ء میں مصر میں فوجی بغاوت ہوئی تو سید صاحب کو اس میں ملوث سمجھا گیا اور ہندوستان کی حکومت نے آپ کو کلکتہ بلا کر نظر بند کر دیا ۔ بغاوت سرد ہو جانے کے بعد

آپ کو رہا کر دیا گیا یہاں سے سید صاحب لندن پہنچے اور وہاں اتحاد اسلامی کے لیے ایک رسالہ "العروة الوثقیٰ" نکالا جو اپنے سیاسی اور ادبی تاریخی مضامین کے اعتبار سے بہت بلند معیار کا سمجھا جاتا تھا - یہ رسالہ برطانوی سامراج کی گھناؤنی سازشوں کو بے نقاب کرتا اور محکوم قوموں کو انگریزوں کے خلاف عملی جدوجہد کرنے کے لیے بڑے مؤثر انداز میں اکساتا رہتا تھا - یہی وجہ ہے کہ اس رسالے کا داخلہ ہندوستان میں ممنوع قرار دیا گیا - ہم کہہ سکتے ہیں کہ جمال الدین افغانی اس رسالے کی اشاعت سے اتحاد عالم اسلام کا راستہ ہموار کر رہے تھے -

پیرس میں رہ کر آپ نے مغربی سامراج پر خوب تابڑ توڑ علمی و فکری حملے کیے - مگر پیرس آپ کی مضطرب اور پر شور طبیعت کے لیے کافی نہ تھا - آپ پھر لندن گئے اور وہاں کی اہم شخصیتوں مثلاً لارڈ سالسبری سے بین الاقوامی معاملات پر تبادلہ خیال کیا - روس تشریف لے گئے اور چار سال تک وہیں مقیم رہے - زار روس آپ کی بڑی قدر کرتا تھا اور ان کے طفیل مسلمانوں کو قرآن حکیم اور دیگر مذہبی کتابوں کے چھاپنے کی اجازت ملی - اسی طرح آپ جرمنی بھی گئے جہاں آپ کی شاہ ایران ناصر الدین قاچار سے دوبارہ ملاقات ہوگئی - وہ ان سے اتنے متاثر ہوئے کہ آپ کو وزارت عظمیٰ کی پیش کش کر دی اور بالاخر سید صاحب رضا مند ہوگئے -

عجیب بات ہے یہ اعلیٰ عہدہ آپ کو راس نہ آیا - عوام اور دانشوروں میں آپ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے قاچار خائف ہو گیا اور آپ کے خلاف سازش کی ٹھانی، سید صاحب بھانپ گئے اور ملک چھوڑ کر چلے جانے کی اجازت مانگی مگر آپ کو اجازت نہ دی گئی - چنانچہ آپ نے جواباً قاچار کی مطلق العنان حکومت کے غلط کاموں پر کھلی تنقید شروع کر دی - آپ گرفتار ہوئے اور ملک سے نکال دیے گئے اور شاہ ایران بھی ۱۸۹۵ء میں قتل کر دیے گئے -

سید موصوف کچھ عرصہ یورپ میں پھرتے پھراتے رہے - یہاں تک کہ آپ ۱۸۹۱ء میں لندن پہنچ گئے - ۱۸۹۲ء میں پھر قسطنطنیہ چلے گئے جہاں عثمانی خلیفہ نے آپ کا پرجوش استقبال کیا اور آپ کو رہائش وغیرہ کی جملہ سہولتیں مہیا کی گئیں - آپ نے اپنا پرانا مشن جاری رکھا - بالاخر ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو کینسر کے موذی مرض سے وفات پا گئے اور آپ کو اعزاز و اکرام کے ساتھ سپرد خاک کر دیا گیا - یہ شبہ بھی پایا جاتا ہے کہ آپ کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا -

سید صاحب بڑے دلیر، باہمت اور صاحب عمل انسان تھے - آپ کی شخصیت میں مقناطیسی کشش تھی - جو بھی آپ سے ملتا آپ کا مرید بن کر رہ جاتا - عمل آپ کا پیشہ اور بے باکی آپ کی طبع تھی - آپ نہایت فصیح اللسان اور پرجوش خطیب تھے -

جمال الدین طبعاً متواضع ، سادہ اور خوش خلق انسان تھے - نہایت محنتی اور جفاکش، آپ نے ہمیشہ عظیم تر قومی مفادات کے لیے کام کیا - اور کئی بار اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا - اسلام

آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا اور یہی آپ کی کل متاع تھی ۔

سید موصوف نابغہ روزگار تھے ۔ آپ کی ذہانت و فطانت ضرب المثل بن گئی تھی ۔ پھر قدرت نے آپ کو زبان کا ملکہ بہت وافر عطا فرمایا تھا ۔ آپ بہت ساری زبانیں روانی سے بول اور لکھ لیتے تھے ۔ عربی، فارسی، ترکی، پشتو، انگریزی، فرانسیسی اور روسی زبان سے آپ کی اچھی خاصی شناسائی تھی ۔ اور عربی، فارسی، پشتو پر آپ کا عبور انتہائی فاضلانہ تھا ۔ بہرحال ان مختلف زبانوں کے طفیل آپ مختلف قوموں سے ان کی زبان کے ذریعے ہم کلام ہوتے ۔ یہی وجہ ہے آپ نے مختلف زبانوں میں اپنے پمفلٹ چھاپے ۔ چونکہ آپ کی زندگی بڑی مصروف اور پرشور تھی اس لیے جم کر تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ نہ ہو سکے ۔ پھر بھی آپ اپنے بعد بہت سارے سیاسی و علمی مضامین اور کئی بلند پایہ علمی رسالے چھوڑ گئے ۔ وقت کی بڑی شخصیتوں نے آپ کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور بعد میں آنے والی بڑی اہم شخصیتیں آپ سے متاثر ہوئی ہیں ۔ علامہ اقبال آپ کے زبردست مداح تھے ۔ ادھر یورپ میں مشہور مصنف ایڈورڈ براؤن آپ سے بے حد متاثر تھا ۔ بہرحال آپ جیسی اور ہمہ گیر انقلابی شخصیت مشرق و مغرب میں انیسویں صدی میں کہیں بھی موجود نہ تھی ۔

مولانا محمد علی جوہر

مولانا محمد علی ہندوستان کے سیاستدانوں میں ایک مقتدر مقام رکھتے تھے ۔ ان جیسا عظیم محب وطن شاید ہی کسی ماں نے جنا ہو ۔ ۱۹۳۱ء میں لندن میں گول میز کانفرنس کے موقع پر مولانا محمد علی جوہر نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

"میں ایک آزاد انسان کی حیثیت سے اپنے وطن لوٹنا چاہتا ہوں اگر تم اسے قبول نہیں کرتے تو تمہیں مجھے یہیں پر قبر کے لیے جگہ دینی ہوگی" ۔

ان کے یہ الفاظ سچے ثابت ہوئے اور چند ہی ہفتے بعد ان کا لندن میں انتقال ہوگیا ۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے اور ان میں انگریزوں سے ٹکر لینے کا حوصلہ پیدا کرنے میں مولانا محمد علی نے بہت اہم کردار ادا کیا ۔ سر سید احمد خان اور ان کے رفقاء کی فرنگی حکومت کے ساتھ تعاون کی پالیسی کے رد عمل کے طور پر مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے نابغہ روزگار لوگ میدان سیاست میں اسلام کی آفاقیت اور ہمہ گیریت کا نعرہ لے کر میدان میں آئے اور مسلمانوں میں خلافت کے احیاء کے لیے جد و جہد کا جذبہ بیدار کیا ۔

آپ ۱۸۷۸ء میں رام پور کے ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ آپ کی عمر ابھی دو سال تھی جب آپ کے والد عبدالعلی خان فوت ہوگئے ۔ ان کی والدہ عابدہ بانو نے جو ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں انھیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے پہلے بریلی اور پھر علیگڑھ بھیجا ۔ وہاں پر مولانا محمد علی ادبی حلقوں میں جلد ہی بہت مقبول ہوگئے ۔ وہاں قیام کے دوران انھوں نے اہم نصابی سرگرمیوں میں بھی

بھرپور حصہ لیا اور جلد ہی ایک اچھے طالب علم ، شاعر ، مقرر اور ادیب کی حیثیت سے ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی ۔

۱۸۹۶ء میں جب ان کی عمر ۱۸ سال کی ہوئی انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے بی - اے کا امتحان اول درجے میں پاس کیا ۔ سجاد حیدر یلدرم کے کہنے کے مطابق مولانا محمد علی کے یونیورسٹی سے جانے کے بعد انگریزوں نے سکھ کا سانس لیا ۔ کالج کے مباحثوں اور مذاکروں میں ملکی اور بین الاقوامی معاملات پر ان کی بیباکانہ رائے انگریز پروفیسروں کو خوفزدہ کر دیتی تھی ۔ انگلستان میں وہ ۴ سال تک لنکن کالج میں رہے اور تاریخ جدید میں بی - اے آنرز کی ڈگری حاصل کی انھیں کیمبرج یونیورسٹی میں ہندوستانی مجلس کے پہلے صدر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا ۔ برطانیہ سے واپسی کے بعد مولانا محمد علی ریاست رام پور میں چیف ایجوکیشن آفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے ۔ لیکن جلد ہی خاطر خواہ تعلیمی اصلاحات کے نفاذ پر ان کا افسران اعلیٰ سے اختلاف ہوگیا ۔ اور انہوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے کر ریاست بڑودہ کی سول سروس میں شمولیت اختیار کر لی ۔ وہاں وہ سات سال تک رہے ۔ وہاں رہ کر انھوں نے ”ٹائمز آف انڈیا“ میں بہت سے مضامین لکھے ۔ اور ان کا ایک مضمون ”موجودہ بے چینی کے اسباب“ بہت مقبول ہوا ۔ ان کی متانت اور سیماب صفت شخصیت سول سروس کے قیود کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی ۔ قدرت نے انھیں کسی اعلیٰ مقصد کی تکمیل کے لیے پیدا کیا تھا ۔ ہندوستانیوں کی غربت اور مسائل نے ان کے دل و دماغ میں آگ لگا دی ۔ انہوں نے اپنی ملازمت چھوڑ دی اور جنوری ۱۹۱۱ء میں کلکتہ آکر اپنا رسالہ ہفت روزہ ”کامریڈ“ نکالنا شروع کر دیا ۔ انھیں ہندوستان کی ایک ریاست کے وزیر اعلیٰ کا عہدہ پیش کیا گیا لیکن انہوں نے اس حکم نامے کو اس وقت تک نہ پڑھا جب تک کہ ان کے رسالے کامریڈ کا پہلا شمارہ منظر عام پر نہ آ گیا ۔

مولانا محمد علی ایک مثالی صحافی تھے ۔ انھوں نے غیر ملکی حکومت کے خلاف ہندوستانیوں کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ظالمانہ صحافتی قوانین کے خلاف آواز بلند کی ۔ ان کے رسالے کامریڈ نے آزادی صحافت کی ایک عمدہ مثال پیش کی ۔ اپنے بیباک رویے اور عمدہ زبان کی وجہ سے کامریڈ رسالہ چھوٹے بڑے تمام حلقوں میں جلد ہی بہت مقبول ہوگیا ۔ یوپی کا ایک سابق گورنر اس کی جلدیں اپنے ساتھ انگلینڈ بھی لے گیا ۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ اپنے نقطہ نظر کے اعتبار سے حکومت کے زیادہ سے زیادہ خلاف ہوتے چلے گئے ۔ ۱۹۱۴ء میں جب ترکیہ کو پہلی جنگ عظیم میں ملوث کر لیا گیا تو مولانا نے ۳۶ گھنٹے کی مسلسل نشست کے بعد مشہور زمانہ اداریہ "The choice of the Turks" (ترکوں کا فیصلہ) لکھا جو کہ اسی عنوان کے تحت لندن ٹائمز میں لکھے گئے اداریے کے جواب میں تھا ۔ حکومت نے اسے خطرناک قرار دے کر اس کی ضمانت ضبط کر لی ۔

۱۹۱۱ء میں جب دارالخلافہ کلکتہ سے دہلی منتقل ہوا تو مولانا نے بھی ۱۹۱۲ء میں کامریڈ کو دہلی میں منتقل کر دیا ۔ اس نے مولانا آزاد کے "الہلال" اور مولانا ظفر علی خان کے "زمیندار" کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی بیداری میں اہم کردار ادا کیا ۔ مولانا محمد علی نے ۱۹۱۳ء میں دہلی سے ایک اردو روزنامہ ہمدرد بھی جاری کیا ۔ اس میں انھوں نے اپنی زندگی کے حالات لکھے ۔ یہ وہ واحد تحریر ہے جو انھوں نے اپنے بارے میں چھوڑی ہے ۔ اس میں انھوں نے اس بات کی وضاحت کی کہ وہ کون سے عوامل تھے جن کی بنا پر انھیں سیاست کی جانب مائل ہونا پڑا ۔ بالعموم ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو آزادی کے حصول کے لیے تیار کرنے میں مولانا نے بہت بڑا کردار ادا کیا ۔ ان کی بے مثال قیادت میں مسلمان ایک عظیم قوم بن گئے ۔ مسلمانوں کے دلوں میں ان کے لیے بہت محبت تھی ۔ ۱۹۰۶ء میں جب ڈھاکہ میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو محسن الملک اور وقار الملک کے ساتھ وہ بھی موجود تھے ۔

۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کا اعلان ہوا اور یورپی طاقتیں ترکیہ کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں تو انھوں نے ترکیہ کی امداد کے لیے چندے کی اپیلیں کیں اور طبی وفد ترکیہ بھیجا ۔ یہ خیر سگالی کا پہلا وفد تھا جو ملک سے باہر بھیجا گیا ۔ اس سے ترکوں پر بہت اچھا اثر ہوا ۔ ترکوں کے لیے چلائی جانے والی تحریک نے ہندوستان میں تحریک اتحاد عالم اسلام کے لیے راہ ہموار کی ۔

۱۹۱۳ء میں جب مچھلی بازار کانپور میں فائرنگ ہوئی تو اس سے پورے ہندوستان میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی محمد علی جیسا حساس انسان اس سانحے کو برداشت نہ کر سکا اور آپ نے مسلم لیگ کے سیکریٹری سید وزیر حسن کی سرکردگی میں ایک وفد انگلستان بھیجا ۔ آپ نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے کانپور کے مسئلے کے عزت مندانہ حل کے لیے بھرپور کوششیں کیں ۔ لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا ۔ اس کے واپس آنے کے چند ہی مہینوں بعد پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی ۔ ترکیہ جرمنوں کا حلیف تھا اور محمد علی ترکیہ کے متعلق انگریزوں کو ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے ۔

جنگ کے دوران برطانوی حکمران محمد علی جیسے بہادر اور با اثر نقاد کو گوارا نہیں کر سکتے تھے ۔ لہذا انھیں پانچ سال کے لیے (۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۹ء) جیل بھیج دیا گیا ۔ جب ۱۹۱۹ء میں وہ رہا ہوئے تو بین الاقوامی افق پر بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں ۔ جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی اور ترک معاہدہ ورسائی کے تلے دبے جا رہے تھے اور ان کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا ۔ وزیر اعظم برطانیہ لائڈ جارج تو اسے دنیا کے نقشے سے مٹا دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا ۔ اس سے ہندوستان کی سیاسی فضا مکدر ہوگئی ۔ پنجاب میں مارشل لاء لگا دیا گیا جس کے دوران جلیانوالا باغ کا خوفناک واقعہ پیش آیا ۔ آپ نے ترکوں کے لیے امداد کی جو اپیل کی اس کا انقلابی رد عمل ہوا ۔ ہندوستان کے ہر

مرد اور عورت نے اس میں اپنی استطاعت کے مطابق حصہ لیا۔ اس نے کانگرس کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ترکیہ کے معاملے میں مسلمانوں کا ساتھ دے اور مولانا کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ جلیاں والا باغ کے حادثے اور خلافت کی عدم بحالی کے بعد ۱۹۲۱ء میں کانگرس نے ناگپور میں عدم تعاون کی تحریک کی قرارداد پاس کی۔ ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۲۱ء تک انھوں نے ہندوستان کے طوفانی دورے کیے اور اپنے دن رات ریلوے کے ڈبوں میں گزارے۔ ۱۹۲۱ء میں کراچی میں خلافت کانفرنس ہوئی جس میں یہ قرارداد پاس ہوئی کہ برطانوی حکومت میں نوکری کرنا مسلمانوں کے لیے حرام اور ناجائز ہے۔ اس پر ستمبر ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور حسین احمد مدنی پر مقدمہ چلایا گیا اور انھیں دو دو سال کے لیے قید سخت کی سزا ہوئی اس سزا کے خلاف پورے ہندوستان میں مظاہرے ہوئے"۔ وہ ابھی جیل ہی میں تھے کہ مصطفیٰ کمال نے ترکیہ میں خلافت ختم کر دی جس سے ہندوستان میں بھی تحریک خلافت دب کر رہ گئی۔ ۱۹۲۳ء میں مولانا محمد علی جوہر جیل سے رہا ہوئے اور انڈین نیشنل کانگرس کے صدر نامزد ہوئے۔ ۲۴-۱۹۲۳ء میں پنڈت مدن موہن مالویہ وائسرائے کے ساتھ ساز باز کرکے جیل سے رہا ہوگئے اور انھوں نے سوامی شردھا نند کے ساتھ مل کر شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں شروع کر دیں۔ جس سے پورے ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ اس سے علی برادری کی شبانہ روز کوششوں کے باوجود ہندو مسلم اتحاد کا محل مسمار ہوگیا۔ محمد علی جوہر نے ان فسادات کو روکنے کی از حد کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔

وہ ایک سچے مسلمان تھے۔ ۱۹۲۷ء میں انھوں نے موتمر عالم اسلامی میں شرکت کی۔ یہ کانفرنس سلطان ابن سعود نے مکہ میں بلائی تھی۔ وہاں جب سبھی لوگ پر جلال بادشاہ کے سامنے سہمے بیٹھے تھے۔ مولانا محمد علی نے بے باکانہ اظہار کیا۔ تجاویز دہلی کی تیاری میں انھوں نے قائداعظم محمد علی جناح کی مدد کی جس میں دوسرے مطالبات کے علاوہ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں اصلاحات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد ہندو مسلم اتحاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ ۱۹۲۸ء میں کلکتہ میں جو آل پارٹیز کانفرنس ہوئی اس میں مولانا نے مصالحت کی ازحد کوشش کی مگر انھیں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ۱۶ سال کی طویل جد و جہد کے بعد انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے اپنی راہ عمل کو تبدیل کر لیا۔ اب ان کی صحت جواب دے چکی تھی ان کا دل ٹوٹ چکا تھا اور وہ مایوسیوں کا شکار ہوگئے تھے۔

وہ ۱۹۳۱ء میں لندن میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے اپنی زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہوئے اور وہیں ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو وفات پائی اور بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کے زیر سایہ

دفن ہوئے - علامہ اقبال نے ان کے بارے میں کہا ہے :

سوئے گردون رفت زان راہے کہ پیغمبر گزشت

(مولانا اس راستے سے جنت کی طرف چلے گئے جس راستے سے پیغمبر اسلام گئے تھے)

علامہ محمد اقبال (رح)

علامہ محمد اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے - کشمیری برہمنوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے - سوا دو سو سال قبل آپ کے جد اعلیٰ ایک مسلمان درویش کے معتقد ہو کر مسلمان ہوئے اور کشمیر سے ترک وطن کر کے پنجاب کے مقام سیالکوٹ میں سکونت پذیر ہو گئے علامہ موصوف تربیت کے لحاظ سے نہایت خوش قسمت تھے - ان کے والدین گہرے مذہبی تھے - دونوں کے اخلاق بھی بہت اعلیٰ تھے - ان کے والد نور محمد صاحب صوفی منش تھے اور اپنی دینداری اور اخلاق پاکیزگی کے باعث سیالکوٹ اور آس پاس کے علاقوں میں قابل احترام سمجھے جاتے تھے - ان کی مذہبیت و روحانیت کے جو اثرات شروع ہی میں اس ہونہار بچہ پر پڑے وہ زندگی بھر قائم و راسخ رہے - اقبال کی والدہ بھی نہایت دیندار خاتون تھیں - ان کی تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا -

ابتدا ہی سے ان کی قابلیت کے جوہر نمایاں تھے - متعدد ابتدائی درجوں کے امتحانوں میں فرسٹ آنے کے بعد مڈل اور انٹرنس کے امتحانات میں سرکاری وظیفہ کے مستحق ٹھہرے - خوش قسمتی سے اس زمانے کے عربی و فارسی کے ایک بہت ہی قابل استاد مولانا سید امیر حسن کی شاگردی اقبال کو دستیاب ہو گئی جن کی تعلیم کا خاصہ یہ تھا کہ جو لوگ ان سے عربی یا فارسی کی تعلیم حاصل کرتے تھے ان کی طبیعت میں وہ اس زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے تھے - اقبال نے یہ دونوں زبانیں اس فاضل استاد سے سیکھیں اور ان میں کمال حاصل کیا اعلیٰ دینی و اخلاق تربیت والدین کے آغوش تربیت اور ظل عاطفت میں مل چکی تھی - علمی قابلیت و استعداد اس فاضل و شفیق استاد کے فیض صحبت سے حاصل ہوئی - طالب علمی ہی کے زمانہ سے اقبال کی شاعری کا آغاز ہوگیا تھا اور وہ بھی بڑی حد تک اس استاد گرامی قدر کی رہین منت تھی - طالب علمی ہی کے زمانہ میں اردو کے مشہور شاعر استاد فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی کے پاس اپنی بعض غزلیں بغرض اصلاح ڈاک سے ارسال کیں - ان کی ابتدائی غزلوں ہی سے داغ کی نگاہ نکتہ رس یہ پہچان گئی کہ یہ کسی معمولی طالب علم کا نومشقی کلام نہیں اور چند ہی غزلوں پر نظر اصلاح ڈالنے کے بعد انہوں نے کہہ دیا کہ اس کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت ہی کم ہے - استادی و شاگردی کا یہ تعلق بہت تھوڑی مدت تک قائم رہا لیکن اس کی یاد طرفین میں باقی رہ گئی - داغ کی زندگی ہی میں اقبال کی ملک میں شہرت ہو چکی تھی اور اس بنا پر داغ ہر دم فخر کرتے تھے -

ایف - اے تک تعلیم سیالکوٹ ہی میں حاصل کی اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں بی - اے کی

جماعت میں داخل ہو گئے - یہاں ان کی خوش قسمتی سے مشہور مستشرق پروفیسر سر ٹامس آرنلڈ فلسفہ کے پروفیسر تھے - اقبال کو فلسفہ سے گہری دلچسپی تھی - پروفیسر آرنلڈ کی خصوصی توجہ نے ان کی قابلیت کو درجہ کمال پر پہنچا دیا - علامہ نے بی - اے کا امتحان امتیاز خاص کے ساتھ پاس کیا جس کے صلہ میں ماہوار وظیفہ کے ساتھ انہیں دو طلائی تمغے بھی ملے اس کے بعد وہ ایم - اے میں بھی اول آئے اور نانک بخش میڈل کے مستحق ٹھہرے - ان کی قابلیت سے پروفیسر آرنلڈ بہت متاثر تھے - دونوں میں انتہائی محبت قائم ہوگئی تھی - عربی و فارسی علوم میں مولانا امیر حسن اور مغربی علوم کی تحصیل و تکمیل میں پروفیسر آرنلڈ کی مشفقانہ رہبری اقبال کو اوج کمال پر پہنچانے کا خاص ذریعہ بنی - پروفیسر آرنلڈ ۱۹۰۴ء میں انگلستان واپس چلے گئے لیکن اقبال کے دل میں ایسا علمی ذوق پیدا کر گئے کہ جلد ہی وہ مغربی تعلیم کی تکمیل کے لیے ۱۹۰۵ء میں انگلستان روانہ ہو گئے اس درمیانی مدت میں وہ اولاً اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ فلسفہ اور سیاسیات کے پروفیسر اور پھر فلسفہ اور انگریزی کے پروفیسر رہے -

انگلستان پہنچ کر اقبال وہاں کی مشہور دارالعلوم کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے یہاں انہوں نے نامور اساتذہ فن ڈاکٹر میک ٹیگارٹ ، ادب ، فارسی کے مشہور مورخ اے جی - براؤن ڈاکٹر نکلسن اور پروفیسر وارڈ سارے سے علمی فیوض حاصل کیے - اقبال کے یہ اساتذہ بھی اقبال سے حد درجہ متاثر ہوئے - پروفیسر نکلسن نے تو ان کی فارسی مثنوی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ کرا کے اقبال کو یورپ کے اہل فکر سے روشناس کرایا - تین سال کی مدت میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا کیمبرج یونیورسٹی اور جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے پی - ایچ - ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں - جرمنی سے واپس آ کر لندن کے سکول آف پولیٹیکل سائنس میں داخل ہوئے - ۶ ماہ تک لندن یونیورسٹی میں اپنے استاد ڈاکٹر آرنلڈ کی جگہ قائمقام پروفیسر بھی رہے - ۳۲ سال کی عمر میں اعلیٰ علمی اعزازات اور ڈگریوں سے مالا مال ہو کر وطن واپس آئے اور لاہور میں وکالت شروع کی اور لاہور کے گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے اٹھارہ ماہ تک پروفیسر رہے - ڈاکٹر صاحب کے علمی مشاغل اور بیرسٹری میں کوئی ربط نہ تھا - لیکن چونکہ یہ آزاد پیشہ تھا اس لیے وہ اس کو اختیار کیے رہے -

یورپ جانے سے قبل ان کی شاعری کا دائرہ ہندوستان تک اور یہاں کی قومی اور ملی نظموں تک محدود تھا - اس لیے ان کی شاعری اردو ہی میں ہوتی تھی لیکن یورپ سے واپسی کے بعد ان میں تبدیلی ہوئی اور اب زیادہ تر وہ فارسی میں لکھنے لگے -

علامہ اقبال کے سیاسی تصورات کی ایک مبسوط تصنیف یا مستقل کتاب کی صورت میں تو موجود نہیں البتہ ان کی تمام تصنیفات میں ان کے بلند عقائد جواہر بیش بہا کی مانند نگاہوں کو خیرہ کرتے ہیں ان کی کشت شاعری میں صرف جمالیاتی رعنائیاں ہی نہیں بلکہ حکمت کے انمول موتی بھی ہیں دراصل اقبال کی شاعری اور سیاسی فکر میں چولی دامن کا ساتھ ہے ان کی شاعری میں جہاں ایک طرف

رنگینیاں ہیں اور عروس ہستی کی نقاب کشائی بڑے دلنشین انداز میں کی گئی ہے وہاں دوسری جانب فکر سیاست کی ضوفشانی مسافر گم کردہ راہ کو منزل کا پتہ بھی دیتی ہے - علامہ کے تخیل کو سمجھنے کے لیے اسلامی اور فلسفیانہ روایات اور سیاسی ماحول سے آگاہی بڑی ضروری ہے -

علامہ اقبال کی شاعری کی عمر کم و بیش چالیس برس ہے انھوں نے اپنی زندگی میں بیس ہزار اشعار کہے انھوں نے ان چالیس برسوں کے مختلف ادوار میں شاعری بھی کی اور رہنمائی بھی - اس اثنا میں ان کی جوئے سخن بہارستان شباب سے گنگناتی ہوئی نکلی اور صحرائے فلسفہ و حکمت کی وسعتوں کو ایک دریائے مواج کی صورت طے کرتی ہوئی بالاخر عرفان و ایقان کے یم ناپید کنار سے جا ملی اسی دوران میں ان کا جوہر طبع سخنوری کے مراحل سے گزر کر وجدان اور الہام کی قدسی رفعتوں پر جا چمکا -

علامہ صاحب نے جس دور میں اپنی شاعری کا آغاز کیا ہندوستان میں اسلامی تہذیب کے نقوش مٹ رہے تھے - انگریزوں کے ہاتھوں میں اس ملک کے باشندوں کی قسمت کی باگ ڈور تھی - علامہ کی ۱۹۰۵ء سے پیشتر کی شاعری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس دور میں محب وطن مبلغ اور ارباب وطن کے عقیدت مند کی حیثیت حاصل تھی اس دور میں نیا شوالہ کی تخلیق ہوئی - اس سادہ پرنم اور نغمہ بار نظم میں ہندو مسلم اتحاد کو ہندی اور فارسی الفاظ کے باہمی رشتے سے ظاہر کیا گیا ہے اقبال کے پیش نظر ایک قوم تھی جو قعر مذلت میں گر کر اپنی اقدار، تہذیب، تابناک ماضی اور شاندار روایات سے بے بہرہ ہوچکی تھی - علامہ کا دل مسلمانوں کی حالت پر کڑھنے لگا اور انھوں نے مسلمان قوم کو سیر و حرکت اور امید و رجاء سے بھرپور طرز فکر دے کر انھیں تباہی سے بچانے کا تہیہ کر لیا -

علامہ کی شاعری کا دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء پر محیط ہے - اس دور میں علامہ وطنیت کے مسئلہ پر اسلامی نقطہ نظر سے غور کرنے کی طرف مائل تھے - انھوں نے سیاسیات کو وطن سے علیحدہ کر کے مذہبی تمدن سے منسلک کرنے کی کوشش کی یہ بڑی اہم تبدیلی تھی - یورپ میں قیام کے دوران علامہ نے قوم پرستی کے جذبے کو بر سر عمل دیکھا تھا اور انھیں احساس ہوا کہ یہ جذبہ زندگی، اخلاق عالیہ اور انسان دوستی کے اصولوں کے برعکس ہے یہ انسان کو انسان سے نفرت کرنا سکھاتا ہے اس دور میں انھوں نے شعر گوئی ترک کرنے کا ارادہ کیا مگر پھر شیخ عبدالقادر اور آرنلڈ کے مشورے پر یہ طے پایا کہ علامہ اقبال شعر کہتے رہیں گے - یہی وہ موڑ ہے جہاں سے علامہ اقبال کی عظیم شعری تخلیقات کا نخل بار آور ہوتا ہے - یہاں سے اقبال کے تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے مشرق کی بیچارگی، درماندگی اور مغرب کی بے راہ روی احساس نے علامہ اقبال کے سیاسی عقائد کو پختگی بخشی انھوں نے مشرق و مغرب کے افکار کا موازنہ کیا اور اس کے نتیجے میں اسلامی تحریک کے عالمگیر فلسفے کو اپنایا یہ فلسفہ سراسر اقبال کی اپنی فکر سے مخصوص ہے اس کی تدوین و تربیت میں اسلامی اقدار کی جلوہ نمائی ہے - قرآن کے نور ہدایت سے اس نے جلا پائی ہے رسالت کے اخلاق و کردار نے اسے حسن بخشا ہے -

رومی ، غزالی ، ابن خلدون اور جمال الدین افغانی جیسے مفکرین کے خیالات نے اس کی نشو و نما میں رہنمائی کی ہے ۔

علامہ عشق رسول میں مستغرق ہو کر اسلامی طرز فکر پر مبنی نظریہ قومیت پیش کرتے ہیں ۔ اسی طرح اسلام کی زرین اقدار سے روشناس ہو کر علامہ اقبال نے اشتراکیت ، ملوکیت ، سامراج اور مغربی جمہوریت کے ساتھ ساتھ نیشنلزم انٹرنیشنلزم کاسمو پالٹنزم اور سوشلزم کی بھی تکذیب کرتے ہوئے اسلامی انقلاب کی دعوت کے لیے اپنی توانائیوں کو وقف کر دیا تھا وہ دین و دنیا کی تفریق سے بھی آزردہ تھے ۔ اقبال قومیت کے ہر اس تصور کی مخالفت کرتے ہیں جو وطن ، رنگ و نسل اور زبان کی بنیادوں پر استوار ہو ۔ آزادی ، قیام اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کی آرزو علامہ کے ہاں شعر کے ذریعے راہ اظہار پاتی ہے ۔ چنانچہ تحریک پاکستان کے ابتدائی مرحلے میں علامہ اقبال کی شاعری اور نثر میں مسلمانوں کے شاندار ماضی کے تذکرے اور عظمت رفتہ کے قصے ملتے ہیں ۔ موجودہ زبوں حالی کا ماتم ہے اور مستقبل میں ایک تابناک اور روشن منزل تک پہنچنے کی راہ عمل دکھائی گئی ہے ۔ اس دور میں علامہ اقبال کی انتہائی کوشش رہی کہ ملت اسلامیہ کے اندر احساس زیاں پیدا کریں اور اس کے ساتھ ہی ان کے دلوں کو ایمان و یقین کے نور سے روشن کریں ۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے مسلمانوں کے سامنے اسلام کا حقیقی تصور اجاگر کیا ۔ علامہ اقبال کی شاعری میں جو مختلف اشارات ، تصورات اور نظریات ملتے ہیں سب مسلمانوں کو زندگی کے صحیح مفہوم سے آشنا کرنے کا ذریعہ ہیں علامہ اقبال مسلمانوں کے مصائب و مشکلات کا واحد حل و مداوا احیائے دین کو سمجھتے ہیں آپ ملت اسلامیہ کی حیات تازہ کے دل سے خواہاں ہیں وہ اسلامی معاشرہ میں قانون اسلامی کو ایک زندہ اور متحرک قوت سمجھتے ہیں اور اجتہاد کو عصر حاضر کی اشد ضرورت سمجھتے ہیں وہ مسلمانوں کو اس حقیقت کا احساس دلاتے ہیں کہ تم دنیا کی عظیم ترین قوم ہو ۔

علامہ اقبال نے انسانیت کی تشنگی کو سیرابی سے بدل دینے کا سامان کیا علامہ اقبال اگر اپنے روح پرور نغمات میں مشرق کی مدح سرائی نہ کرتے اور اسلام سے بے رخی برتتے اور اس کی عظمت و شوکت کے گیت نہ گاتے ، وہ اگر اللہ کے بتائے ہوئے راہ ہدایت اور روح اسلام سے لاتعلقی کا اظہار کرتے تو آج اہل یورپ اسے سر پر اٹھا لیتے اور اس کی یاد کو غیرفانی بنا دیتے ۔

علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنے خطبہ صدارت میں مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا تصور پیش کیا جسے چوہدری رحمت علی نے بعد میں پاکستان کا نام دیا اور جسے قائداعظم (رح) نے مسلمانوں کے تعاون سے اپنی قیادت میں ایک حقیقت بنا دیا ۔ اس بنا پر علامہ اقبال کو "مفکر پاکستان" کہتے ہیں ۔

افغانستان سے مراجعت کے کچھ عرصہ بعد اس علالت کا سلسلہ شروع ہوا جو بالاخر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو مرض الموت ثابت ہوئی - وفات کی خبر سنتے ہی لاہور بھر میں کہرام مچ گیا - شہر کی دکانیں بند ہو گئیں جنازہ ہزاروں کے مجمع نے اٹھایا - آپ کی میت کو لاہور کی مشہور و معروف شاہی مسجد کے باہر حضوری باغ کے کونہ میں دفن کیا گیا - آپ کا مزار مرجع خلائق ہے -

علامہ اقبال کے منتخب کلام کا ترجمہ کئی اہم زبانوں میں ہو چکا ہے دیگر زبانوں میں ترجمے کی کوشش ہو رہی ہے - اس طرح علامہ کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے گا اور مسلمانوں کے دلوں کو گرماتا رہے گا - اپنے پیغام کی بدولت علامہ اقبال آج بھی زندہ ہے اور کل بھی زندہ رہے گا -

قائد اعظم محمد علی جناح (رح)

اگر قیادت کی زبان ہوتی تو وہ بول اٹھتی - میں محمد علی جناح ہوں، جناح مرحوم اپنی ذات میں ایسے اعلیٰ قائدانہ اوصاف رکھتے تھے کہ آپ اور قیادت بالکل ہم نام ہو کر رہ گئے بلکہ آپ تو قائد سے بڑھ کر قائد اعظم بن گئے اور دوست دشمن سبھی آپ کی پرجوش اور نہایت کامیاب قیادت کے معترف ہوئے - خود قائد اعظم کو بھی اپنی ان ذاتی اوصاف کا احساس تھا - جب گاندھی جی نے آپ سے خط میں پوچھا کہ آپ کو کس نام سے پکارا جائے "گلاب کا پھول گلاب ہی کا پھول ہے چاہے اسے کسی نام سے پکارا جائے" ہمارے قائد کا جواب تھا -

قائد اعظم ظاہری و باطنی اوصاف کا حسین مرقع تھے - منشی عبدالرحمان کا پیش کردہ خاکہ اس قدر جامع ہے کہ قائد اعظم کی کامل تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے - دبلا پتلا، سرو قد، گورا رنگ، چھریرا بدن، مرد آہن، کم آمیز، اعتدال پسند، متوازن مزاج، عزم کا پختہ، بات کا دھنی، تاریخ ساز، بے پناہ قوت ارادی کا مالک، خدا پر بھروسہ کرنے والا ناخدا، مفلوج قوم میں روح پھونکنے والا رہبر، اپنی منوانے والا اور دنیا کی عظیم ترین طاقت کو جھکانے والا سیاستدان یہ ہیں قائد اعظم محمد علی جناح جس پر علامہ اقبال (رح) کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے -

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

نواب صادق علی خاں کی روایت کے مطابق قائد اعظم کے آباؤ اجداد لوہانہ راجپوت تھے جو پنجاب کے بعض حصوں بالخصوص ملتان میں آباد ہو گئے تھے - آپ کے مورث اعلیٰ حضرت غوث اعظم کے خاندان کے ایک معزز فرد سید عبدالرزاق کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے - تجارت ان کا پیشہ تھا - پہلے خواجہ کہلاتے تھے جو بعد میں بگڑ کر خوجہ بن گیا - پھر آپ کا خاندان ملتان سے کاٹھیاواڑ منتقل ہو گیا - اسی خاندان کا ایک معزز فرد پونجا جناح تھا - جس کا شمار بڑے بڑے سوداگران میں ہوتا تھا اور انھوں نے کاروباری نقطہ نظر سے کراچی میں مستقل رہائش اختیار کرلی تھی - انھی کے ہاں

۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو وہ تاریخ ساز بچہ پیدا ہوا جو قائداعظم کے نام سے آج ساری دنیا میں مشہور ہے۔ ۱۸۸۱ء میں گھر پر گجراتی تعلیم دینے کے لیے ایک استاد کا انتظام کر دیا گیا۔ چھ برس کی عمر میں ابتدائی تعلیم کے لیے گوکل داس تیج پرائمری سکول بمبئی میں داخل کرا دیا گیا۔ ۴ جولائی ۱۸۸۷ء کو سندھ مدرسۃ الاسلام کے انگریزی شعبے میں داخل ہوئے۔ یہیں آپ نے قرآن مجید پڑھا۔ سولہ برس کی عمر میں مشن ہائی سکول کراچی سے میٹرک پاس کیا جس کے بعد آپ کی شادی ایمی بائی سے کر دی گئی۔ جنوری ۱۸۹۳ء میں بیرسٹری کی تعلیم کے لیے بحری جہاز کے ذریعے انگلستان روانہ ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں آپ نے بیس سال کی عمر میں بیرسٹری کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ قیام لندن کے دوران آپ نے قانون کا گہرا مطالعہ کیا اور دادا بھائی نوروجی کی انڈین سوسائٹی کی سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لینے لگے۔ اس طرح آپ کو سیاسی معاملات میں تربیت کے اچھے مواقع ہاتھ آگئے جن سے آپ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

لندن سے واپسی پر پہلے کراچی اور بعد میں بمبئی میں وکالت کرتے رہے۔ شروع شروع میں مالی لحاظ سے خاصے پریشان رہے مگر سخت محنتی تھے بہت جلد قانونی مہارت کی دھاک بٹھا دی۔ چنانچہ ۱۵۰۰ روپے ملازمت کی پیشکش کی گئی، جسے آپ نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ اتنے تو میں روزانہ کما لیتا ہوں۔ ۱۹۰۵ء میں مسٹر دادا بھائی نوروجی کے پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے اور اس حیثیت سے کانگرس میں شرکت کی اور سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ۱۹۰۶ء میں "وقف علی اولاد" کے موضوع پر کلکتہ کانگرس کے اجلاس میں اپنی پہلی پبلک تقریر کی۔ ۱۹۰۷ء میں سورت میں کانگرس کے ہنگامہ خیز اجلاس میں شرکت کی۔ ۱۹۰۹ء میں آپ سپریم کونسل کے بلامقابلہ ممبر منتخب ہوگئے۔ آپ مدتوں مرکزی اسمبلی کے بلامقابلہ ممبر منتخب ہوتے رہے۔ یہ بات آپ کے خلوص، دیانت، عملی فراست اور ہردلعزیزی کا بین ثبوت ہے۔

قائداعظم زبردست شخصیت و کردار کے حامل تھے۔ آپ کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور سب حسین اور دلنواز۔ آپ عظیم سیاست دان اور بے مثل خطیب تھے۔ شہرہ آفاق بیرسٹر اور اعلیٰ ترین مدبر تھے۔ اپنی قوم کے محبوب قائد تھے۔ اولوالعزمی، بیباکی اور فراست میں اپنی مثال آپ تھے۔ قوت ارادی اتنی قوی اور محیرالقول تھی کہ بڑے بڑے "لارڈ" آپ کے سامنے موم ہو جاتے تھے۔

قائد اعظم کا سیاسی کردار کانگرس میں شمولیت سے شروع ہوتا ہے۔ جب ۱۹۰۶ء میں پارسی لیڈر دادا بھائی نوروجی کانگرس کے صدر بنے تو اس نے آپ کو اپنا پرائیویٹ سیکریٹری بنا لیا چنانچہ آپ کانگرس کے باقاعدہ ممبر بن گئے اور اپنی مخلصانہ کوششوں کے ذریعے اسے عوامی تحریک میں بدل دیا۔ آپ نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے سرتوڑ کوششیں کیں۔ آپ کو ہندو مسلم اتحاد کا سفیر قرار دیا گیا۔ ۱۹۱۳ء میں امپیریل کونسل میں اوقاف بل پیش کیا۔ یہ ایک غیرسرکاری ممبر کا پہلا بل تھا

جس نے باقاعدہ ایک قانون کی شکل اختیار کی ۔ اپریل ۱۹۱۳ء میں انگلستان میں مولانا محمد علی جوہر اور سید وزیر حسن کی فہمائش پر مسلم لیگ میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی اور واپسی پر باقاعدہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور بیک وقت کانگرس ، مسلم لیگ اور شاہی مجلس قانون ساز کے ممبر رہے ۔ ۱۹۱۴ء میں کونسل آف انڈیا کی اصلاح کے سلسلے میں کانگرس کے وفد کے لیڈر کی حیثیت سے انگلستان گئے ۔ آپ کانگرس کی سست روی کے شاکی تھے ۔ چنانچہ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں پہلی مرتبہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کی ۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۱۸ء کو ٹاؤن ہال میں گورنر بمبئی لارڈ ولنگٹن کے اعزاز میں جو رخصتی جلسہ ہونے والا تھا اس کے خلاف سخت احتجاج کیا نتیجتاً جلسہ ہال میں منعقد نہ ہو سکا ۔ قائد اعظم کو پولیس کے لاٹھی چارج کی وجہ سے چوٹیں بھی آئیں، اس احتجاج میں رتی جناح بھی موجود تھیں جو ٹاؤن ہال کی سیڑھیوں پر بڑی پامردی اور استقامت سے ڈٹی رہیں ۔ اس واقعہ نے قائد اعظم کو عوامی ہیرو بنا دیا ۔ آپ کے مداحوں نے تیس ہزار روپے جمع کرکے بمبئی میں جناح ہال تعمیر کرایا ۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے مستقل صدر مقرر ہوئے ۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز کانفرنس میں نہرو رپورٹ کی سخت مخالفت کی اور پھر مارچ ۱۹۲۹ء میں دہلی میں مسلم لیگ کے اجلاس میں مشہور چودہ نکات پیش کیے ۔ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو علامہ اقبال نے آپ کو ایک خط لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ "اس وقت سارے ہندوستان میں صرف آپ ہی ایک ایسے مسلمان ہیں جس سے قوم یہ توقع رکھ سکتی ہے کہ وہ اسے اس طوفان میں سے جو شمال مغربی ہندوستان اور شاید سارے ہند پر ٹوٹنے والا ہے، صحیح سلامت گزرنے میں اس کی رہنمائی کرے گا" ۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قائد اعظم نے وکالت ترک کرکے مسلمانوں کی خدمت و آزادی کا نصب العین اپنایا اور منٹو پارک میں مسلمانوں کے لیے الگ وطن کے مطالبے کے سلسلے میں ایک قرارداد منظور کرائی جسے ہندو پریس نے "قرارداد پاکستان" کا نام دیا ۔ یہی نام اب تک معروف ہے اور بالآخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مملکت خداداد پاکستان قائم ہوئی تو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے ۔

دن رات کی انتھک محنت اور کوششوں کے سبب آپ کی صحت خراب رہنے لگی ۔ تبدیلی آب و ہوا کے لیے زیارت (بلوچستان) تشریف لے گئے مگر صحت دن بدن گرتی چلی گئی ۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو بیماری کی حالت میں کراچی پہنچے اور اسی ہفتہ کی شب کو روح قفس عنصری سے پرواز کرکے اپنے خالق حقیقی سے جا ملی، إنا لله و إنا اليه راجعون ۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء پانچ بجے سہ پہر مولانا شبیر احمد عثمانی نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں پانچ لاکھ سے زائد فرزندان توحید نے شرکت کی ۔ لیاقت علی خاں اور دوسرے وزراء نے جسد خاکی کو لحد میں اتارا جہاں آپ ابدی نیند سو رہے ہیں وہاں ایک شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا ہے ۔

"آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے"

قائداعظم اگرچہ اس عالم فانی سے رحلت فرما گئے ہیں، لیکن ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود کے لیے

اپنی خدمات اور کارناموں کی وجہ سے وہ ہمیشہ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے دلوں میں موجود رہیں گے ۔

۱- برطانوی ہندوستان میں مسلمان منتشر، مایوس اور کمزور تھے ۔ آپ نے اپنی بے لوث اور انتھک کوششوں سے ایک عشرے میں مسلمانوں کو ایک متحد اور طاقتور قوم بنا دیا اور ہندوؤں سے الگ مسلمان قوم کے وجود کو انگریزوں سے تسلیم کروایا ۔

۲- برعظیم کے مسلمانوں کے لیے ایک عظیم وطن "پاکستان" حاصل کیا ۔ جس میں ہم ہندوؤں کے غلبہ اور ظلم و ستم سے محفوظ وقار، امن، آزادی اور خوش حالی سے زندگی گزار رہے ہیں ۔

۳- عصر حاضر میں لادین ریاستوں کے دور دورہ اور بالادستی کے باوجود اسلام کے نام پر پاکستان کی ریاست حاصل کی ۔ جس میں اب ہم اسلامی نظام حیات نافذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ پاکستان نے اس جانب ابتدا کی ہے ۔ ایران اسی راہ پر چل نکلا ہے ۔ افغانستان میں اس مقصد کے لیے جہاد جاری ہے ۔ انشاءاللہ اس کی انتہا یہ ہوگی کہ ایک دن سارا عالم اسلام تحریک احیائے نظام اسلام سے فیض یاب ہو جائے گا ۔

۴- قائد اعظم کی تخلیق " پاکستان " دنیا بھر کے محکوم مسلمانوں کی آزادی کی تحریکوں کی حمایت کرتا رہا ہے ۔ ضرورت مند اسلامی ممالک کی مختلف طریقوں سے حتی المقدور امداد کرتا ہے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں اور سامراجی اقوام کی دسترس سے بچے رہیں ۔

۵- قائد اعظم کا قائم کردہ پاکستان عالم اسلام کے اتحاد کے لیے کوشاں ہے تاکہ ملت اسلامیہ کو ایک بار پھر قوت اور عروج نصیب ہو ۔ انشاءاللہ ایک دن ہم یہ منزل بھی سر کر لیں گے ۔

سوالات

۱- سید جمال الدین افغانی نے اتحاد عالم اسلامیہ کے لیے کیا خدمات سرانجام دی تھیں ؟

۲- سید جمال الدین افغانی کے کئی اسلامی ممالک میں مناصب جلیلہ پر فائز ہونے اور پھر وہاں سے نکالے جانے کی کیا وجوہات تھیں ؟

۳- مولانا محمد علی جوہر نے مسلمانوں کی بیداری و آزادی اور فلاح و بہبود کے لیے کون کون سی کوششیں کیں ؟

۴- علامہ محمد اقبال (رح) کی زندگی کے اہم واقعات مختصر طور پر بیان کیجیے ۔

۵- علامہ محمد اقبال (رح) نے ملت اسلامیہ کی جو خدمات سرانجام دی ہیں، ان کو مختصراً بیان کیجیے ؟

۶- قائد اعظم محمد علی جناح کن اوصاف کے مالک تھے ؟

۷- حصول پاکستان کے سلسلے میں قائد اعظم کی خدمات مختصر طور پر بیان کیجیے ۔

۸- ملت اسلامیہ قائد اعظم (رح) کو کیوں یاد رکھے گی ؟

دسواں باب

عالم اسلام

ایک وہ وقت تھا کہ عرب اپنی جہالت کی وجہ سے زوال کی انتہاء کو پہنچ چکے تھے۔ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو اپنی قوت ایمان و عمل، باہمی اتحاد و یگانگت، رسول خدا کی فرمانبرداری اور اللہ کی کرم نوازی سے اس قابل ہو گئے کہ اس دور کی دو عظیم سلطنتوں، سلطنت کسرائے ایران اور سلطنت قیصر روم کو پامال کر کے ایک وسیع و عریض مملکت کے فرمانروا بن گئے۔ خلافت راشدہ، خلافت امویہ، خلافت عباسیہ، سلطنت دہلی، سلطنت عثمانیہ اور سلطنت مغلیہ کی صورت میں جہاں مسلمانوں نے ہیبت و سطوت، شان و شوکت اور قوت و عظمت کے دور دیکھے، وہاں تاتاریوں کی یلغاروں اور صلیبیوں کے حملوں کی شکل میں تباہیوں اور بربادیوں سے بھی دوچار ہوتے رہے۔ لیکن مسلمانوں کی بے عملی و بے یقینی، عیش و عشرت اور باہمی آویزشوں کے باعث ان کے جس زوال کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی میں ہوا تھا وہ بیسویں صدی کے اوائل میں جنگ عظیم اول کے خاتمہ پر اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ سلطنت عثمانیہ کو نیست و نابود کر دیا گیا اور نجد و یمن کے سوا کوئی مسلمان ملک مسیحی سامراجیوں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہا۔ سامراجیوں کی گرفت سے نجات کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی لیکن اللہ تعالی بڑا کارساز ہے۔ جنگ عظیم دوم میں سامراجی اتنے ناتواں ہو گئے کہ مقبوضہ ممالک پر تسلط قائم رکھنا دشوار ہو گیا۔ یکے بعد دیگرے اب تک چھوٹے بڑے ۵۶ مسلمان ملک سامراجیوں سے آزادی حاصل کر چکے ہیں اور مسلمان اکثریت والے ۲۲ علاقے ابھی تک سامراجیوں کے محکوم ہیں۔ ان ۲۲ محکوم علاقوں میں سے دس روسی سامراج کے شکنجے میں گرفتار ہیں۔ اب روس نے افغانستان پر بھی قبضہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ مسلم اکثریت والے محکوم ممالک کے تفصیلی کوائف کا گوشوارہ درج ذیل ہے۔

مسلم اکثریت والے محکوم ممالک

نمبر شمار	نام ملک	صدر مقام	رقبہ (مربع کلومیٹر)	اندازاً آبادی (ہزاروں میں)	مسلم فیصد	قابض ملک
۱-	آذر بائیجان	باکو	۸۶۶۰۰	۵۶۰۷	۷۵	روس
۲-	اراکان	اکیاب	۳۱۴۴۰	۲۴۰۰	نامعلوم	برما

نمبر شمار	نام ملک	صدر مقام	رقبہ (مربع کلومیٹر)	اندازاً آبادی (ہزاروں میں)	مسلم فیصد	قابض ملک
۳-	ارمینیا	یاروان	۲۹۸۰۰	۲۵۰۰	نامعلوم	روس
۴-	اریٹریا	اسمرہ	۱۱۷۶۰۰	۱۹۴۸	۷۵	ایتھوپیا
۵-	ازبکستان	تاشقند	۴۴۷۴۰۰	۱۳۶۹۵	۸۸	روس
۶-	باشکریا	عوفہ	۱۴۳۶۰۰	۳۸۲۵	نامعلوم	روس
۷-	بنگسا مورو (جنوبی فلپائن)	داواؤ	۱۱۹۶۱۹	۵۶۱۰	نامعلوم	فلپائن
۸-	پٹانی (جنوبی تھائی لینڈ)	پٹانی	۷۲۹۶۱	۲۹۰۰	۵۶	تھائی لینڈ
۹-	تاجکستان	دوشنبہ	۱۴۳۱۰۰	۳۴۰۰	۹۸	روس
۱۰-	تتاریا	کازان	۶۸۰۰۰	۳۲۹۹	نامعلوم	روس
۱۱-	ترکمانستان	عاشق آباد	۴۸۸۱۰۰	۲۵۱۰	۹۰	روس
۱۲-	جزائر اندمان و نکوبار	پورٹ بلئیر	۸۲۹۵	۸۰	نامعلوم	بھارت
۱۳-	جزیرہ ری یونین	سینٹ ڈینس	۲۵۱۲	۴۷۷	۵۵	فرانس
۱۴-	جموں و کشمیر (مقبوضہ)	سرینگر	۱۴۴۰۱۸	۴۶۱۷	۶۵	بھارت
۱۵-	داغستان	مہاچکالا	۵۰۳۰۰	۱۵۳۹	نامعلوم	روس
۱۶-	سنکیانگ	اورومچی	۱۶۴۶۸۰۰	۷۲۷۰	۷۵	چین
۱۷-	طراقیا (Thrace)	الیگزینڈروپولس	۸۸۰۰	۴۰۰	نامعلوم	یونان
۱۸-	غورنو بدخشان	خورگ	۶۳۷۰۰	۱۱۲	نامعلوم	روس
۱۹-	فلسطین	بیت المقدس	۲۷۰۱۱	نامعلوم	نامعلوم	اسرائیل
۲۰-	قازاقستان	علما عطا	۲۷۱۷۳۰	۱۴۳۰۰	۶۵	روس
۲۱-	قروشیا	زغراب	۵۶۵۳۸	۴۴۲۶	نامعلوم	یوگوسلاویہ
۲۲-	قیرغزیا	فرونزہ	۱۹۸۵۰۰	۳۳۰۰	۸۹	روس
۲۳-	کانسو	لانچو	۳۶۶۵۰۰	۱۵۰۰۰	نامعلوم	چین
۲۴-	کاسوفو	پرسٹینا	۱۰۳۵۲	۱۲۴۴	نامعلوم	یوگوسلاویہ
۲۵-	گروڑیا (جارجیا)	طفلس	۶۹۷۰۰	۵۰۰۰	نامعلوم	روس
۲۶-	لکادیپ	کاوارتی	۳۲	۳۱	۱۰۰	بھارت
۲۷-	نینغ سیا	ین چون	۶۶۴۰۰	۲۰۰۰	نامعلوم	چین

عالم اسلام مشرق میں انڈونیشیا سے لے کر مغرب میں مراکش تک اور شمال میں سنکیانگ سے لے کر جنوب میں تنزانیہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اسلامی ممالک تین براعظموں ایشیا، افریقہ اور یورپ میں موجود ہیں۔ دنیا میں مسلمانوں کی آبادی کا صحیح اندازہ لگانا دشوار ہے۔ غیر مسلم حکمران یا ممالک ارادتاً مسلمانوں کی تعداد کم دکھانے کی کوشش کرتے ہیں یا بالکل ظاہر ہی نہیں کرتے تاہم مسلمانوں کی آبادی کے بارے میں چند حقائق زبان زد خاص و عام ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کی آبادی کا کثیر حصہ ایشیا میں آباد ہے۔ افریقہ کی مجموعی آبادی میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے۔ ساری دنیا میں مسلمانوں کی آبادی کا اندازہ ایک ارب ہے جو دنیا کی کل آبادی کا چوتھا حصہ ہے۔

مسلم اکثریتی ممالک کے علاوہ مسلمان دنیا کے ہر ملک میں موجود ہیں لیکن چند ممالک میں ان کو اہم اقلیت کی حیثیت حاصل ہے۔ بھارت میں مسلمانوں کی آبادی کا تخمینہ ۱۵ کروڑ ہے۔ جو اس ملک کی آبادی کا ۲۰ فیصد ہے۔ چین میں پانچ کروڑ کے لگ بھگ مسلمان ہوں گے۔ بلغاریہ میں تقریباً ۲۵ فیصد، موزنبیق اور ملاوی میں ۳۳ فیصد، کینیا میں ۳۰ فیصد، برونڈی، روانڈا، مالا گاسی اور کانگو میں ۲۰ فیصد آبادی مسلمان ہے۔

چند آزاد مسلم ممالک میں سابقہ مسیحی سامراجیوں کی طرفداری اور مقامی مسیحی آبادی کی تعلیمی فوقیت کی وجہ سے مسیحی لوگ ان ممالک کی معیشت و سیاست پر قابض ہیں۔ ان ممالک میں سربراہ حکومت بالخصوص وزرا، فوجی افسر اور دفاتر کا عملہ عموماً مسیحی ہے۔ ایسے ممالک کی فہرست میں ایتھوپیا، بالائی وولٹا، بینین، تنزانیہ، ٹوگو، ساحل العاج، سیرا لیون، سینیگال، غانا، گنی استوائی گنی بساؤ، لائبیریا، لبنان، وسطی افریقی جمہوریہ اور یوگنڈا شامل ہیں۔ ان ممالک میں کماحقہ سیاسی و معاشی وقار حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو سخت جد و جہد کرنی پڑے گی۔

مسلمان اکثریت کے محکوم علاقوں میں مسلمانوں کو کئی مشکلات کا سامنا ہے۔ حاکم قومیں مسلمانوں کی معاشی حالت کو کمزور کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ ان کی اکثریت کو اقلیت میں بدلنے کے لیے غیر مسلموں کو دوسرے علاقے سے لا کر ان کے علاقوں میں آباد کیا جا رہا ہے۔ دینی فرائض کی ادائیگی سے روکا جاتا ہے۔ اسلامی شعار اپنانے پر سزائیں دی جاتی ہیں۔ حاکم قوم کی زبان اور مسلک اختیار کرنے پر مجبور کر کے حاکم قوموں میں مدغم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہیں۔ فسادات کرا کر ان کو ترک وطن پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ایسے کئی علاقوں میں مسلمان آزادی کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔

ان مشکلات کے باوجود ملت اسلامیہ کا مستقبل تابناک نظر آ رہا ہے۔ مسلمان حالت زوال سے نکل کر منزل کمال کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اللہ تعالی نے ان کو بے پناہ وسائل سے نوازا ہے۔ دنیا میں بہت اہم جغرافیائی حیثیت ان کو نصیب ہے۔

دنیا کا ۸۰ فیصد تیل اسلامی ممالک سے حاصل ہوتا ہے۔ تیل برآمد کرنے والے ۱۳ ممالک میں

سے دس مسلمان ہیں۔ چین، جاپان، یورپ، امریکہ اور ترقی پذیر ممالک کی معاشی زندگی کا انحصار اسی تیل پر ہے یہ تیل نہ ملے تو سرد ممالک کے لوگ سردیوں میں اپنے گھر اور کارخانے گرم نہیں رکھ سکتے۔ روس بھی اپنی ضرورت کا تیل اپنے مسلم اکثریت والے مقبوضہ علاقوں سے حاصل کرتا ہے۔

دنیا کا ۷۰ فیصد ربڑ، ۹۳ فیصد تیل ناریل، ۵۲ فیصد ٹین، ۴۰ فیصد پٹ سن، ۳۳ فیصد تانبا اور ۳۰ فیصد کاغذ اسلامی ممالک سے حاصل ہوتا ہے۔ لوہے، فاسفیٹ، مینگانیز، باکسائٹ اور یورنیم کے مناسب ذخائر بھی اسلامی دنیا میں موجود ہیں۔

اسلامی دنیا سینیگال، نیجر، نیل، دجلہ، فرات، سندھ اور گنگا و برہم پتر جیسے مشہور دریاؤں کی وسیع و عریض زرخیز وادیوں کی زمین ہے۔ وافر بارش والے استوائی خطے کے علاقے یوگنڈا، تنزانیہ، ملائیشیا اور انڈونیشیا سرزمین اسلام کا حصہ ہیں۔ ان زرخیز زمینوں میں طرح طرح کے بے شمار پھل، پھول، سبزیاں اور اجناس پیدا ہوتی ہیں۔ مناسب محنت، جدید آلات اور منصوبہ بندی سے کام لیا جائے تو اسلامی دنیا کی ضرورت سے زائد زرعی اشیا پیدا کی جا سکتی ہیں۔

عالم اسلام کے مشرق میں بحرالکاہل اور مغرب میں بحر ظلمات واقع ہے۔ بحیرہ اسود اور بحیرہ روم اسلامی ممالک سے متصل ہیں۔ بحیرہ قلزم ارض اسلامیہ کی جھیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بحر ہند اسلامی دنیا کے وسط میں واقع ہے۔ مسلمان آبنائے باسفورس کے مالک، نہر سویز کے والی، آبنائے ملاکا کے وارث اور آبنائے جبل الطارق کے ایک کنارے کے نگران ہیں۔ دنیا کے اہم بحری، بری اور فضائی راستے اسلامی دنیا میں سے گزرتے ہیں۔ دنیا کا آمد و رفت اور رسل و رسائل کا نظام مسلمانوں کے تعاون کے بغیر چل نہیں سکتا۔

مسلمانوں کے پاس تین چیزیں موجود ہیں افرادی قوت، معاشی وسائل اور جغرافیائی اہمیت۔ اگر مسلمان قوت ایمان، اتحاد ملت اور جدید ٹیکنالوجی کے مالک بن جائیں تو اس دنیا کی امامت ان کا مقدر بن جائے گی۔ مسلمان صحیح طور پر اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہو جائیں۔ آپس میں اتفاق و تعاون کی کوئی مؤثر صورت پیدا کر لیں، اور صنعت و حرفت اور حرب و ضرب کے جدید آلات و مہارات اور ایجادات و کمالات پر دسترس حاصل کر لیں تو ان کے بہت سارے دکھوں کا درماں ہو سکتا ہے اور ان کی کچھ آرزوئیں پوری ہو سکتی ہیں۔

عالم اسلام کے اتحاد کے لیے سید جمال الدین افغانی، محمد عبدہ، علامہ اقبال، سید امین الحسنی جیسے مفکر کوشاں رہے ہیں۔ اس سلسلے میں کئی تنظیمیں بھی سرگرم عمل ہیں جن میں موتمر عالم اسلامی، رابطہ عالم اسلامی اور الاحیا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں سرکاری سطح پر ایک بین الاسلامی ادارہ، تنظیم اسلامی کانفرنس وجود میں آیا جس کا صدر دفتر (سیکریٹریٹ) جدہ میں واقع ہے۔ اس کی ابتداء مراکش کے دارالحکومت رباط میں ۲۴ اسلامی ممالک کی سربراہی کانفرنس سے ہوئی۔ ۱۹۷۸ء تک بشمول تنظیم آزادی فلسطین ۴۲ اسلامی ممالک اس تنظیم کے رکن بن

چکے تھے - مصر کو اسرائیل کے ساتھ تن تنہا روابط قائم کرنے کی بنا پر اس تنظیم سے خارج کر دیا گیا - افغانستان پر روسی تسلط کے بعد افغانستان کی رکنیت معطل کر دی گئی ہے - اس وقت ۴۰ اسلامی ممالک اس تنظیم کے رکن ہیں - آزاد مسلمان ممالک میں سے البانیہ ، ایتھوپیا ، برونی ، بینین ، تنزانیہ ، ٹوگو ، آزاد جموں و کشمیر ، ساحل العاج ، گھانا ، قبرص (ترک حصہ) ، گنی استوائی ، لائبیریا ، نیجریا اور وسطی افریقی جمہوریہ ابھی تک اس تنظیم کے رکن نہیں بنے -

مسلمانوں کی متحد و مسلح قوت سے حسب ذیل مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں :

۱- قبلہ اول بیت المقدس اور ارض فلسطین پر یہودی قابض ہو چکے ہیں - چند عرب ممالک اور فلسطینی مجاہدین کی مسلسل جد و جہد کے باوجود ابھی تک یہودیوں کے زور کو توڑا نہیں جا سکا - سارے عالم اسلام کی متحدہ قوت سے بیت المقدس کی بازیابی اور ارض فلسطین کی آزادی کا امکان ہے -

۲- حرمین شریف، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پر یہودیوں اور اشتراکیوں کی طرف سے قبضہ کرنے کی کوشش کا اندیشہ ہے - متحدہ قوت سے مسلمان اپنے مقدس مقامات کی مؤثر طریقے سے پاسبانی کر سکتے ہیں -

۳- چند بڑی طاقتیں عالم اسلام کے مادی وسائل کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہیں اور ان وسائل کو غصب کرنے کی خاطر ان ملکوں پر فوجی قبضہ کرنے کے لیے منصوبے بنا رہی ہیں - مسلمانوں کا اتحاد ان کی سیاسی آزادی اور معاشی وسائل کی خاطر خواہ حفاظت کا ضامن بن سکتا ہے -

۴- کچھ مسلم اکثریت کے علاقے ابھی تک غیرمسلم اقوام کے محکوم ہیں - مسلمانوں کی متحدہ قوت ان کی آزادی کی جد و جہد میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے -

۵- بعض غیرمسلم ممالک میں مسلمان اقلیتوں پر ظلم و ستم ہو رہا ہے - متحدہ طاقتور مسلم بلاک ظالموں کو ان اقلیتوں پر ظلم سے روک سکتا ہے -

۶- مسلمان ممالک کی تعداد اور اہم معاشی وسائل کی ملکیت کے باوجود مسلمانوں کو دنیا میں ابھی وہ وقار نصیب نہیں ہوا جو وہ اپنے ماضی کی سلطنتوں کے دور میں دیکھ چکے ہیں - عالم اسلام کے اتحاد سے مسلمان امریکہ و روس کی طرح دنیا کی ایک سپرپاور بن سکتے ہیں -

۷- لوگ عموماً حشمت و جاہ والی قوموں کی تہذیب و تمدن کو اپنانے کا رجحان رکھا کرتے ہیں - اتحاد کی بدولت اکثر مسلمان بھی قوت و عظمت کے حامل بن جائیں تو دیگر اقوام عالم میں اسلام کی اشاعت و قبولیت کی راہیں کھل جائیں گی -

پندرھویں صدی ہجری کا آغاز ہو چکا ہے - ملت اسلامیہ اپنے عروج نو کے لیے کوشاں ہے - غیرمسلم اقوام اس کوشش سے خائف ہیں اور اس کی مخالف بھی - ان مخالفتوں کے باوجود پندرھویں صدی ہجری ملت اسلامیہ کے عروج کا دور ہوگا - انشاء اللہ

گیارھواں باب

بین الاقوامی تنازعات

جس طرح افراد کے درمیان بعض باتوں پر تنازعات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح قوموں کے درمیان بھی مختلف معاملات پر جھگڑے ہوتے اور چلتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ جھگڑے جنگ کی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں بہت سے بین الاقوامی تنازعات موجود ہیں۔ ان تنازعات میں سے کچھ کا واسطہ مسلمانوں سے ہے۔ ایسے تنازعات میں سے تین تنازعات مسلمانوں کے لیے خاصے تشویش ناک ہیں اور وہ ہیں مسئلہ اریٹیریا، مسئلہ فلسطین، مسئلہ کشمیر۔ ان مسائل کی تفصیل ذیل کے صفحات میں درج کی جاتی ہے۔

مسئلہ اریٹیریا

اریٹیریا بحیرہ قلزم (بحیرہ احمر) کے افریقی ساحل پر واقع ہے۔ اس کے شمال مغرب میں سوڈان، جنوب مشرق میں جمہوریہ جبوتی اور جنوب میں اتھوپیا ہے۔ بحیرہ قلزم کے ایشیائی ساحل پر اریٹیریا کے بالمقابل سعودی عرب اور شمالی یمن ہیں۔ اریٹیریا کا ساحل سعودی عرب کے ساحل سے تقریباً ۱۱۲ کلومیٹر دور ہے۔ اس کا ساحل ۹۶۵ کلومیٹر لمبا ہے۔

اس علاقے کو اطالویوں نے یکم جنوری ۱۸۹۰ء کو اریٹیریا کے نام سے موسوم کیا تھا۔ اطالوی بحیرہ قلزم کو اپنی زبان میں Mare Erythereum کہتے ہیں۔ چونکہ یہ علاقہ بحیرہ قلزم کے ساحل پر واقع تھا۔ اس لیے انھوں نے اس کا نام Erytherum سے اخذ کر کے Eriteria رکھ دیا۔

۱۸۸۲ء اور ۱۸۹۲ء کے درمیانی عرصے میں اطالوی فوجوں کے ذریعہ اطالیہ نے اریٹیریا پر قبضہ کر لیا۔ اطالیہ نے ترکوں، مصریوں اور اتھوپیا والوں کے احتجاجات کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اطالیہ نے اپنی فوجی برتری کے بل بوتے پر ۱۸۸۹ء میں اتھوپیا کے حکمران کو اریٹیریا کے علاقے سے دستبرداری کے سلسلے میں ایک معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور کیا۔ یکم جنوری ۱۸۹۰ء کو سرکاری طور پر اطالیہ نے اریٹیریا کے اطالوی نوآبادی ہونے کا اعلان کیا۔

اطالیہ نے ۳۶-۱۹۳۵ء میں اتھوپیا پر حملے کے لیے اریٹیریا کو فوجی اڈے کے طور پر استعمال کیا۔ اتھوپیا کی فتح کے بعد اطالیہ نے اریٹیریا کو اتھوپیا میں مدغم کر دیا۔ ۱۹۴۰ء میں اطالیہ اتحادیوں کے حریف کی حیثیت سے جنگ عظیم دوم میں کود پڑا تو ۱۹۴۱ء میں برطانوی افواج نے سوڈان

کی طرف سے اطالوی مقبوضات پر حملہ کرکے اطالوی افواج کو اس علاقے سے نکال دیا ۔ اطالویوں کی شکست کے بعد اتھوپیا اس کے اصلی حکمران شہنشاہ ہیل سلاسی کے سپرد کر دیا گیا لیکن اریٹیریا کے علاقہ کا انتظام برطانوی فوج کے سپرد ہوا ۔ اریٹیریا ۱۹۴۴ء تک اتحادی افواج کا اہم اڈا بنا رہا ۔

معاہدہ امن ۱۹۴۷ء کے مطابق اطالیہ رسمی طور پر اریٹیریا کے علاقے سے دستبردار ہوگیا اور اس کے مستقبل کا حتمی فیصلہ چار بڑی طاقتوں امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس نے متفقہ طور پر کرنا تھا ۔ اگر یہ ایک سال کے اندر متفقہ فیصلہ نہ کر سکیں تو یہ مسئلہ فیصلہ کے لیے اقوام متحدہ میں پیش ہونا تھا ۔ ایک سال کے اندر ان بڑی طاقتوں کا کسی فیصلہ پر اتفاق نہ ہوا ۔ ۱۹۴۸ء میں یہ مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش ہوا ۔ وہاں بھی کوئی متفقہ فیصلہ نہ ہو سکا تو ۱۹۵۰ء میں اقوام متحدہ نے ایک کمیشن اریٹیریا بھیجا ۔ پاکستان کا ایک نمائندہ بھی اس کمیشن کا رکن تھا ۔ اس کمیشن کی رپورٹ میں بھی متفرق آراء کا اظہار کیا گیا ۔

اریٹیریا کے مستقبل کے بارے میں حسب ذیل چار فیصلے ممکن تھے ۔

۱۔ اریٹیریا کو ایک جمہوریہ کی حیثیت سے آزاد کر دیا جائے ۔

۲۔ اریٹیریا کو سوڈان میں شامل کر دیا جائے ۔

۳۔ اریٹیریا کو اتھوپیا کی سلطنت کا حصہ قرار دیا جائے ۔

۴۔ اریٹیریا اور اتھوپیا کا وفاق بنا دیا جائے ۔

اریٹیریا کے لوگوں سے استصواب رائے کے ذریعہ دریافت کیا جاتا تو یقیناً وہ اپنے ملک کو آزاد جمہوریہ بنانا پسند کرتے لیکن ارادتاً ان کو یہ موقع نہ دیا گیا ۔ اریٹیریا کو سوڈان میں شامل کر دیا جاتا تو بھی اریٹیریا کے مسلمان خوش ہوتے ۔ سوڈان اور اریٹیریا کو متحد کرنا بھی چنداں دشوار نہ تھا کیونکہ اس وقت یہ دونوں علاقے برطانیہ کے زیرانصرام تھے ۔ اتھوپیا کے شہنشاہ ہیل سلاسی کی آرزو تھی کہ اریٹیریا کو اس کی سلطنت کا حصہ بنا دیا جائے ۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اریٹیریا پہلے اتھوپیا کا حصہ رہ چکا ہے اور دونوں علاقوں کے باشندوں کی بود و باش میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے ۔ دراصل اتھوپیا کو ساحل سمندر تک رسائی کے لیے اریٹیریا کی ضرورت تھی ۔

مسئلہ فلسطین

قدیم زمانے میں جو قبائل فلسطین کے علاقے میں آکر آباد ہوئے اور حکومت کرتے رہے ان میں سے ایک کا نام فلسطین تھا ۔ اس قبیلے کے نام پر اس علاقے کا نام فلسطین پڑ گیا ۔

بنی اسرائیل اور کئی دیگر قبائل عراق کے علاقے کنعان سے آکر فلسطین میں آباد ہوئے تھے ۔ تقریباً ایک ہزار سال قبل از مسیح بیت المقدس (یروشلم) کے ارد گرد کے علاقے میں بنی اسرائیل نے ایک ریاست اسرائیل قائم کی تھی ۔ یہ تقریباً دو سال تک قائم رہی ۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان

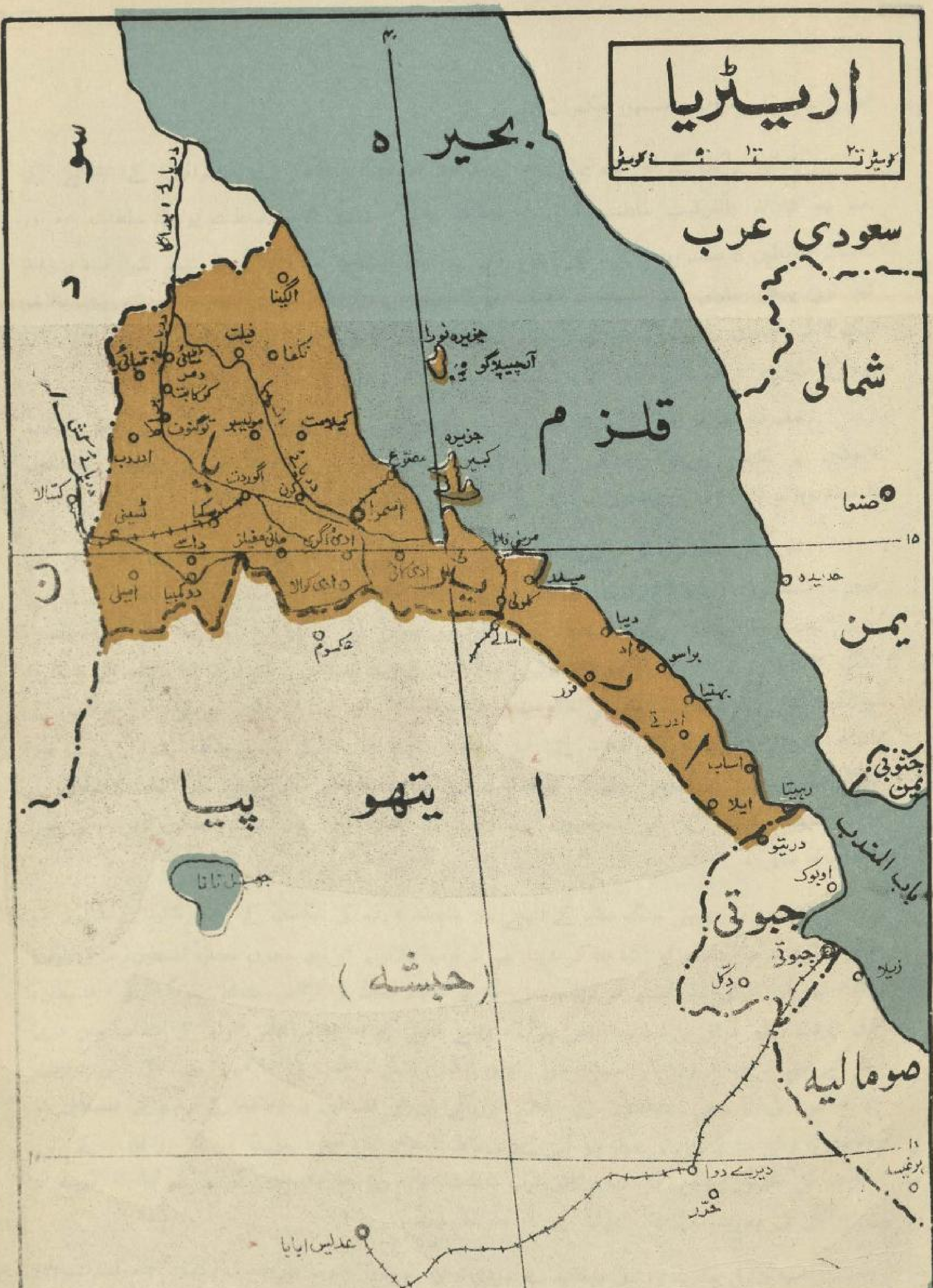

اریٹریا
بحیرہ قلزم
سعودی عرب
شمالی یمن
صنعا
یمن
جنوبی یمن
جبوتی
صومالیہ
ایتھوپیا
(حبشہ)
جھیل تانا
عدلیس ابابا
اسمرا
کیرن
الگینا

اس ریاست کے معروف و مشہور حکمران تھے۔

قدیم اسرائیل کے قیام سے پہلے مصر کے فرعون فلسطین پر قابض رہے۔ اسرائیل کے خاتمے کے بعد یہ علاقہ بالترتیب سلطنت اسیریہ، سلطنت بابل، سلطنت فارس، سلطنت یونان، سلطنت روم اور سلطنت بازنطین کا حصہ رہا۔ ۷۰ء میں قیصر روم نے بیت المقدس کو فتح کیا۔ شہر کو تباہ و برباد کیا اور ہیکل سلیمانی کو منہدم کرا دیا۔ بنی اسرائیل (یہودی) سازشیں اور بغاوتیں کرتے رہے۔ بالاخر تنگ آکر رومیوں نے ۱۳۵ء میں یہودیوں پر سخت پابندیاں لگا دیں اور ان کو فلسطین سے نکال کر روم کے طول و عرض میں بکھیر دیا۔

حضرت عمر فاروق کے زمانے میں سلطنت بازنطین کی افواج سے معرکہ آرائی کے بعد مسلمان فلسطین پر قابض ہوئے۔ خلافت راشدہ کے بعد فلسطین بنو امیہ، بنو عباس اور بنی فاطمہ کی سلطنتوں کا حصہ رہا۔ ۱۰۷۲ء میں سلجوق ترکوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔

اس وقت مسلمانوں کی مرکزی قوت کمزور ہو گئی تھی۔ جا بجا خود مختار حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ مسلمانوں کی اس کمزوری سے یورپ کے مسیحی حکمرانوں کو حوصلہ ہوا کہ وہ حملہ کرکے اپنے مذہبی مقدس مقامات کی سرزمین فلسطین کو مسلمانوں سے چھین لیں۔ چنانچہ ۱۰۹۶ء میں پہلی صلیبی جنگ کا آغاز ہوا اور ۱۰۹۹ء میں صلیبی جنگباروں نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ شام کے فرمانروا نورالدین زنگی نے فلسطین کی مسیحی حکومت پر ذرا دباؤ ڈالا تو ۱۱۴۷ء میں جرمنی اور فرانس کے بادشاہ مسیحی حکومت کی امداد کے لیے فلسطین آئے اور دوسری صلیبی جنگ لڑی۔ ۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے مسیحی حکومت کو شکست دے کر بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ فلسطین پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے مسیحیوں نے اگلے ۳۰ سال میں تین صلیبی جنگیں لڑیں لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں سلطنت عثمانیہ کی شکست کے بعد برطانیہ نے عربوں کو موجودہ آزاد عرب ریاست تو کیا بنا کر دینا تھی۔ عرب علاقوں کو چھ حصوں حجاز، فلسطین، شرق اردن لبنان، شام اور عراق میں تقسیم کر دیا۔ عملی طور پر شام و لبنان پر فرانس مسلط ہوگیا اور فلسطین، شرق اردن اور عراق پر برطانیہ قابض ہوگیا۔ ویسے کہنے کو یہ علاقے مجلس اقوام کے انتداب میں دے دیے گئے تھے۔ اب عربوں کو احساس ہوا کہ وہ ایک اسلامی سلطنت کی ماتحتی سے نکل کر برطانیہ اور فرانس کی مسیحی سلطنتوں کے غلام بن گئے ہیں اور فلسطین پر برطانیہ کے قبضہ سے فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کی راہ ہموار ہو گئی ہے۔ سلطنت عثمانیہ کا حصہ ہوتے ہوئے یہودیوں کے لیے فلسطین کا حصول ممکن نہ تھا۔ کاش عرب سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کرکے اسے تباہ نہ کرتے تو آج اسرائیل کی صورت میں ایک عذاب سے دو چار نہ ہوتے۔

فلسطین کی حد بندی میں برطانیہ نے یہودی وطن کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھا۔ تمام اہم یہودی

اور مسیحی مقدس مقامات اس کی حدود کے اندر رکھے - اس کی سرحدیں بحیرہ روم اور بحیرہ قلزم سے ملا دیں تاکہ یہودی وطن کا مشرق و مغرب سے بحری رابطہ ممکن ہو، افریقہ کو ایشیا اور یورپ سے ملانے والے واحد بری راستہ پر یہود قابض ہو جائیں اور دونوں طرف کے عرب ممالک باہمی بری رابطہ کے لیے یہود کے محتاج ہو جائیں -

صیہونیوں کے موقف کے برعکس عربوں کا یہ موقف رہا ہے کہ دیگر ممالک سے یہودیوں کو فلسطین میں آنے کی اجازت نہ دی جائے - فلسطین کے باشندوں کو حق خود اختیاری دیا جائے - فلسطین کو آزاد جمہوریہ قرار دیا جائے جس میں تمام مذاہب کے مقامات مقدسہ محفوظ ہوں اور تمام مذاہب کے پیروکاروں کو مذہبی آزادی حاصل ہو -

فلسطینی عرب یہودی آبادکاروں کی آمد اور ان کو عرب اراضی کی خرید کی اجازت کے خلاف احتجاج کرتے رہے - ۱۹۲۰ء میں فسادات ہوئے - ۱۹۲۹ء میں ہنگامے ہوئے - ۱۹۳۳ء کے بعد ہٹلر کی یہود دشمنی کی وجہ سے یہودی پناہ گزینوں کا تانتا بندھ گیا - یہودی نوواردوں کی سرکاری طور پر نفری ۳۳ ہزار سالانہ تک پہنچ گئی اور بے حد و حساب یہودی چوری چھپے فلسطین میں سمگل ہونے لگے تو عربوں کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا اور ۱۹۳۶ء میں عربوں نے بغاوت کر دی جو تین سال تک رہی برطانوی حکومت نے لارڈ پیل کی سرکردگی میں ایک کمیشن فلسطین بھیجا جس نے جولائی ۱۹۳۷ء میں تجویز کیا کہ چونکہ عربوں اور یہودیوں میں اتفاق رائے ناممکن ہے اس لیے فلسطین کو عربوں اور یہودیوں میں تقسیم کر دیا جائے - یہ بغاوت ۱۹۳۹ء میں دبا دی گئی - لیکن تقسیم فلسطین کی تجویز پر جنگ عظیم دوم کی وجہ سے کوئی پیش رفت نہ ہو سکی - عرب اور یہودی دونوں تقسیم کے خلاف تھے -

جنگ عظیم دوم کے دوران یہودیوں نے فوجی لحاظ سے اپنے آپ کو تیار کرنے کی کوشش کی - برطانیہ کا اسلحہ چرایا گیا - ہجانہ کو مسلح کیا گیا اور ۲۵ ہزار یہودیوں کو برطانوی افواج میں بھرتی کروا کر فوجی تربیت دلوائی گئی -

جنگ کے بعد برطانیہ نے یہودیوں اور عربوں میں سمجھوتہ کروانے کی ایک اور کوشش کی لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی - امریکہ کے تعاون سے فلسطین کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش ہوا - اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے امریکہ اور صیہونیوں کے دباؤ کے تحت دو تہائی اکثریت سے ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو تقسیم فلسطین کی ایک تجویز منظور کی جس کے مطابق بیت المقدس کو بین الاقوامی شہر قرار دیا گیا - ۴۲٫۸۸ فیصد علاقہ عربوں کو دیا گیا اور ۵۶٫۴۷ فیصد علاقہ یہودیوں کو، جب کہ یہودیوں کی آبادی صرف ۳۳ فیصد تھی - علاقہ کی یہ تقسیم عربوں کے ساتھ صریح بے انصافی اور ظلم تھا -

چونکہ تقسیم فلسطین عربوں کو قبول نہیں تھی - برطانیہ اس پر عملدرآمد کے بغیر ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو فلسطین سے رخصت ہوگیا - یہودیوں نے ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا - نصف

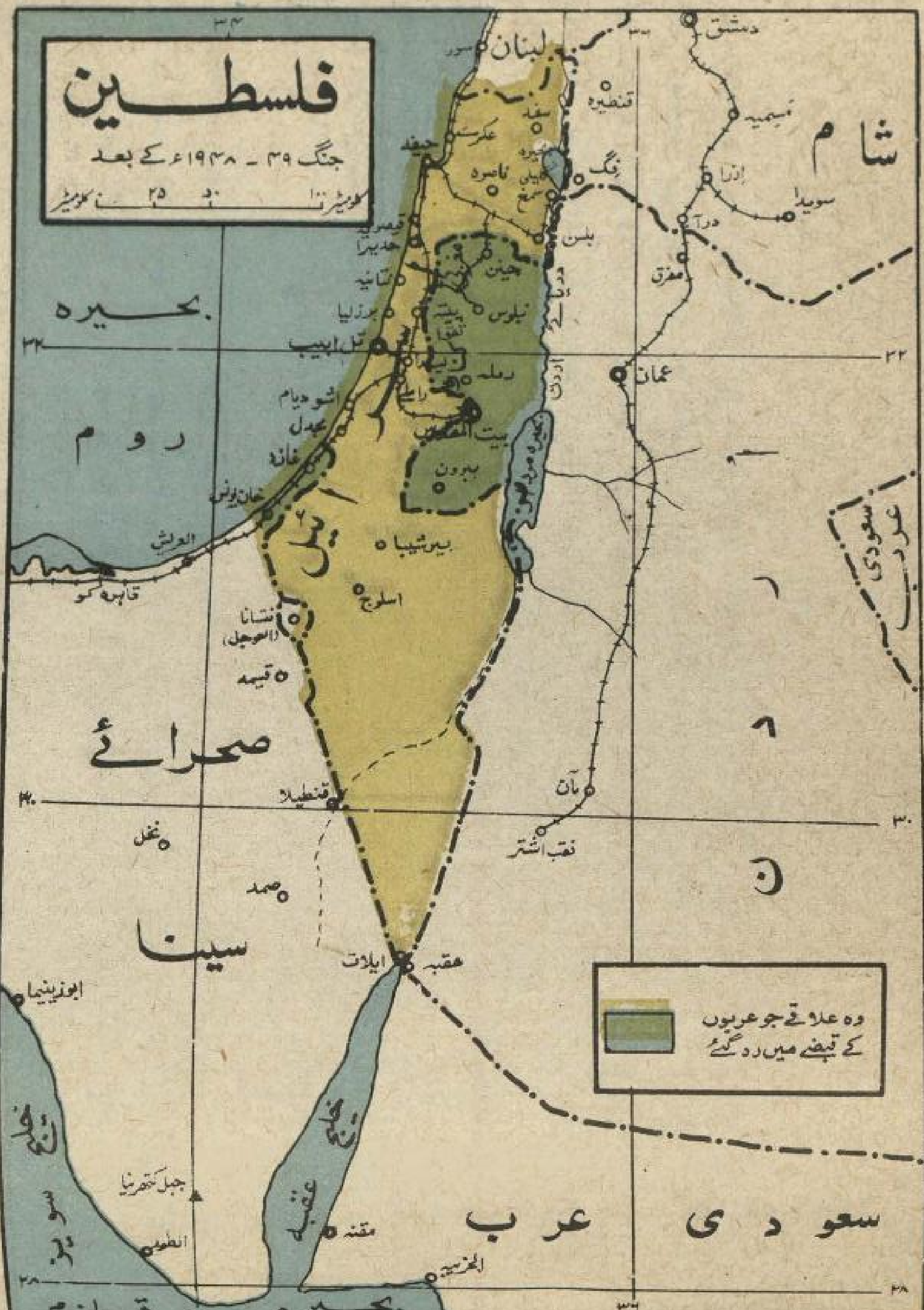

فلسطین
جنگ ۴۹ - ۱۹۴۸ء کے بعد
وہ علاقے جو عربوں کے قبضے میں رہ گئے
بحیرہ روم
صحرائے سینا
سعودی عرب
شام
لبنان
دمشق
عمان
حیفا
ناصرہ
نابلس
تل ابیب
بیت المقدس
غازہ
العریش
بیرشیبا
ایلات
عقبہ

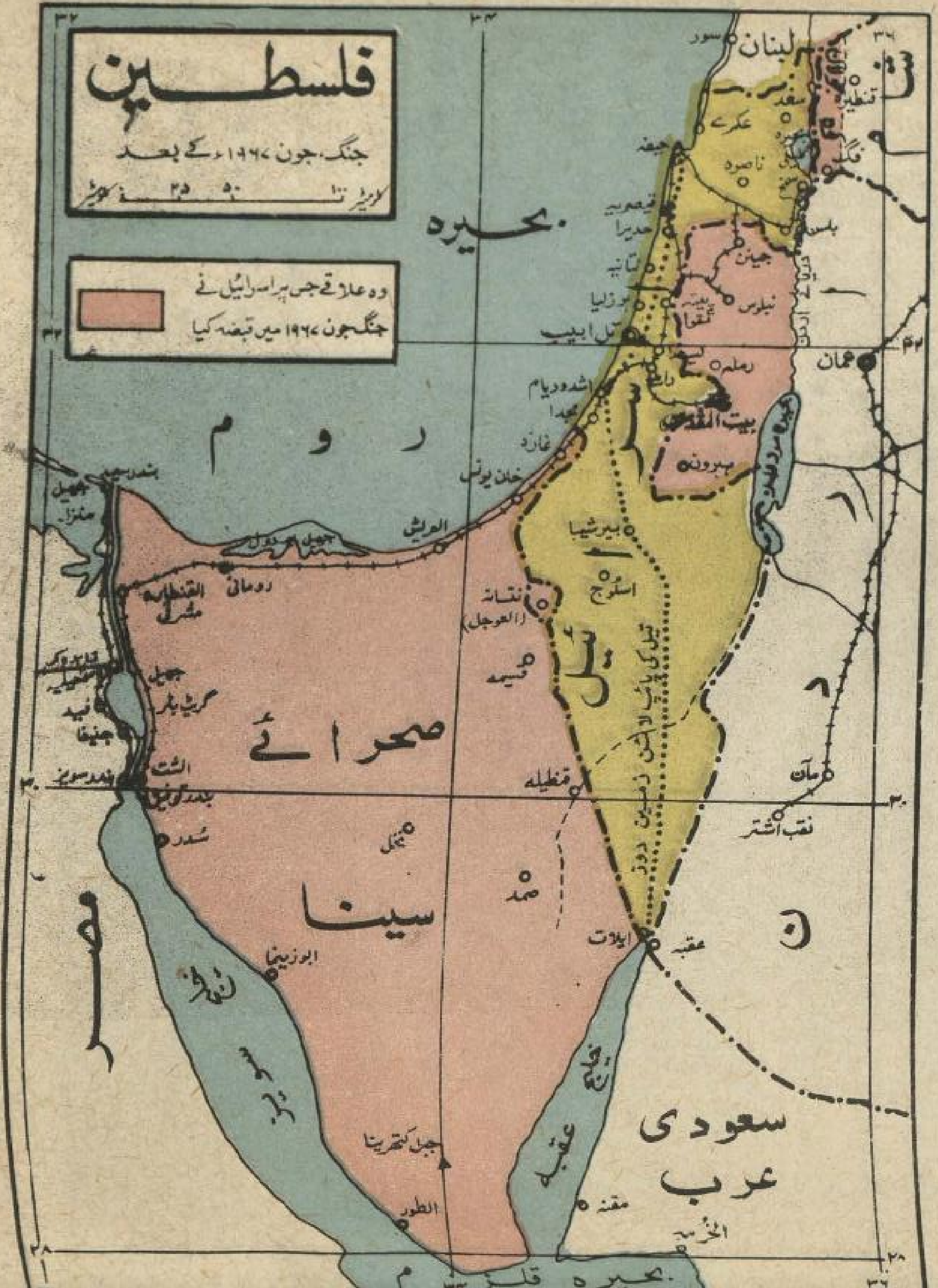

فلسطین
جنگ جون ۱۹۶۷ء کے بعد
وہ علاقے جن پر اسرائیل نے جنگ جون ۱۹۶۷ء میں قبضہ کیا
بحیرہ روم
صحرائے سینا
سعودی عرب
مصر
لبنان
عمان
حیفا
ناصرہ
نابلس
تل ابیب
بیت المقدس
غازہ
العریش
بیرشیبا
ایلات
عقبہ

گھنٹے کے اندر اندر امریکہ نے اس کو تسلیم کر لیا ۔ ادھر ہمسایہ عرب ممالک کی افواج نے فلسطین پر حملہ کر دیا تا کہ سارے فلسطین پر عربوں کا قبضہ ہو سکے ۔ امریکہ اور دنیا بھر کے یہودیوں نے اسرائیل کی مدد کی ۔ عرب ان کے مقابلہ میں کمزور ثابت ہوئے ۔ فلسطین کی عرب آبادی کو برطانیہ نے نہتا کر رکھا تھا ۔ سارے ہمسایہ عرب ممالک پوری طرح آزاد نہ تھے ۔ اتحادیوں کی افواج ابھی تک ان ملکوں میں براجمان تھیں ۔ ان سارے عرب ممالک کی افواج کے سپاہیوں کی تعداد ۲۰ ہزار کے لگ بھگ تھی ۔ ان حالات میں ۱۹۴۹ء میں جب جنگ بند ہوئی تو یہودی فلسطین کے ۸۰ فیصد علاقے پر قابض ہو چکے تھے ۔ بیت المقدس کے جدید حصے پر یہودیوں کا قبضہ ہو گیا تھا ۔ پرانا بیت المقدس عربوں کے پاس رہ گیا تھا ۔ غازہ کی پٹی پر مصری افواج قابض تھیں اور دریائے اردن کا مغربی کنارہ شرق اردن کی افواج کے زیراثر تھا جسے بعد میں شاہ اردن نے اپنی مملکت کا حصہ بنا لیا ۔

مصر کے صدر جمال ناصر نے نہر سویز کو قومی تحویل میں لے لیا تو ۱۹۵۶ء میں نہر سویز پر اپنا قبضہ بحال کرنے کے لیے برطانیہ اور فرانس نے اسرائیل کے تعاون سے مصر پر حملہ کیا اور صحرائے سینا پر قبضہ کر لیا ۔ ۱۹۵۷ء میں بین الاقوامی دباؤ کے تحت اسرائیل نے مصر کا علاقہ خالی کر دیا ۔

جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے پانچ روزہ جنگ کے دوران بڑی سرعت کے ساتھ مصر کے نہر سویز تک صحرائے سینا کے علاقہ ، غازہ کی پٹی ، دریائے اردن کے مغربی کنارے ، بیت المقدس اور شام کے کوہ جولان پر قبضہ کر لیا ۔ اس جنگ میں یہودیوں کا اسرائیل کے رقبے سے چار گناہ رقبے پر قبضہ ہوگیا ۔ نہر سویز کے ایک کنارے پر اسرائیل کے قابض ہونے کی وجہ سے نہر سویز میں آمد و رفت بند ہوگئی ۔

۱۹۷۳ء میں مصر نے صحرائے سینا کا اپنا علاقہ واپس لینے اور نہر سویز پر قبضہ کر کے دوبارہ چالو کرنے کے لیے اسرائیلی فوجوں پر حملہ کر دیا ۔ مصری افواج نہر سویز کو عبور کرکے نہر سویز کے مشرقی کنارے پر قابض ہوگئیں، اسرائیلی افواج کے ناقابل تسخیر ہونے کا ہوا پاش پاش کر دیا ۔ اس جنگ میں امریکہ نے اسرائیل کو براہ راست بھرپور امداد دی ۔ مصر کا امریکی قوت سے ٹکرانا دشوار تھا ۔ اس لیے سارے صحرائے سینا پر مصر قبضہ نہ کر سکا ۔

قیام اسرائیل سے لے کر یہودیوں کی عربوں سے چار خوفناک جنگیں ہو چکی ہیں اس سے عربوں کا بے اندازہ نقصان ہوا ۔

فلسطینی عربوں نے الفتح کے نام سے تنظیم آزادی فلسطین بنا رکھی ہے **یاسر عرفات** اس کے سربراہ ہیں ۔ الفتح اسرائیل کے وجود کو جائز تسلیم نہیں کرتی ۔ یہ تنظیم اسرائیل کو ختم کرنا چاہتی ہے ۔ باہر سے آئے ہوئے یہودیوں سے فلسطین کو پاک کرنے کا عزم رکھتی ہے ۔ مہاجر کیمپوں میں مقیم فلسطین کے لاکھوں خاندانوں کو دوبارہ اپنے گھروں میں آباد کرنے کی خواہاں ہے اور فلسطین کے علاقے میں ایک آزاد عرب جمہوریہ کے قیام کے لیے کوشاں ہے ۔ کئی ممالک نے تنظیم آزادی فلسطین

کو فلسطینیوں کی نمائندہ تنظیم تسلیم کر رکھا ہے ۔ العاصفہ الفتح کی فوجی تنظیم ہے یہ اسرائیل کے خلاف گوریلا کارروائیاں کرتی رہتی ہے ۔

اسرائیل مقبوضہ علاقے خالی کرنے کے لیے تیار نہیں ۔ تنظیم آزادی فلسطین کا کٹر دشمن ہے ۔ فلسطینی عربوں کی آزاد ریاست کے قیام کا سخت مخالف ہے ۔ اسرائیل مقبوضہ علاقوں میں فوجی اڈے بنا رہا ہے اور یہودی آبادکاروں کے لیے ۱۵۰ کے قریب بستیاں تعمیر کر چکا ہے ۔ وہ توسیع پسندانہ عزائم رکھتا ہے ۔ مستقبل میں اسرائیل کی علاقائی توسیع کے لیے یہودیوں نے منصوبے بنا رکھے ہیں ۔ دریائے نیل (مصر) سے دریائے فرات (عراق) تک اور ترکیہ سے مدینہ منورہ (سعودی عرب) تک کے علاقے ایک مضبوط و محفوظ اسرائیل کے لیے وہ ضروری سمجھتے ہیں ۔

کچھ عرب ممالک اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ اسرائیل مقبوضہ عرب علاقوں کو واگذار کر دے ، غازہ اور دریائے اردن کے مغربی کنارے کے علاقوں میں فلسطینی عربوں کی آزاد ریاست قائم کرنے پر رضامند ہو جائے اور بیت المقدس مسلمانوں کی تحویل میں دے دے ۔ امریکہ کے سخت دباؤ کے تحت اسرائیل مصر کا مفتوحہ علاقہ تین سال کے عرصہ میں خالی کرنے پر بادل نخواستہ راضی ہوا ہے ۔ صحرائے سینا کا العریش تک کا علاقہ مئی ۱۹۷۹ء میں واگذار بھی کر دیا ہے ۔

مسئلہ کشمیر :

۱۹۴۷ء میں ہندوستان میں گیارہ صوبے اور ۵۸۴ ریاستیں تھیں ۔ صوبوں پر حکومت برطانیہ کے مقرر کردہ انگریز گورنر حکومت کرتے تھے اور دیسی ریاستوں پر ہندوستانی راجے اور نواب وراثتاً فرمانروا تھے ۔ یہ راجے اور نواب وائسرائے ہند کے زیر نظر اور حکومت برطانیہ کے زیر سایہ حکومت کرتے تھے ۔ رقبے کے لحاظ سے کشمیر سب ریاستوں سے بڑی تھی ۔ اس کا رقبہ تقریباً ۲۱۸۷۸۱ مربع کلو میٹر تھا ۔

کشمیر اپنی خوبصورتی اور صحت افزائی کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے ۔ اس وجہ سے کشمیر کو فردوس بریں ، جنت ارضی ، کشمیر جنت نظیر ، حسن فطرت کی نمائش گاہ اور ایشیا کا سوئٹزر لینڈ کے تعریفی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے ۔

کشمیر کے جنوب مشرق میں بھارت ، جنوب مغرب میں پاکستان ، شمال مغرب میں افغانستان اور شمال مشرق میں چین ہے ۔ کشمیر کے شمال مغرب کی جانب روس کی سرحد صرف پندرہ میل دور ہے ۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء تک اس ریاست کے تین صوبے تھے ۔ (۱) وادی کشمیر (۲) جموں اور (۳) سرحدی علاقے جن میں گلگت ، بلتستان اور لداخ شامل تھے ۔ تاہم ریاست کا سرکاری نام صرف دو اہم صوبوں کی نسبت سے ریاست جموں و کشمیر تھا اور ہے لیکن عام بول چال میں ساری ریاست کے لیے صرف کشمیر کا نام کافی سمجھا جاتا ہے ۔

۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست کی کل آبادی ۴۰ لاکھ کے لگ بھگ تھی جس میں ۷۷ فیصد مسلمان اور ۲۰ فیصد ہندو تھے - ۴۴ فیصد لوگ وادی کشمیر میں، ۴۸ فیصد صوبہ جموں میں اور ۸ فیصد سرحدی علاقوں گلگت، بلتستان اور لداخ میں رہتے تھے -

قدیم زمانے میں کشمیر کے علاقے میں کھاسا قبیلہ کے لوگ رہتے تھے - روایت ہے کہ ان لوگوں نے اس علاقے کا نام اپنے قبیلہ کی نسبت سے کشمیر رکھا - کشاں قبیلہ کے لوگ بھی کشمیر پر حکمران رہے - ہندوؤں کی رزمیہ کتاب مہابھارت میں کشتریوں کے ایک قبیلہ کشمیرا کا ذکر بھی موجود ہے جو شمالی ہندوستان میں آباد تھا - ہو سکتا ہے کشمیر کا نام کشان یا کشمیرا سے اخذ کیا گیا ہو -

۱۳۴۶ء میں پہلی بار مسلمان کشمیر کی حکومت پر فائز ہوئے اور ۱۸۱۹ء تک برسر اقتدار رہے - ۱۳۴۶ء سے ۱۵۸۶ء تک وہاں کشمیری مسلمان بادشاہ حکومت کرتے رہے - ۱۵۸۶ء سے ۱۷۵۲ء تک کشمیر سلطنت مغلیہ کا حصہ رہا - ۱۷۵۲ء سے ۱۸۱۹ء تک یہ درانی افغانوں کے ماتحت رہا - ۱۸۱۹ء میں پنجاب کے سکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جموں اور کشمیر کو فتح کرکے اپنی مملکت میں شامل کر لیا - ۱۸۲۰ء میں رنجیت سنگھ نے جموں کا علاقہ اپنے دربار کے وزیر ہندو راجپوت ڈوگرہ مہاراجہ گلاب سنگھ کو بطور جاگیر دے دیا - سبراؤں کی جنگ میں گلاب سنگھ نے سکھوں کے خلاف انگریزوں کی امداد کی - انگریز فتحیاب ہوئے اور سکھ دربار تاوان جنگ ادا نہ کر سکا تو کشمیر کا علاقہ انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا - انگریزوں نے جنگ میں امداد کے صلے میں صرف ۷۵ لاکھ روپے کے عوض معاہدہ امرتسر ۱۸۴۶ء کے تحت کشمیر گلاب سنگھ کو دے دیا - لداخ، بلتستان اور گلگت کے علاقے گلاب سنگھ اور اس کے جانشینوں نے خود فتح کیے - اس طرح جموں و کشمیر کی ڈوگرہ ریاست وجود میں آئی -

جموں و کشمیر پر ڈوگرہ خاندان کے پانچ راجوں نے حکومت کی - مہاراجہ گلاب سنگھ نے ۱۸۱۹ء سے ۱۸۵۷ء تک، رنبیر سنگھ نے ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۵ء تک، پرتاب سنگھ نے ۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۵ء تک، ہری سنگھ نے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۹ء تک اور یوراج کرن سنگھ نے ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء تک - اس ڈوگرہ راج میں مسلمانوں پر بے پناہ ظلم و جبر ہوا - جب ظلم کی انتہا ہوگئی تو ۱۹۳۱ء میں کشمیری مسلمان شیخ محمد عبداللہ، چودھری غلام عباس اور میر واعظ محمد یوسف شاہ کی قیادت میں اٹھ کھڑے ہوئے - اس احتجاج نے بغاوت کی صورت اختیار کر لی - انجام کار مہاراجہ کو کچھ حقوق اپنی مسلمان رعایا کو دینا پڑے - ۱۹۳۲ء میں ریاست میں مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم کانفرنس قائم ہوئی - ۱۹۳۴ء میں ریاست میں قانون ساز اسمبلی وجود میں آئی - ۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس کا نام نشینل کانفرنس رکھ دیا گیا - ۱۹۴۲ء میں چودھری غلام عباس نے مسلم کانفرنس کو پھر قائم کر دیا - اس طرح کشمیر میں دو سیاسی جماعتیں بن گئیں - نیشنل کانفرنس لا دین جماعت تھی اور اس کا

قائد شیخ عبداللہ تھا - ۱۹۴۶ء میں شیخ عبداللہ نے مہاراجہ کشمیر کے خلاف "کشمیر چھوڑ دو" تحریک چلائی - مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ نے اس تحریک میں شیخ عبداللہ کا ساتھ نہ دیا - شیخ عبداللہ کی پالیسی میں تضاد تھا - ہندو مہاراجہ سے دشمنی مگر ہندو کانگرسیوں سے دوستی -

۳ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان کے مطابق ہندوستان کے برطانوی صوبے تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم کر دیے گئے تھے اور کچھ سرحدوں کا قطعی تعین دو سرحدی کمیشنوں نے کرنا تھا - دیسی ریاستوں کے بارے میں برطانیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو برطانوی تسلط سے آزاد کر دیا جائے گا - ہر ریاست کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہے تو (۱) آزاد رہے (۲) ہندوستان میں شامل ہو جائے یا (۳) پاکستان سے الحاق کر لے - مزید برآں وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے والیان ریاست کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی اپنی ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت اپنی ریاست کے محل وقوع اور ریاست کے لوگوں کی مرضی و منشا کا خیال رکھیں - مگر کشمیر کے بارے میں خود ماؤنٹ بیٹن اس مشورے کے برعکس حرکات کا مرتکب ہوا -

کشمیر کا تنازعہ پیدا کرنے اور پاکستان کو کشمیر سے محروم رکھنے میں انگریزوں نے نمایاں کردار ادا کیا - پاکستان کے خلاف انگریزوں کے اس طرز عمل کے کئی اسباب تھے :

۱- انگریز ہندوستان کو آزاد کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن جنگ عظیم دوم میں اتنے کمزور ہوگئے کہ آزاد کیے بغیر کوئی چارہ نہ رہا - جاتے جاتے کشمیر کا مسئلہ پیدا کر گئے تاکہ بھارت اور پاکستان آپس میں ٹکراتے رہیں اس ٹکراؤ میں اپنی توانائیاں ضائع کرتے رہیں - معاشی طور پر خود کفیل نہ ہوسکیں اور اپنی معاشی و حربی ضروریات کے لیے انگریزوں کے محتاج رہیں -

۲- مسلم دشمنی کی وجہ سے انگریز مطالبہ پاکستان کے مخالف تھے - وہ بادل نخواستہ پاکستان بنانے پر راضی ہوئے تھے - تاہم انھوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ کم ازکم علاقہ دے کر پاکستان کو کمزور رکھا جائے -

۳- مسلم لیگ کے پاکستان کے مطالبہ پر اصرار اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان کا گورنر جنرل بنانے سے انکار کی وجہ سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن مسلم لیگ سے ناراض ہو گیا تھا اور مسلم لیگ کو اس کے رویہ کی سزا دینے کے درپے ہو گیا تھا -

۴- لارڈ ماؤنٹ بیٹن پنڈت نہرو کا ذاتی دوست تھا - نہرو نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو آزاد بھارت کا پہلا گورنر جنرل بنا کر مزید اس کا من موہ لیا تھا -

۵- نہرو کشمیری برہمن تھا اور کشمیر کو بھارت میں شامل کرنے کا آرزو مند - لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے حق دوستی اور احسان شناسی کے طور پر نہرو کی اس آرزو کو پورا کرنے کے لیے پورے جتن کیے -

انگریزوں کے ان محرکات اور اپنی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے

حسب ذیل کارروائیاں کیں ۔

(۱) مہاراجہ کشمیر کو بھارت کے ساتھ الحاق پر آمادہ کرنے کے لیے ماؤنٹ بیٹن جون ۱۹۴۷ء میں خود کشمیر گیا ۔ خود کامیاب نہ ہوا تو جولائی میں مہاتما گاندھی کو مہاراجہ کے پاس بھیجا ۔

(۲) سرحدی کمیشن کے صدر ریڈ کلف کی وساطت سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ضلع گورداسپور کی تین تحصیلیں بٹالہ، گورداسپور اور پٹھانکوٹ بھارت کو دلوا کر بھارت کی سرحد کو کشمیر سے متصل کر دیا ۔

(۳) قائد اعظم(رح) نے بھارتی فوج کے کشمیر میں داخلہ کو روکنے کے لیے پاکستانی فوج کو جموں کے علاقہ میں بھیجنے کا حکم دیا تو پاکستانی فوج کے انگریز کمانڈر انچیف جنرل گریسی کے ذریعہ ماؤنٹ بیٹن نے اس حکم پر عمل نہ ہونے دیا ۔ جب کہ بھارتی فوج کو کشمیر میں بھیجنے کے لیے خود اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا ۔

(۴) مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں پیش ہوا تو وہاں برطانیہ کا نمائندہ نوئل بیکر کوشش کر رہا تھا کہ کشمیر کا منصفانہ تصفیہ ہو جائے ۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اس کو بدلوا کر اپنی پسند کا برطانوی نمائندہ اقوام متحدہ میں بھجوا دیا ۔

پاکستان کشمیر کے الحاق کا خواہشمند تھا ۔ اس خواہش کی پشت پر حسب ذیل اسباب تھے :

۱۔ کشمیر میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت تھی ۔ پاکستان چاہتا تھا کہ پاکستان میں شامل ہوکر کشمیری مسلمان بھی آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہوں، ہندو مہاراجہ کے غلام نہ رہیں یا بھارت کے ہنود کے زیر دام نہ چلے جائیں ۔

۲۔ بھارتی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام اور وہاں سے مسلمانوں کے جبری انخلاء سے پاکستان کو خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ اگر کشمیر میں بھی اسی قسم کا سفاکانہ مظاہرہ ہوا تو کشمیر تو رہے گا ہندوؤں کے پاس، لیکن کشمیری مسلمان پاکستان کی طرف دھکیل دیے جائیں گے اور اتنے لوگوں کو پاکستان میں آباد کرنا ناممکن ہوگا ۔

۳۔ پاکستان کی تقریباً ۹۰۰ کلومیٹر طویل سرحد کشمیر سے لگتی ہے ۔ کشمیر کی پاکستان میں شمولیت کی صورت میں دفاعی لحاظ سے یہ سرحد معدوم ہو جاتی ۔ عدم شمولیت کی صورت میں اس سرحد کے ساتھ دفاعی انتظامات کرنے پڑتے ۔ پنجاب کے اہم شہر دشمن کی سرحد سے قریب ہو جاتے اور لاہور سے راولپنڈی تک ریلوے لائن اور شاہراہ دشمن کی زد میں آ جاتیں ۔ اس طرح پاکستان دفاعی لحاظ سے بہت کمزور ہو جاتا ۔

۴۔ پاکستان کو احساس تھا کہ نہ صرف اس کی زرعی معیشت بلکہ اس کی زندگی اور بقا کا انحصار ان دریاؤں کے پانی پر ہے جن کے سرچشمے اور بالائی گزرگاہیں کشمیر میں واقع ہیں ۔ سیلابوں کی روک تھام، برقابی قوت کا حصول، آبپاشی کے لیے پانی کی خاطر خواہ دستیابی اور آبی ذخیروں کی تعمیر کشمیر میں ان دریاؤں پر بند باندھ کر ممکن ہے ۔ یہ دریا پاکستان کے لیے شاہ رگوں کا درجہ رکھتے ہیں ۔

اور ان شاہ رگوں پر ہندوؤں کا قبضہ پاکستان کے مسلمانوں کی زندگی کے لیے ہمہ وقت موجود خطرہ کے مترادف ہوگا ۔

۵- کشمیر کی معیشت پاکستانی علاقوں سے وابستہ تھی - سڑکیں اور آبی گزرگاہیں کشمیر کو پاکستان سے ملاتی تھیں - کشمیر کو پاکستانی علاقوں سے اناج کی ضرورت تھی اور پاکستان کو کشمیری لکڑی اور پھل کی ۔

۶- پاکستان میں صحت افزا اور سیاحت کے لیے موزوں مقامات کی کمی تھی - یہ کمی کشمیر کے الحاق کی صورت میں پوری ہو سکتی تھی - کشمیر پاکستان میں شامل ہوگیا ہوتا تو شاید پاکستان کا گرمائی صدر مقام کہیں کشمیر میں ہوتا ۔

کشمیری ہندو کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے خلاف تھے - وہ چاہتے تھے کہ یا تو ریاست مہاراجہ کے تحت آزاد رہے یا بھارت سے الحاق کرے - لیکن اس کے برعکس کشمیری مسلمانوں کی زبردست خواہش تھی کہ کشمیر پاکستان کا حصہ بنے - اس خواہش کا اظہار انھوں نے ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو ایک قرارداد کے ذریعے کر دیا تھا - مندرجہ ذیل اسباب کشمیری مسلمانوں کے دلوں میں اس خواہش کی نشو و نما کے ذمے دار تھے ۔

(۱) کشمیری مسلمان ہندو مہاراجہ سے بے حد نالاں تھے - اس کے ظالمانہ راج سے نجات حاصل کرنے کے لیے انھوں نے ۱۹۳۱ء سے تحریک چلا رکھی تھی - ریاست کے آزاد رہنے یا بھارت میں شمولیت کی صورت میں مہاراجہ سے چھٹکارا ممکن نہ تھا - ان کی نظر میں مہاراجہ سے گلوخلاصی کی واحد صورت یہ تھی کہ ریاست پاکستان میں شامل ہو ۔

(۲) کشمیری برہمنوں اور ڈوگروں کے استحصال نے کشمیری مسلمانوں کو بد حال کر رکھا تھا کشمیری مسلمان اس استحصال سے نجات حاصل کرکے خوش حال ہونا چاہتے تھے - ریاست پاکستان میں شامل ہوتی تو برہمنوں اور ڈوگروں کا زور توڑا جا سکتا تھا ۔

(۳) ہندوستان بھر میں ہندو مسلم فسادات ، بھارتی پنجاب میں سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام، بھارتی پنجاب سے مسلمانوں کے جبری انخلاء اور جموں کے علاقے میں سکھوں اور جن سنگھیوں کے مسلمان آبادیوں پر حملوں کی ابتدا نے کشمیری مسلمانوں کو چوکس کر دیا تھا - ان کو اپنے گھر بار ، جائیداد ، جان ، آبرو ، آزادی اور مستقبل کی حفاظت کی فکر دامن گیر ہو گئی تھی - اپنا وطن ان کو عزیز تھا - وہ وہیں باعزت رہنا چاہتے تھے - اپنا مسکن چھوڑنا ان کو منظور نہ تھا - ان کو صاف نظر آنے لگا تھا کہ بھارت کا حصہ بن کر ان کا کچھ بھی محفوظ نہیں رہے گا - لیکن پاکستان کا حصہ بن کر ان کا سب کچھ محفوظ ہو جائے گا ۔

(۴) پاکستان مسلمانوں کے وطن کے طور پر وجود میں آیا تھا - اس میں اسلامی معاشرہ قائم

کرنے کے ارادے تھے۔ کشمیری مسلمان بھی اپنی زندگیاں اسلامی اصولوں کے مطابق بسر کرنے کے لیے پاکستان میں شامل ہونا چاہتے تھے۔

(۵) بے شمار کشمیری مسلمان پاکستانی باشندوں کے ساتھ رشتہ داریاں رکھتے تھے۔ ان گنت کشمیری خاندان مہاراجہ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر پاکستانی علاقوں میں مستقل طور پر آباد ہو چکے تھے۔ سردیوں میں ہزاروں کشمیری کسب روزگار کے لیے پاکستانی علاقوں کا رخ کیا کرتے تھے۔ پاکستانی علاقوں سے کشمیریوں کا تجارتی لین دین آسان تھا۔ ان معاشی اور خاندانی وابستگیوں کی وجہ سے کشمیری مسلمان پاکستان سے الحاق چاہتے تھے۔

(۶) خطہ کشمیر جوہر قابل کی سرزمین ہے۔ کشمیر نے بہت سے ذہین و فطین نامور افراد پیدا کیے ہیں۔ کشمیریوں کو احساس تھا کہ ہندو مہاراجہ کشمیریوں کے جوہر قابل کو کچلتا رہا اور آئندہ بھی ہندو کشمیری مسلمانوں کے جوہر قابل کو پنپنے کا موقع نہیں دیں گے۔ ان کو امید تھی کہ پاکستان میں کشمیری مسلمانوں کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق عروج و ترقی کے مواقع میسر آئیں گے۔

کانگرس کے لیڈر کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کے سلسلے میں بڑے بے تاب اور سرگرم تھے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو لالچ دے کر کشمیر کے بارے میں اس سے بہت کام لیا۔ ریاست میں سکھوں اور جن سنگھیوں کے ذریعے حالات خراب کروا کر مہاراجہ کشمیر کو مجبور کیا کہ وہ ریاست کا الحاق بھارت سے کر دے۔ بھارتی قیادت کی اس تگ و دو کے پس پردہ حسب ذیل محرکات تھے۔

۱۔ بھارت کا وزیراعظم پنڈت نہرو کشمیری برہمن تھا۔ وہ اپنے آبائی وطن کو بھارت کا حصہ بنانے کا تمنائی تھا۔

۲۔ بھارت زیادہ سے زیادہ علاقے ہتھیا کر اپنے آپ کو زیادہ مضبوط و مستحکم کرنا چاہتا تھا اور پاکستان کو زیادہ سے زیادہ کمزور و ناتواں، تا کہ پاکستان زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکے اور اگر زندہ رہے تو اپنی ناتوانی کے باعث بھارت کے سامنے سر نگوں رہے۔

۳۔ ریڈ کلف کی خصوصی نوازش سے بھارت وادی سندھ کے تین دریاؤں ستلج، بیاس اور راوی پر قابض ہو گیا تھا۔ الحاق کشمیر کے ذریعے باقی تین دریاؤں چناب، جہلم اور اٹک کے سرچشموں پر قابض ہوکر یہ پوزیشن حاصل کرنا چاہتا تھا کہ جب جی چاہے یا جب ضرورت پڑے پاکستان کو پانی کی فراہمی بند کرکے پاکستانیوں کو پیاسا مار سکے، ان کے کھیتوں کو ویران کر سکے، پاکستان پر اپنی بالادستی تھوپ سکے یا پاکستان کو بھارت میں مدغم ہونے پر مجبور کر سکے۔

۴۔ بھارت کشمیر کے راستے سے صوبہ سرحد کے ساتھ جغرافیائی اتصال چاہتا تھا۔ استصواب رائے کے نتیجے میں صوبہ سرحد تو بھارت کو نہ مل سکا لیکن پھر بھی سرحد میں پختونستان کے فتنہ کو تقویت پہنچانے، افغانستان اور روس تک زمینی و فضائی راستے حاصل کرنے، چین سے پاکستان کا جغرافیائی رابطہ

منقطع کرنے اور مشرق پاکستان کی طرح مغربی پاکستان کے گرد گھیرا ڈالنے کے لیے بھارت کو کشمیر کی ضرورت تھی ۔

مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ اپنی ریاست کو آزاد رکھنا چاہتا تھا ۔ اس کی ریاست کی سرحدیں پاکستان اور ہندوستان دونوں سے ملتی تھیں ۔ دونوں میں سے کسی ایک ملک میں اسے شامل ہونا پسند نہیں تھا ۔ لیکن اسے احساس تھا کہ ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت کے ہوتے ہوئے وہ ریاست پر اپنی مرضی سے حکومت نہیں کر سکتا ۔ لہذا وہ مسلمانوں کی اکثریت کو ختم کرنا چاہتا تھا ۔ قیام پاکستان کے بعد پنجاب میں قتل و غارت کی فضا کو دیکھ کر اس نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے مسلمانوں کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں ۔

(۱) ریاستی فوج اور پولیس کے مسلمان سپاہیوں کو نہتا کر دیا گیا ۔

(۲) ہندو ڈوگرہ سپاہیوں نے مسلمانوں کو ہراساں کرنا شروع کر دیا ۔

(۳) پاکستان کی طرف جانے والی شاہراہوں کی ناکہ بندی کر دی ۔

(۴) ضروری اشیائے صرف کی ریاست میں آمد بند کر دی لیکن الزام پاکستان پر لگایا گیا کہ وہ ریاست کو اشیاء ضروریہ فراہم نہیں کرتا ۔

(۵) بھارتی پنجاب میں مسلمانوں کا صفایا کرنے کے بعد جب سکھ اور جن سنگھی صوبہ جموں میں مسلمانوں کا کشت و خون کرنے لگے ان کو روکا نہیں بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی ۔

مہاراجہ کی ان کارروائیوں سے کشمیر کے مسلمانوں کو اپنا وجود خطرے میں نظر آنے لگا ۔ وہ پہلے ہی مہاراجہ کے تعصب اور ظلم و ستم سے نالاں تھے ۔ ۱۹۳۱ء سے مہاراجہ کے خلاف سینہ سپر تھے ۔ وہ کشمیر کو چھوڑ کر مہاراجہ کی منشا پوری نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ کشمیر کی سرزمین پر آزاد ، بااختیار اور باوقار حیثیت سے رہنا چاہتے تھے ۔ اس لیے انھوں نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آزاد کشمیر کی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا ۔ صوبہ سرحد سے قبائلی پٹھان بھی ان کی امداد کے لیے پہنچ گئے ۔ قریب تھا کہ مجاہدین سری نگر پر قابض ہو جاتے ۔ مہاراجہ سری نگر سے بھاگ کر جموں چلا گیا ۔ مجاہدین کی یلغار سے گھبرا کر بھارت سے امداد کا طلب گار ہوا ۔ بھارت نے ریاست کے بھارت کے ساتھ الحاق کے بغیر امداد دینے سے انکار کر دیا ۔ چنانچہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجہ نے کشمیر کا بھارت سے الحاق کر دیا ۔ بھارت کی فوج کشمیر میں بھیج دی گئی ۔ بھارتی فوج کا مجاہدین پر دباؤ بڑھا تو پاکستانی فوج مجاہدین کی امداد کے لیے آزاد کشمیر میں بھیج دی گئی ۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں بھارت مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ میں لے گیا ۔

کشمیری مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے بھارت نے شیخ عبداللہ کو مہاراجہ کی جیل سے نکال کر ریاست کا وزیر اعظم بنا دیا ۔ منصب کا لالچ تھا یا نہرو کی دوستی پر بھروسہ کا کرشمہ کہ

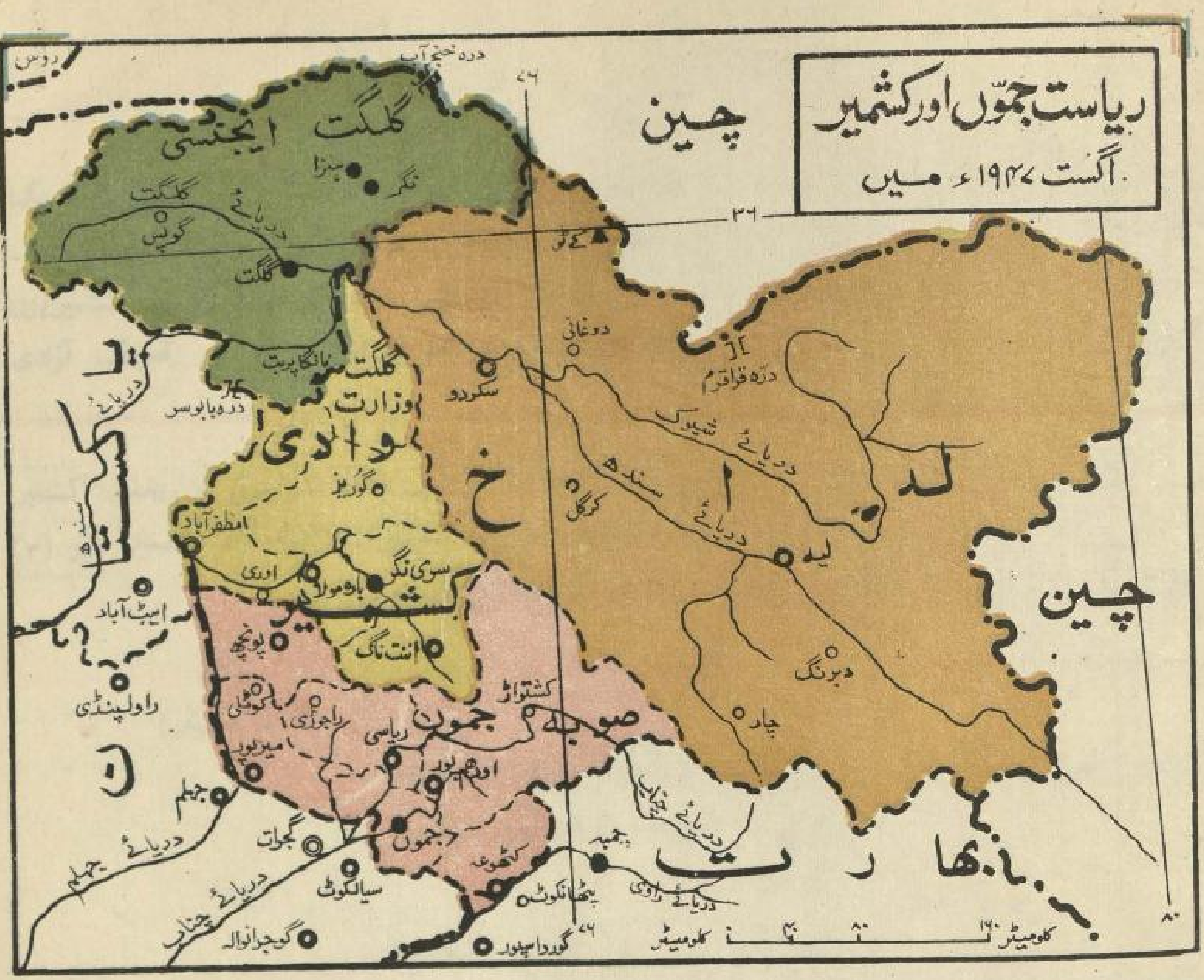
ریاست جموں اور کشمیر
اگست ۱۹۴۷ء میں
چین
گلگت ایجنسی
ہنزا
نگر
دریائے گلگت
گوپس
گلگت
روس
دوغانی
سکردو
درہ قراقرم
دریائے شیوک
لداخ
دریائے سندھ
کرگل
لیہ
دبرنگ
چارہ
چین
گلگت وزارت
وادی
گوریز
مظفرآباد
اوڑی
سری نگر
بارہ مولا
کشمیر
پونچھ
اننت ناگ
ایبٹ آباد
راولپنڈی
کشتواڑ
راجوری
صوبہ جموں
ریاسی
میرپور
ادھم پور
جموں
جہلم
دریائے جہلم
گجرات
سیالکوٹ
دریائے چناب
گوجرانوالہ
کٹھوعہ
چمبہ
پٹھانکوٹ
دریائے راوی
گورداسپور
بھارت
درہ بابوسر
کلومیٹر

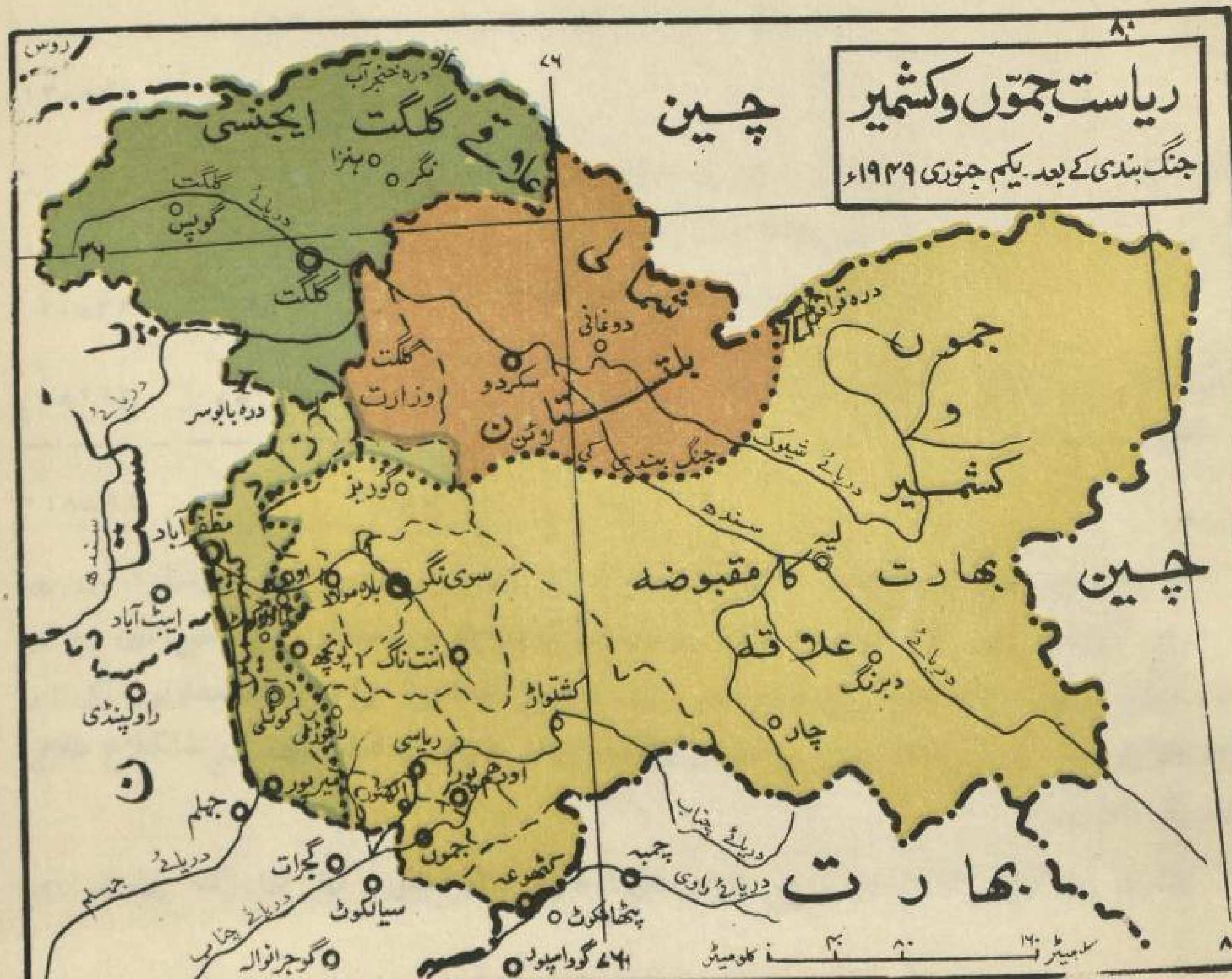
ریاست جموں و کشمیر
جنگ بندی کے بعد یکم جنوری ۱۹۴۹ء
چین
گلگت ایجنسی
علاقے
ہنزا
نگر
دریائے گلگت
گوپس
گلگت
روس
بلتستان
دوغانی
سکردو
گلگت وزارت
جنگ بندی کی لائن
درہ قراقرم
جموں و کشمیر
دریائے شیوک
سندھ
لیہ
بھارت کا مقبوضہ علاقہ
چین
دبرنگ
چارہ
درہ بابوسر
گوریز
مظفرآباد
سری نگر
بارہ مولا
اننت ناگ
پونچھ
کشتواڑ
ایبٹ آباد
راولپنڈی
ریاسی
کوٹلی
میرپور
ادھم پور
جموں
جہلم
دریائے جہلم
گجرات
سیالکوٹ
کٹھوعہ
چمبہ
دریائے راوی
پٹھانکوٹ
گوجرانوالہ
گورداسپور
بھارت
کلومیٹر

شیخ عبداللہ پینترا بدل گئے - وہی شیخ عبداللہ جو ایک سال پہلے مہاراجہ کو کشمیر سے نکالنے کی تحریک کا قائد تھا جب مہاراجہ کو کشمیر سے نکالنے کے لیے وقت جہاد آیا تو اس کے تخت کا سہارا بن گیا - شیخ عبداللہ شیر کشمیر، سے غدار کشمیر، بن گیا - بھارت اس کو اپنے مؤقف کی حمایت کے لیے کشمیریوں کے ترجمان کی حیثیت سے اقوام متحدہ تک لیے پھرتا رہا - شیخ عبداللہ کے اس رویے سے تحریک آزادی کشمیر کو بہت گزند پہنچا -

اقوام متحدہ کی کوششوں سے جنوری ۱۹۴۹ء میں کشمیر میں جنگ ختم ہوئی تو ریاست کشمیر تین حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی - (۱) ہندوستانی مقبوضہ کشمیر - (۲) آزاد کشمیر اور (۳) پاکستان کے زیرانصرام شمالی علاقے - ہر حصہ کے علاقہ کی تفصیل حسب ذیل ہے :

حصہ	علاقہ	رقبہ (کلومیٹر)	
۱- کشمیر مقبوضہ بھارت	۱- صوبہ جموں کے اضلاع پونچھ، راجوری، جموں، کٹھوعہ، اودھم پور، ریاسی اور ڈوڈہ -	۲۵۵۹۰	
	۲- وادی کشمیر کے اضلاع بارہ مولا، سری نگر، اننت ناگ اور سو پور -	۱۷۸۵۳	
	۳- لداخ -	۸۷۳۸۷	۱۳۰۸۳۰
۲- آزاد کشمیر	۱- صوبہ جموں کے اضلاع میر پور، کوٹلی اور پونچھ (راولا کوٹ) -	٦۳۷۰	
	۲- وادی کشمیر کا ضلع مظفر آباد -	۴۲٦۳	۱۰۶۳۳
۳- شمالی علاقے زیرانصرام حکومت پاکستان	گلگت اور بلتستان	۷۷۲۱۸	۷۷۲۱۸
	کل رقبہ		۲۱۸۶۸۱

اس تفصیل کے مطابق ریاست جموں و کشمیر کے کل رقبہ ۲۱۸۶۸۱ مربع کلومیٹر میں سے ۸٦۹ مربع کلومیٹر رقبہ آزاد کشمیر، گلگت اور بلتستان کی صورت میں مسلمانوں کے قبضے میں ہے اور ۱۳۱۱۳ مربع کلومیٹر علاقہ بھارت کے قبضے میں - یوں سمجھیے کہ تقریباً ۲/۵ علاقہ مسلمانوں کے پاس اور ۳/۵ بھارتی فوج کے زیر تسلط ہے - زرخیز اور کارآمد وادیاں بھارت کے قبضے میں اور سنگلاخ علاقے مسلمانوں کے پاس ہیں -

بھارت نے کشمیر کا الحاق عارضی طور پر اس شرط کے ساتھ منظور کیا تھا کہ ریاست میں

امن و امان بحال ہونے کے بعد ریاست کے باشندوں سے دریافت کیا جائے گا کہ وہ پاکستان اور بھارت میں سے کس مملکت میں شامل ہونا چاہتے ہیں اور اکثریت کی رائے کا احترام کیا جائے گا۔ پھر جنوری ۱۹۴۹ء میں کشمیر میں جنگ بندی بھی اقوام متحدہ میں بھارت کے اس وعدہ پر ہوئی تھی کہ الحاق کے بارے میں لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے لیے اقوام متحدہ کے مقرر کردہ ناظم کی نگرانی میں استصواب کروایا جائے گا۔ لیکن وہ وعدہ ہی کیا ہوا جو ایفا ہو گیا۔ نیت خراب را بہانہ بسیار۔ بھارت ایک طرف کشمیر میں اپنی پوزیشن مستحکم کرتا گیا اور دوسری طرف مختلف بہانوں سے استصواب کو ٹالتا رہا۔ در اصل بھارت کو کشمیری مسلمانوں کا میلان معلوم ہے اور وہ ان کے فیصلہ سے خائف ہے۔ حالانکہ یہ استصواب بھارتی فوج کی کشمیر میں موجودگی میں ہونا تھا۔

مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں پیش ہوتا رہا۔ اقوام متحدہ کا کمیشن کوشش کرتا رہا۔ اقوام متحدہ کے نمائندے اور ثالث تصفیہ کے لیے جتن کرتے رہے، ان کی ہر تجویز پاکستان منظور کر لیتا رہا۔ لیکن بھارت ماننے سے انکار کرتا رہا، حتیٰ کہ بھارت کے ایما پر روس نے سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر کو ویٹو کرنا شروع کر دیا۔

بھارت اور پاکستان کے قائدین کے درمیان براہ راست گفت و شنید ہوتی رہی۔ جناح اور ماؤنٹ بیٹن، لیاقت اور نہرو، نہرو اور محمد علی بوگرہ، ایوب اور نہرو، بھٹو اور سورن سنگھ کے درمیان مذاکرات بھارت کی بد نیتی اور ہٹ دھرمی کے باعث نتیجہ خیز نہ ہو سکے۔

۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں بھارت اور پاکستان کے درمیان دو بھیانک لڑائیاں ہوئیں۔ پاکستان کشمیر حاصل نہ کر سکا۔ تاشقند اور شملہ کے معاہدے ہوئے، ان میں کشمیر کا ذکر برائے نام بھی نہ ہوا۔

روس کھل کر مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی مخالفت اور بھارت کی حمایت کرتا ہے۔ فرانس، برطانیہ اور امریکہ مسلم دشمنی اور اپنے مفادات کی خاطر بھارت کے خلاف کچھ کہنا اور کرنا نہیں چاہتے۔ چین مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے مؤقف کی حمایت کرتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑی طاقتوں کا رویہ بھارت کے مفاد میں جا رہا ہے۔ ادھر بھارت بھی مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں پینترے بدلتا رہا۔ ۱۹۵۱ء میں کشمیر اسمبلی منتخب ہوئی تو اس سے کشمیر کے بھارت سے الحاق کی توثیق کروائی اور اس کارروائی کو استصواب رائے عامہ کا بدل قرار دینے لگا۔ ۱۹۵۳ء میں شیخ عبداللہ کشمیر کا مقام متعین کرنے کے لیے استصواب کا وعدہ پورا کرنے پر اصرار کرنے لگا تو نہرو نے اسے گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا۔ نہرو اور اس کی بیٹی اندرا نے شیخ عبداللہ کو چودہ سال قید میں رکھا۔

۱۹۵۷ء کے بعد رفتہ رفتہ بھارت نے ریاست کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کر دی۔ صدر ریاست کی بجائے گورنر، وزیر اعظم کی بجائے وزیر اعلیٰ، پرچم کشمیر کی بجائے پرچم بھارت ترنگا اور اُردو کی

بجائے ہندی زبان کشمیر کے مقدر بنا دیے گئے - بالاخر بھارت یہ کہنے لگا کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے - اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ طاقت کے نشے میں بھارت سارے کشمیر پر قبضہ کرنے کے ارادوں کا برملا اظہار کرنے لگا ہے - وہ تو روز اول سے نہ صرف پاکستان کو ختم کرکے اکھنڈ بھارت قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے بلکہ بحر ہند کے تمام ساحل پر قبضہ کرکے پراچین بھارت یا وشال بھارت کے قیام کے خواب بھی دیکھ رہا ہے -

۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست جموں و کشمیر کی آبادی تقریباً ۴۰ لاکھ تھی، جس میں ۳۰ لاکھ کے لگ بھگ مسلمان تھے - ۷۲-۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی کی تفصیل ذیل میں درج ہے :

۱- کشمیر مقبوضہ بھارت

مسلمان	۳۰۴۰۱۲۹
ہندو	۱۴۰۴۲۹۲
سکھ	۱۰۵۸۷۳
	۴۶۱۵۱۷۶

۲- آزاد کشمیر ۱۵۷۲۸۵۶

۳- شمالی علاقے گلگت و بلتستان تقریباً ۱۵ لاکھ

اس تفصیل کے مطابق ریاست جموں و کشمیر کے تینوں حصوں کی آبادی تقریباً ۷۷ لاکھ ہے اور ۸ لاکھ کے لگ بھگ کشمیری پاکستان میں پناہ گزین ہو چکے ہیں - لہذا کشمیریوں کی مجموعی آبادی تقریباً ۸۵ لاکھ ہے جن میں سے تقریباً ۳۹ لاکھ آزاد کشمیر ، گلگت ، بلتستان اور پاکستان میں رہتے ہیں اور ۴۶ لاکھ کشمیر کے بھارت کے مقبوضہ حصے میں - ان میں تقریباً ۲۹ لاکھ مسلمان ہیں اور ۱۶ لاکھ ہندو سکھ - اگرچہ ۱۹۴۷ء میں صوبہ جموں کے کئی اضلاع سے ہندوؤں نے مسلمانوں کا صفایا کر دیا تھا ، پاکستانی علاقوں سے ہزاروں ہندو، سکھ کشمیر میں جا کر آباد ہوگئے تھے اور بہت سارے ہندو، سکھ بھارت سے لا کر کشمیر میں آباد کیے جا چکے ہیں - پھر بھی بھارتی مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی ہندوؤں سکھوں کی مجموعی آبادی سے دگنی ہے - کشمیر میں آج بھی استصواب رائے عامہ ہو تو مسلمان پاکستان کے حق میں ووٹ دیں گے - لیکن بھارت استصواب پر کبھی رضامند نہیں ہوگا - بھارت کشمیر کو چھوڑنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور بڑی طاقتیں حصول کشمیر میں پاکستان کی کوئی مدد نہیں کریں گی - کشمیر لینے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ ہے طاقتور پاکستان - پاکستان کو طاقتور بنانے کے لیے قومی اتحاد ، مسلسل محنت ، دیانتداری ، معاشی ترقی ، اسلام سے نظریاتی وابستگی ، اتحاد عالم اسلام اور مؤثر حربی و فنی ایجادات ضروری ہیں - پاکستان کو طاقتور بنانے کے لیے ہمہ وقت

اور ہمہ جہت کوشاں رہیے ۔ کوشش ہمارا فرض ہے، اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب اور کارساز ہے ۔ آج حالات سازگار نہیں تو کل حالات سازگار ہو سکتے ہیں ۔

سوالات

۱- اریٹیریا کے لیے اقوام متحدہ کے کمیشن کے تیار کردہ دستور کے اہم نکات کیا تھے ؟

۲- مسئلہ فلسطین کا تاریخی پس منظر بیان کیجیے ۔

۳- عربوں کی اسرائیل سے کون کون سی جنگیں ہوئی ہیں اور ان کے کیا نتائج نکلے ؟

۴- اسرائیل کے قیام اور اس کے ساتھ عربوں کی جنگوں کے نقصانات و اثرات بیان کیجیے ۔

۵- مغربی ممالک اسرائیل کی کیوں حمایت کرتے رہے ہیں ؟

۶- مسئلہ فلسطین کے بارے میں تازہ فلسطینی ، اسرائیلی اور عرب مؤقف کیا ہے ؟

۷- مسئلہ کشمیر کا تاریخی پس منظر بیان کیجیے ۔

۸- کشمیر کا تنازعہ پیدا کرنے اور پاکستان کو کشمیر سے محروم رکھنے کی انگریزوں نے کیوں کوشش کی ؟

۹- ماؤنٹ بیٹن نے کشمیر کے سلسلے میں کیا کارروائیاں کیں ؟

۱۰- پاکستان کشمیر کے الحاق کا کیوں خواہشمند تھا ؟

۱۱- کشمیری مسلمان پاکستان سے کشمیر کا الحاق کیوں چاہتے تھے ؟

۱۲- بھارت کشمیر کا الحاق کیوں چاہتا تھا ؟

۱۳- اگست ۱۹۴۷ء کے بعد مہاراجہ کشمیر نے کشمیری مسلمانوں کے خلاف کیا کارروائیاں کیں ؟

۱۴- مسئلہ کشمیر کے فیصلے کی خاطر کیا کوششیں ہوتی رہی ہیں ؟

۱۵- اب مسئلہ کشمیر کی کیا صورت حال ہے ؟

(حصہ دوم)

پہلا باب

معاشرتی علوم کی تعریف، وسعت اور توضیحات

معاشرتی علوم کی اصطلاح اگرچہ بظاہر عام فہم اور خاصی مشہور ہے پھر بھی بعض اوقات غلط فہمیوں کا باعث بن جاتی ہے۔ اس لیے اس کی تعریف و توضیح اور وسعت و تحدید ضروری نظر آتی ہے۔

کسی بھی علم کو کسی مخصوص تعریف میں بند کر لینا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے اور ظاہر ہے دریا کبھی بھی اپنی وسعتوں سمیت کوزے میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ ضرور کچھ پہلو ایسے ہوتے ہیں جو اس تعریف سے باہر رہ جاتے ہیں اس لیے معاشرتی علوم کی دو نمائندہ تعریفیں درج کی جاتی ہیں، تاکہ اس کے اہم پہلوؤں کی نشاندہی ہو جائے۔ وضاحت تو صرف تشریحات سے ہی ہو سکتی ہے۔

تعریف :

ویزلے (Wesley) اور رانسکی (Wronski) کا کہنا ہے کہ معاشرتی علوم کا مضمون عمرانی علوم کے ان سادہ، منتخب اور تلخیص شدہ حصوں یا پہلوؤں پر مشتمل ہے جو مدارس میں تدریس کے لیے اپنا لیے گئے ہوں۔ اس تعریف کی وضاحت یہ ہے کہ معاشرتی علوم کا سارا مواد عمرانی علوم سے لیا جاتا ہے۔ وہ مواد خاصی کانٹ چھانٹ کے بعد لیا جاتا ہے۔ صرف مطلوبہ اور مخصوص سماجی پہلوؤں کا خلاصہ تیار کیا جاتا ہے زیادہ فنی، پیچیدہ اور تفصیلی باتوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور یہ سب کچھ تدریسی نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے۔ طلبہ کی ضرورتیں ہی پیش نظر ہوتی ہیں۔ کوئی فاضلانہ مقاصد اور امور مدنظر نہیں رکھے جاتے اور مواد کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ طلبہ کے لیے عام فہم، دلچسپ اور معنی خیز ہو اور ان کی انفرادی اور اجتماعی، سماجی ضرورتوں کو پورا بھی کرے اور ان کے مخصوص علمی درجوں کے تقاضوں کے مطابق بھی ہو۔ یہ ہے معاشرتی علوم کا ایک مخصوص نقطۂ نظر۔ اس تعریف سے یہ پتہ تو چلتا ہے کہ معاشرتی علوم کا منبع و مصدر کون سے علوم ہیں مگر یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ وہ کون سا مرکزی نقطۂ نظر ہے جس پر معاشرتی علوم اپنی خصوصی توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ یہ چیز ہمیں ایک اور ماہر مضمون سے حاصل ہو جاتی ہے۔

پوری تعداد میں شامل بھی ہوں - اصولی طور پر وہ تمام علوم جو انسانی روابط اور معاملات سے سروکار رکھتے ہیں وہ تمام اس میں موجود ہونے چاہئیں مگر ایسا کم ہی ہوتا ہے اور یہ ہر ملک کی تعلیمی روایت، نصابی وسعت، ملکی ضرورت، دستیاب وسائل، مصنفین کی علمی استعداد وغیرہ پر مبنی ہے - ہمارے ہاں صرف تاریخ، جغرافیہ اور شہریت کو اور وہ بھی جداگانہ انداز میں معاشرتی علوم سمجھا جاتا ہے - حالانکہ فنی اور علمی نقطہ نظر سے بہت سے علوم مثلاً اقتصادیات، معاشریات، انسانیات، سماجی نفسیات، سیاسیات، زبان و ادب بھی اس کا منبع سمجھے جاتے ہیں اور یقیناً یہ ہے بھی صحیح -

معاشرتی علوم کا مرکزی نقطہ انسانی تعلقات اور جملہ انسانی معاملات ہیں - یعنی اس میں سماجی گروہوں، سماجی اداروں، ثقافتوں اور سوسائیٹیوں کے حالات و کوائف سے اس طرح بحث کی جاتی ہے کہ انسانوں کے آپس کے تعلقات، ان کی نوعیت اور وسعت اور انداز تعامل و اشتراک کھل کر سامنے آجاتا ہے - دنیا میں کامیاب، پرمسرت اور بابرکت انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے اس قسم کا مطالعہ نہایت ضروری ہے -

انسان نہ اکیلا ہے اور نہ ہی اکیلا رہ سکتا ہے - ایک فرد کا کنبے، قبیلے، محلے، علاقے، ملک، پورے معاشرے اور بین الاقوامی برادری سے کسی نہ کسی صورت میں ضرور تعلق و واسطہ رہتا ہے - اگر کوئی فرد یہ دعویٰ کرے کہ وہ اپنی ذات میں کامل اور کافی ہے اور اسے کسی دوسرے فرد یا گروہ انسان یا معاشرہ کی ضرورت نہیں تو اس کا یہ دعویٰ باطل اور غیر حقیقی ہوگا - بقول مشہور ماہر معاشریات ایمیل ڈرخائیم (Emile Durkheim) معاشرے سے ہٹ کر فرد کی ذات کا تصور نہیں ہو سکتا یعنی فرد کی شخصیت و انفرادیت قائم ہی نہیں ہو سکتی - گویا اجتماعی روابط انسانی فطرت کا حصہ ہیں جن کی تشفی کے بغیر انسان صحیح معنوں میں نہ انسان کہلا سکتا ہے اور نہ ہی معاشرتی ترقی کر سکتا ہے - لہذا فرد کی ذاتی نشو و نما اور اس کی ذاتی بہبود اسی میں ہے کہ وہ انفرادیت سے اجتماعیت، علاقے، ملک اور ملک سے عالمی برادری کی طرف قدم بڑھائے - یہی انسان کا مقدر ہے اور یہی اس کی سماجی فطرت کا تقاضا ہے اور اسی کی اسلام نے تعلیم دی ہے - ظاہر ہے جو فرد، قبیلہ، علاقہ یا قوم اجتماعیت اور اتحاد سے ہٹ کر گروہ بندی اور محض ذاتی مفاد کی طرف سمٹے گی تو وہ گویا وسعتوں سے محدودیت کی طرف لوٹے گی اور نتیجتاً اپنے آپ کو انتشار، کمزوری اور زوال پذیری سے دو چار ہوگی -

تاریخ عالم گواہ ہے کہ جب کسی قوم کے گروہوں کے آپس کے تعلقات جڑنے، بڑھنے اور پھیلنے کی بجائے سمٹنے، سکڑنے اور ٹوٹنے لگتے ہیں تو ایسے انسانی گروہ اور قومیں بالآخر انتشار کا شکار ہو کر غیروں کی غلامی میں چلی جاتی ہیں یا بالکل صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہیں - برصغیر پاک و ہند اور سرزمین اندلس کی اسلامی تاریخ اس کی روشن مثالیں ہیں - یہی تاریخ کا سبق ہے جس کی طرف ہمیں قرآن حکیم توجہ دلاتا ہے -

"فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون" (اگر تمہیں علم نہ ہو تو مورخین سے پوچھ لیجیے) ۔

حاصل یہ کہ انسانوں کے آپس کے تعلقات بیحد اہم ہیں ۔ یہ تعلقات جتنے گہرے، وسیع ، مثبت اور پائیدار ہوں گے وہ معاشرہ اسی قدر مضبوط و مستحکم ہوگا ۔ اگر تعلقات کشیدہ اور ناہموار ہوں گے تو معاشرہ مضطرب اور پریشان حال رہے گا اور یہ قانون خداوندی ہے جس سے کوئی قوم مستثنیٰ نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے بار بار مومنین کو اتحاد و اتفاق اور شیرازہ بندی کی طرف بلایا ہے ۔ باہمی تنازعات سے روکا ہے اور اجتماعی یک جہتی پر بیحد زور دیا ہے ۔ پاکستان اور عالم اسلام کو اس نکتے کے سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی شدید ضرورت ہے :

ع ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

معاشرتی علوم میں افراد اور ماحول کا ذکر ضمناً آتا ہے ۔ وہ بجائے خود مطلوب نہیں بلکہ ایک بلند تر حقیقت یعنی انسانی تعلقات کی نوعیت و وضاحت کے لیے ذریعے اور واسطے کا کام دیتے ہیں اور اسی انداز سے ان کو پیش کرنا چاہیے ۔ اس سے معاشرتی علوم کے مضمون کی ترتیب و تنظیم اور انداز پیشکش پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ۔ ہمیں اس مضمون کے حقائق کو علیحدہ وحدت کے طور پر نہیں پڑھانا چاہیے بلکہ اس طرح کہ ان کا ایک دوسرے سے تعلق اور اثر پذیری کھل کر سامنے آ جائے ۔ درۂ خیبر محض جغرافیہ نہیں بلکہ تاریخ بھی ہے اور سیاست بھی ۔ یہ حربیات کا موضوع بھی ہے اور وہاں کی مقامی ادبی روایت کا نشان بھی اور سچ پوچھیے تو ہند و پاک میں اسلامی تہذیب کی علامت بھی بن جاتا ہے ۔ یہ درۂ خیبر کے مختلف پہلو ہیں جنھیں دوران نصاب بندی اور تدریس مدنظر رکھنا چاہیے ۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ معاشرتی علوم میں شامل کردہ مضامین مثلاً تاریخ ، جغرافیہ ، شہریت اور معاشریات وغیرہ کو ایک دوسرے سے ربط دے کر لکھنا اور پڑھانا چاہیے کہ کس طرح جغرافیہ تاریخ بنانے میں مدد دیتا ہے اور کس انداز سے وہاں کے بسنے والوں کی معاشرتی عادات و خصائل، امنگوں اور عزائم پر اثر انداز ہوتا ہے اور پھر کس طرح مخصوص معاشرتی تصورات تاریخ و سیاست اور جغرافیہ پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ اس طرح معاشرتی علوم کے بکھرے ہوئے حقائق آپس میں گھل مل کر زیادہ بامعنی اور دلچسپ بن جائیں گے اور انسانی تعلقات و معاملات کی وسعت و پیچیدگی ابھر کر سامنے آ جائے گی ۔

ماحولیاتی نقطۂ نظر نے علوم و فنون کا زاویۂ نظر ہی بدل کر رکھ دیا ہے ۔ معاشرتی علوم کے معلم کو ایکالوجی (Ecology) یعنی علم ماحولیات سے خاصا استفادہ کرنے کی ضرورت ہے ۔ اب ذرا دو مثالوں پر غور کیجیے ۔

مشہور مثل ہے تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو ۔ اس مثال کی تاریخی حقیقت اب بیسویں صدی کے آخر میں آ کر کھلی ہے ۔ تیل کے چشموں نے عربوں اور ایرانیوں کی اقتصادی، سماجی اور سیاسی

صورت حال کو کس طرح بدل کر رکھ دیا ہے اور اس کے نتیجے میں مختلف السانی گروہوں کے آپس کے تعلقات کا انداز کس طرح تغیر پذیر ہوا ہے اور مسلسل ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے تیل کے چشمے محض تیل کے چشمے ہی نہیں، مال و زر کے فوارے بھی ہیں اور نئے اقتصادی نظام کے دھارے بھی۔ نیز سیاسی قوت کے سرخ انگارے بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ معاشرتی زندگی کے رنگا رنگ نظارے بھی ہیں۔ اگر اس انداز سے ہم پاکستان کے مختلف علاقوں کا ربط و تعلق دیکھیں گے تو ہم صحیح معنوں میں پاکستانی معاشرتی علوم کا مطالعہ کر رہے ہوں گے اور یقیناً نئی اور اچھوتی حقیقتوں سے واقف بھی ہو جائیں گے۔

محمد بن قاسم کی سندھ میں آمد محض ایک نوجوان مسلم جرنیل کی آمد نہ تھی بلکہ عربی تہذیب اور ابھرتی ہوئی مسلم ثقافت کا ورود مسعود تھا جسے آج بھی سندھ کے نخلستانوں، دینی و شعری ادب پاروں، لسانی خصوصیت، تاریخی روایات اور مجلسی آداب و خصائل میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ معاشرتی علوم کے مطالعہ سے اس قسم کی بصیرتیں ہی مطلوب و مقصود ہیں۔ اس مضمون کی تدریس کے لیے روابطی و رشتیاتی انداز ہی موزوں و مناسب ہے۔ تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، مدنیات، معاشریات اور اقتصادیات وغیرہ علوم کو ایک دوسرے سے ربط دے کر پڑھنا پڑھانا چاہیے۔ یہ ہے معاشرتی علوم کی توضیح و تفصیل۔

عمرانی علوم اور معاشرتی علوم کا ربط اور امتیاز

وہ تمام علوم جو انسانی تعلقات کو فاضلانہ اور محققانہ انداز میں موضوع سخن بناتے ہیں، عمرانی علوم کہلاتے ہیں۔ ان میں اقتصادیات، معاشریات، سیاسیات، انسانیات، تاریخ، سماجی نفسیات وغیرہ سبھی علوم شامل ہیں۔

علوم عمرانی وہ بنیادی سرچشمے ہیں جن سے معاشرتی علوم کا مضمون اپنی غذا اور علمی مواد حاصل کرتا ہے۔ ان علوم کا علمی و تحقیقی درجہ خاصا بلند ہوتا ہے اور ان میں انسانی تعلقات کا بڑا منظم و محققانہ مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ رنگا رنگ تفاصیل اور گہرے افکار و نظریات کے حامل ہوتے ہیں۔ بالعموم ان کے مخاطب طلبہ کی بجائے بالغ افراد ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ علوم کا مواد لازمی طور پر فنی اور مشکل پسندانہ ہو اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ یہ ہر حالت میں دلچسپ ہوں۔ ان کا حقیقی امتیاز ان کا اونچا علمی مرتبہ اور اعلیٰ تحقیقی معیار ہے اور بس۔ نیز یہ علم سماج کے مفاد اور سماجی طرز عمل سے ہی واسطہ رکھتے ہیں۔

عمرانی علوم اور معاشرتی علوم کا بنیادی فرق علمی معیار اور مقاصد ہیں۔ جن کے حوالہ سے ان کی تنظیم و تربیت کی جاتی ہے۔ اول الذکر کا مواد محققانہ اور انداز بیاں فاضلانہ ہوتا ہے، جب کہ موخرالذکر کا مواد سادہ اور منتخب اور انداز بیان عام فہم ہوتا ہے۔ ایک کا معیار اعلیٰ دوسرے کا

کمتر ہے۔ عمرانی علوم کے قاری سکالر اور پختہ کار افراد ہیں جب کہ معاشرتی علوم ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے طلبا کو مخاطب کرتا ہے۔ علمی تحقیق و جستجو اور سادہ معاشرتی تفہیم دونوں کے بالترتیب مقاصد خاص ہیں۔

معاشرتی علوم کی اہمیت

معاشرتی علوم کی افادیت و اہمیت ہر نظام تعلیم نے تسلیم کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ابتدائی اور ثانوی جماعتوں میں ہر جگہ بطور لازمی مضمون داخل نصاب ہے۔

۱۔ معاشرتی فہم :

معاشرتی علوم عمرانی علوم کا سادہ خلاصہ پیش کر کے طلبہ کے علم و اطلاع اور معاشرتی فہم میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ اس طرح طلبہ انسانی تعلقات کی نوعیت ، وسعت اور افادیت کو آسانی سے سمجھ جاتے ہیں۔

۲۔ معاشرتی مسائل کا احساس :

ہر اچھے شہری کی طرح طلبہ کو بھی معاشرتی مسائل کا پورا احساس ہونا چاہیے۔ احساس ہی نہیں بلکہ ان معاشرتی مسائل سے پوری واقفیت بھی ضروری ہے جو معاشرتی علوم کی تدریس کے طفیل حاصل ہو جاتی ہے۔ غربت، ناخواندگی ، بد اخلاق ، بد نظمی ، رشوت ، مہنگائی ، بد دیانتی اور استحصال ہمارے اہم معاشرتی مسائل ہیں جن کا فہم و احساس انتہائی ضروری ہے۔

۳۔ فرض شناسی کا احساس :

شہری حقوق کے ساتھ ساتھ شہری فرائض کا علم و احساس بھی ضروری ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پہلے فرض ہے اور پھر حق۔ کیونکہ حق تو اجرت اور مزدوری ہے۔ مگر انسان فرائض کی بجا آوری سے بھاگتا ہے معاشرتی علوم کی تعلیم سے فرائض کی ضرورت اور برتری واضح ہو جاتی ہے اور فرض شناسی کا جذبہ بیدار کیا جا سکتا ہے۔ ایک استاد کا اولین فرض ہے کہ اپنا مضمون خوب تیار کر کے آئے اور دیانتداری سے پڑھائے۔ قیامت کے دن معلم خدا کے سامنے جوابدہ ہوگا۔

۴۔ ثقافتی ورثہ کا تحفظ و ترسیل :

ثقافتی ورثے کی حفاظت اور اس کو نوجوان نسلوں تک منتقل کرنا بلکہ اس کو مزید نشو و نما دینا تعلیم کا اعلیٰ نصب العین ہے جو معاشرتی علوم کے ذریعہ تکمیل پاتا ہے۔ دینی تعلیمات ، قومی تاریخ کے درخشندہ واقعات ، قومی مشاہیر کے حالات ، علمی و ادبی کارنامے ، تہذیبی شعار ، فنی کمالات یہ سب ثقافتی ورثہ کے طبعی عناصر ہیں جن کا تحفظ و ترسیل ہر قوم کے لیے ضروری ہے۔

۵۔ حالات و رجحانات سے آگاہی :

ملکی و غیر ملکی حالات و رجحانات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ چیز قومی و بین الاقوامی

مفادات و مصالح کو سمجھنے اور مستقبل کے رخ کی نشاندہی اور متعین کرنے کے لیے ضروری ہے۔ پھر اس قسم کی واقفیت ذاتی تسکین اور مسرت کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ مثلاً تیسری دنیا کے حالات ابھرتی ہوئی اسلامی تحریکوں اور جدید سیاسی، معاشی اور معاشرتی رجحانات سے آج کل کون بے نیاز رہ سکتا ہے۔

٦- فکر اور قوت فیصلہ کی صلاحیت :

مسائل، متنازع امور، افکار و رجحانات اور اقدار و روایات کے تجزیہ و محاکمہ اور تعبیر و وضاحت کے توسط سے قوت فکر و فیصلہ کی خاصی تربیت ہو سکتی ہے۔ جب طلبہ تنقیدی اور تخلیقی فکر سے کام لیں گے ان کی فکری صلاحیتیں چمک اٹھیں گی۔ صحیح فیصلے کی قوت پیدا کرنا تعلیم کا فریضہ ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خان نے اسے شخصیت کا اہم جز قرار دیا ہے۔ ہمارے طلبہ کا یہ حال ہے کہ اپنے مضامین کے انتخاب تک کا فیصلہ اعلیٰ منازل تک بھی خود نہیں کر پاتے اور دوستوں کی دیکھا دیکھی اندھے بہرے ہو کر مضامین پر گر پڑتے ہیں اور بعد میں زندگی بھر پچھتاتے رہتے ہیں۔

٧- انسانی تعلقات کی تفہیم :

معاشرتی علوم کی تدریس سے فرد اور قوم، مختلف نسلی اور تہذیبی گروہوں اور قوموں کے ایک دوسرے کے ساتھ انسانی تعلقات کی نوعیت اور ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔ اس سے وسیع تر تعاون اور باہمی انحصار کی راہیں کھل سکتی ہیں۔ عملی مشاغل کے ذریعہ انسانی تعلقات کی نشو و نما بھی کی جا سکتی ہے۔

٨- علمی و انسانی وحدت :

آج کل علمی وحدت اور عالمی برادری کے ایک دوسرے کے قریب تر آنے کا رجحان برابر بڑھ رہا ہے۔ علوم تقسیم در تقسیم ہوتے چلے گئے اور حقیقت ان میں بٹ کر پارہ پارہ ہوگئی۔ یہی حال انسانی معاشروں کا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف مختلف محاذوں پر جنگ آزما ہوتے رہتے ہیں۔ اب شدت سے احساس پایا جاتا ہے کہ علوم و فنون اور سب انسان مل جل کر اپنے مسائل حل کریں۔ معاشرتی علوم اپنی ذاتی مثال پیش کر کے علمی وحدت کا راستہ ہموار کر دیتا ہے اور وحدت انسانی کا راز بھی عیاں کر دیتا ہے :

معاشرتی علوم کے معلم کے اوصاف

ہر مضمون کی تدریس اس مضمون کے معلم سے کچھ مخصوص تقاضے اور مطالبات رکھتی ہے۔ معاشرتی علوم کے معلم میں درج ذیل اوصاف کا پایا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

١- مضمون پر عبور :

معاشرتی علوم بظاہر ایک مضمون ہے مگر اس میں کئی علوم آکر یکجا اور اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اس سے اس مضمون کے معلم کی ذمہ داریاں کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہیں، اس لیے معاشرتی علوم میں شامل

علوم کی روح اور اس کے مرکزی افکار سے واقفیت عین ضروری ہے۔ نیز اس مضمون کے متعلقہ عنوانات کی ضروری اور دلچسپ تفاصیل سے بھی معلم آگاہ ہو۔ صرف اس طرح حق تدریس ادا کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال معلم معاشرتی علوم اس مضمون کی نوعیت اور وسعت کے لحاظ سے وسیع معلومات، مہارتوں اور انداز فکر و نظر کا حامل ہو تاکہ مقاصد تدریس کو احسن طور پر حاصل کیا جا سکے۔ جب تک مضمون کے مواد اور انداز فکر و جستجو پر کامل دسترس حاصل نہ ہوگی معاشرتی علوم کی موثر تدریس نہ ہو سکے گی۔

بالعموم سکولوں میں اساتذہ معاشرتی علوم کے مضمون کو پڑھانے کی بجائے محض اسے بھگتاتے رہتے ہیں۔ ان کا اسی درسی کتاب پر گزارہ ہوتا ہے جو خود طلبہ پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے خود استاد کی درسی کتاب کون سی ہے؟ لہذا ضروری ہے کہ اساتذہ درسی کتاب کے علاوہ دیگر کتب رسالے اور اخبارات بھی پڑھا کریں تاکہ درسی کتاب کے عنوانات کو دلچسپ اور معلومات انگیز تشریحات سے واضح کر سکیں۔ یہی بات خصوصی مہارتوں مثلاً نقشے اور گراف بنانا اور سمجھانا، ماڈل تیار کرانا، گلوب گھمانا، علم و اطلاع کی تلخیص اور جمع و ترتیب، گروہی منصوبوں کی تیاری و رہنمائی اور مقامی وسائل کی نشاندہی اور استعمال وغیرہ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ یہ سب امور مضمون پر عبور کے تحت ہی شمار ہوتے ہیں۔

۲۔ مقاصد تدریس سے کامل آگاہی:

معاشرتی علوم کی معلومات و مہارتیں بجائے خود مقصود نہیں۔ جن مقاصد کے پیش نظر یہ مضمون داخل نصاب کیا گیا ہے ان مقاصد کا پورا پورا علم ہونا چاہیے اور دوران تدریس انہی کے حصول کی سرتوڑ کوشش کی جائے۔ اور سبھی اقسام مقاصد علمی و فکری عملی و مہارتی اور جذباتی و تحسینی کے ساتھ انفرادی و گروہی اور قومی و عالمی مقاصد کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ نیز فنی نقطۂ نظر سے معلم عمومی مقاصد کو مفوضہ جماعت کے حوالہ سے خصوصی مقاصد اور ان کی مخصوص زبان میں منتقل بھی کر سکے۔ اس طرح وہ مقاصد تدریس کی نوعیت اور حدود کار سے صحیح طور پر واقف ہو سکتا ہے۔ عمومی مقاصد کا ابہام صرف اس طرح ہی دور ہو سکتا ہے۔

۳۔ طریق ہائے تدریس سے واقفیت:

معلم معاشرتی علوم کے قدیم و جدید طریقوں سے واقف ہو اور انہیں اچھی طرح سمجھتا اور موقعہ و محل کے مطابق استعمال کرنا بھی جانتا ہو۔ موضوع کی نوعیت اور مقاصد تدریس کی رعایت سے بعض اوقات کئی طریقے اکٹھے لانے پڑتے ہیں اور بعض اوقات صرف ایک ہی طریقے سے کام چلانا پڑتا ہے۔ استاد اس قدر علم رکھتا ہو کہ وہ جان سکے کہ کس موقعہ پر کن مقاصد کے لیے کس یا کن طریقوں کو کام میں لانا ہوگا اور انہیں کس طرح کام میں لایا جائے گا۔ قدیم و جدید طریقہ ہائے تدریس

کے اپنے اپنے فوائد ہیں اور ہر ایک کا اپنا موقعہ و محل ہے ۔ مقاصد اور حالات کے لحاظ سے جو طریقہ موزوں نظر آئے اسے بے دریغ استعمال کرنا چاہیے ۔ معلم کو قدیم و جدید دونوں طریقوں کی اندھی تقلید سے پرہیز لازم ہے ۔

۴۔ معلم بطور مثال :

معلم معاشرتی علومؔ اپنے مضمون کا چلتا پھرتا نمونہ نظر آئے ۔ وہ ان انداز، اعمال اور رویوں کا مظہر ہو جن کی دوران تدریس تبلیغ و اشاعت کرتا رہتا ہے ۔ وہ علم دوست ، محب وطن اور وسیع النظر انسان ہو ۔ طلبہ و اساتذہ سے اچھے انسانی تعلقات رکھتا ہو ۔ بھلائی کے کاموں میں عملی شرکت کرے ۔ اخبارات اور رسالوں سے مضامین کے تراشے اکٹھے کرکے طلبہ کو عملی نمونہ فراہم کرے ۔ حالات حاضرہ اور قومی مسائل سے خوب آگاہ ہو اور مناسب موقعہ پر مناسب انداز میں ان پر اظہار خیال کرے ۔ غرض اپنے مضمون کی جیتی جاگتی تصویر نظر آئے ۔ اسلام میں قول و فعل کے تضاد کی قطعاً گنجائش نہیں بلکہ اس کی سخت مذمت کی گئی ہے ۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے اے ایمان والو ! تم ان چیزوں کا پرچار کیوں کرتے ہو جن پر تم خود عمل پیرا نہیں ہوتے ۔ اللہ کو اس بات پر بے حد غصہ آتا ہے کہ تم ان باتوں کی تلقین کرو جن پر تم خود عمل نہیں کرتے ۔ (سورۃ الصف آیت : ۳۔۲)

۵۔ ماخذوں کا علم و استفادہ :

عمرانی اور انسانیاتی علوم ہی معاشرتی علوم کا منبع و سرچشمہ ہیں ۔ معلم کی ان اصل ماخذوں سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضروری ہے ۔ وہ ان ماخذی علوم سے حسب ضرورت ضرور استفادہ کر سکے ۔ ان کے متعلق بنیادی معلومات رکھتا ہو ۔ یہ نہ ہو کہ وہ نہ اقتصادیات کا مفہوم سمجھے اور نہ معاشریات کے مرکزی نقطہ سے باخبر ہو ۔ اسی طرح تمدن ، تہذیب و ثقافت اور اخلاق و سیاست کے مفہوم و مدعا اور ان کے آپس کے رشتوں کا علم بھی رکھتا ہو ۔ ہماری مراد یہ نہیں کہ استاد ان علوم میں مہارت حاصل کرے بلکہ مقصود صرف اتنا ہے کہ وہ ان علوم کے مفہوم و مدعا اور ان کے متعلقہ تصورات سے بقدر ضرورت واقفیت رکھتا ہو اور ذرائع حصول کی نشاندہی کر سکے ۔ گویا ماخذی علوم اور ان کے منبع و مصدر دونوں کا علم رکھنا ضروری ہے ۔

۶۔ طلبہ کی ذہنی استعداد اور انداز تدریس :

طلبہ کی ذہنی استعداد کے مطابق انداز تدریس اپنایا جائے ۔ سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی جائے ۔ رفتار بیان مناسب ہو ۔ مثالوں اور واقعات کے ذریعے مشکل مقامات کی تشریح کی جائے ۔ مجرد حقائق کے بیان سے طلبہ جلد اکتا جاتے ہیں ۔ مشاہدہ اور عملی سرگرمیوں کے ذریعہ تدریس بامعنی اور دلچسپ بنائی جائے ۔ خشک گھسے پٹے میکانکی انداز تدریس سے پرہیز کیا جائے ۔ پھر انفرادی اور گروہی ضرورتوں کا بھی خیال رکھا جائے ۔ غرض کہ مطلوبہ تصورات کو اس طرح پیش کیا جائے کہ طلبہ انہیں اچھی طرح سمجھ جائیں اور مجوزہ مہارتوں کا کامیابی سے مظاہرہ کر سکیں ۔

سوالات

۱- معاشرتی علوم کی تعریف و تشریح کیجیے۔

۲- معاشرتی علوم اور عمرانی علوم کا ربط و تعلق اور فرق و امتیاز واضح کیجیے۔

۳- معاشرتی علوم کی وسعت پر نوٹ لکھیے۔

۴- معاشرتی علوم کی چند توضیحات پیش کیجیے۔

۵- "معاشرتی علوم کی تدریس کے لیے مربوط انداز موزوں ہے" اس پر تبصرہ کیجیے۔

۶- معاشرتی علوم کی روشنی میں صوبوں اور ملک کا تعلق واضح کیجیے۔

۷- "سماج سے ہٹ کر فرد کی ذات ثابت ہی نہیں ہو سکتی" ایمیل ڈرخائیم کے اس قول پر اپنی آزادانہ رائے دیجیے۔

۸- معاشرتی علوم کی تعلیم کیوں ضروری ہے؟ وضاحت کیجیے۔

۹- معاشرتی علوم کی تدریس کے باوجود ہمیں وہ فوائد کیوں حاصل نہیں ہوتے جو اصولاً ہونے چاہییں؟ تبصرہ کیجیے۔

۱۰- معاشرتی علوم کے معلم کے تین اہم ترین اوصاف اپنے تعلیمی زمانے کے تجربات کی روشنی میں بیان کیجیے۔

دوسرا باب

مقاصد تدریس معاشرتی علوم

اہمیت :

کسی مضمون کے مقاصد تدریس اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ معلم کو کیا کچھ کرنا ہے۔ کون سی معلومات فراہم کرنی ہیں، کیا اقدار اور رویے پیدا کرنے ہیں اور کس قسم کا انداز فکر طلبہ میں پیدا کرنا ہے، اس لیے معلم کے لیے اپنے مضمون کے مقاصد کا جاننا از بس ضروری ہے۔ یہ روشنی کے وہ قمقمے ہیں جو اس کے مضمون کی راہوں کو روشن کر دیتے ہیں۔ ان کے بغیر استاد کا قدم بڑھانا تاریکیوں میں چلنے کے مترادف ہوگا۔ معاشرتی علوم کے استاد پر واجب ہے کہ کمرہ جماعت میں داخل ہونے سے پہلے خوب سمجھ لے کہ وہ کن مقاصد کی تحصیل کے لیے طلبہ سے مخاطب ہونے لگا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو تدریسی عمل میں معلم کے بھٹک جانے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

معاشرتی علوم کے ایک ہی قسم کے سواد کو مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اب اس بات کا تعین مقصد کرے گا کہ اسے کس طرح استعمال میں لایا جائے۔ قومی ورثے کا تحفظ و ترسیل، مسائل کا تجزیہ، بین الاقوامی شعور، حب الوطنی، احترام انسانیت، تخلیقی فکر کی پرورش، کامیاب زندگی اور ماحول کی تفہیم غرض کہ کئی مختلف مقاصد ہیں جن کے لیے مختلف انداز عمل کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ سب باتیں مقاصد تدریس کی اہمیت کو اجاگر کر دیتی ہیں۔

چھٹی سے آٹھویں جماعت تک معاشرتی علوم کی تدریس کے درج ذیل عمومی مقاصد متعین کیے گئے ہیں:

۱- نظریۂ پاکستان کے تحفظ، فروغ اور عمل درآمد کو یقینی بنانا اور اسے انفرادی اور قومی زندگی کا ضابطہ بنانا۔

۲- تعلیم کے شعوری عمل کے ذریعے معاشرتی اور ثقافتی ہم آہنگی کو جو ہمارے بنیادی نظریے سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہو ترقی دے کر قومی یک جہتی قائم کرنا۔

۳- فعال اور تخلیقی فرد کی مکمل شخصیت کا نشو و استحکام کرنا، ایک ایسا فرد تیار کرنا جو معروضی مطالعہ سے حاصل شدہ حقیقت کا سامنا کر سکے۔ فنی اور معاشرتی تبدیلی کی نوعیت کو سمجھ سکے

ور معاشرتی اصلاح کے لیے گہری تشویش رکھتا ہو۔

۴- سماجی خدمت اور ماحول کی اصلاح کے پروگراموں کے ذریعہ عظمت محنت راسخ کر کے نوجوانوں کو قائدانہ کردار ادا کرنے کے لیے راغب کرنا۔

جس زبان میں مقاصد کو بیان کیا جائے وہ دو قسم کی ہے: ایک مبہم اور عام دوسری واضح اور خاص۔ اسی نسبت سے مقاصد کی دو واضح اقسام ہیں: عمومی مقاصد ہیں اور کرداری مقاصد جو بالترتیب اول الذکر اور موخر الذکر بیان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عمومی مقاصد کی زبان ڈھیلی ڈھالی اور مبہم سی ہوتی ہے جس سے مخصوص افکار اور سرگرمیوں کی واضح نشاندہی نہیں ہوتی جب کہ کرداری مقاصد کی زبان واضح اور متعین ہوتی ہے اور صاف پتہ چل جاتا ہے کہ اگر یہ مقاصد حاصل ہوگئے تو طلبہ کیا کچھ علم و اطلاع رکھتے ہوں گے۔کن مخصوص رویوں کا اظہار کریں گے اور کیا کچھ کرنے کے قابل ہوں گے۔ اس لیے کرداری مقاصد وضاحت کے لیے تین ذیلی اقسام فکری، (Cognitive) حسی (Affective) اور حرکی (Psycho-Motor) میں تقسیم کر دیے جاتے ہیں۔ نیشنل بیورو نصاب اور درسی کتب نے اس میں ثقافتی، سماجی، انفرادی اور بین الاقوامی پہلوؤں کا اور اضافہ کر دیا ہے۔ کرداری انداز میں مقاصد کی تقسیم بندی حسب ذیل ہے:

مقاصد کی تقسیم بندی کرداری انداز میں

علمی	حسی	حرکی
(الف) ثقافتی		
۱- پاکستان کی آزادی اور قیام کی جدوجہد کا علم۔	۱- قانون کے احترام اور مذہبی اخلاق اور معاشرتی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا رویہ رکھنا۔	۱- اسلامی اقدار کو ترقی دینے میں سرگرمی دکھانا۔
۲- انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے اسلامی ضابطہ حیات کا علم۔	۲- تحریک پاکستان کی تحسین کرنا۔	۲- افکار و بیانات کی تنظیم میں مہارت دکھانا۔
۳- نظریہ پاکستان کا علم۔	۳- ثقافتی ورثہ پر فخر کرنا۔	۳- مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت۔
۴- قومی رہنماؤں کے کارناموں کا علم۔	۴- قابل اعتماد ذرائع علم و اطلاع کی تحسین۔	۴- انفرای اور قومی ملکیت کی حفاظت کرنا۔

علمی	حسی	حرکی
(ب) سماجی		
۱- قیام پاکستان کے بعد کارناموں کا علم ۔	۱- ایجادات اور دریافتوں کے فوائد کی قدر کرنا ۔	۱- اتحاد بقائے باہمی اور انسانی روابط قائم کر سکنے کی مہارت رکھنا ۔
۲- قومی وسائل، ضرورتوں اور منصوبوں کا علم ۔	۲- اسلام کے بنیادی اصولوں کے لیے محبت و احترام ۔	۲- معلومات کی تلاش و جستجو تنظیم و تعبیر اور ان کو پیش کرنے اور پیش گوئی کرنے کی قابلیت رکھنا ۔
۳- قومی ماحول اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات کا علم ۔	۳- نظریۂ پاکستان پر کامل یقین رکھنا ۔	۳- تجربات اور منصوبوں میں شرکت کرنا ۔
۴- مقامی علاقے کے معاونین اور بہبود معاشرہ میں ان کا جو حصہ ہے اس کا علم رکھنا ۔	۴- پاکستان کی عظمت و ترقی کے لیے پختہ عزم رکھنا ۔	۴- قومی یک جہتی کی سرگرمیوں میں شرکت کرنا ۔
۵- بطور فرد معاشرہ اپنے حقوق و فرائض اور ذمہ داریوں کو سمجھنا ۔	۵- قدرتی وسائل کی قدر کرنا ۔	۵- قومی وسائل کا پتہ لگانے اور ان سے استفادہ کرنے کے لیے سرگرمیوں میں شرکت کرنا ۔
۶- مقامی،قومی اور بین الاقوامی سطح پر ذاتی ، معاشرتی ، اقتصادی اور سیاسی مسائل کا علم رکھنا ۔	۶- تعاون کے لیے تیار رہنا ۔	۶- نقشے ، گراف ، چارٹ اور دیگر اشیا کو استعمال کرنے کی قابلیت رکھنا ۔
۷- شہری زندگی کی تیاری کے لیے پسندیدہ انسانی روابط کا علم رکھنا ۔	۷- قومی اور بین الاقوامی برادری کے ایک دوسرے پر انحصار رکھنے کی تحسین کر سکنا ۔	

علمی	حسی	حرکی
(ج) انفرادی		
۱- فرد کی بنیادی ، حیاتیاتی ، نفسیاتی ضرورت کا فہم رکھنا ۔	۱- عظمت و توقیر اور محنت کا احساس ۔	۱- اپنی اور دوسروں کی بنیادی، حیاتیاتی، نفسیاتی اور معاشرتی ضرورتوں کا مشاہدہ اور اندراج کرنا ۔
۲- بطور فرد معاشرہ فرد کے فرائض اور ذمہ داریوں کا علم رکھنا ۔	۲- انفرادی اختلافات کا احترام کرنا ۔	۲- گروہی سرگرمیوں میں حصہ لینا ۔
۳- علم و اطلاع اور اعداد و شمار حاصل کرنے والے ذرائع کا علم رکھنا ۔	۳- فرد کی ذاتی مجبوریوں کو قبول کر لینا ۔	۳- قائدانہ کردار ادا کرنا ۔
	۴- اسلامی اقدار کی تحسین کرنا ۔	۴- معاشرتی ماحول سے مطابقت کرنا ۔
	۵- وقت کی قدر کے احساس رکھنا ۔	۵- مسائل اور مشکلات پر قابو پانے کی قابلیت دکھانا ۔

علمی	حسی	حرکی
د بین الاقوامی		
۱- دوسرے ممالک میں طرز زندگی کا تقابلی علم رکھنا ۔	۱- دیگر ممالک کے لوگوں کی طرز زندگی کی تحسین کرنا ۔	۱- دوسرے صوبوں اور ممالک کے لوگوں سے ملنا جلنا ۔
۲- اقوام عالم کے باہمی انحصار کی اہمیت جاننا ۔	۲- انسانیت کے لیے محبت بھرے جذبات پیدا کرنا ۔	۲- بین الاقوامی دن منانا ۔
۳- عالمی تنظیموں کا علم رکھنا ۔		
۴- طبیعی دنیا کے متعلق معلومات رکھنا ۔		
۵- پاکستان کی دیگر ممالک کے ساتھ تجارت کا علم رکھنا ۔		

تدریسی طریقے مفہوم، توجیہہ اور مسئلہ انتخاب

تربیتی ادارے بالعموم طریقہ ہائے تدریس کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں، مگر نئے رجحانات کے تحت اب ان اداروں میں نفس مضمون پر بھی زور دیا جانے لگا ہے۔ یہ اقدام مبارک ہے۔ اچھا ہوا کہ مواد اور طریق تدریس کی باہمی جنگ کسی حد تک ختم ہوگئی۔

عام طور پر مواد اور طریقہ تدریس کو ایک دوسرے کا مدمقابل سمجھا جاتا ہے۔ عام تعلیمی ادارے اول الذکر اور تربیتی ادارے مؤخر الذکر کی وکالت کرتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ تو طریقہ تدریس کو قطعاً ضروری نہیں سمجھتے۔ وہ صرف نفس مضمون کو ہی ضروری سمجھتے ہیں۔ گویا سب کچھ مواد ہے اور طریق کار معلم کو ازخود آ جاتا ہے۔ جس کے لیے کسی منظم اور باقاعدہ تربیت کی کوئی ضرورت نہیں مگر یہ ایک زبردست مغالطہ ہے۔ حق یہ ہے کہ مواد اور طریق تدریس دونوں اہم اور لازم و ملزوم ہیں۔ مواد کے بغیر طریقہ تدریس بالکل خالی پیٹ اور طریقہ تدریس کے بغیر مواد نابینا ہے۔ یہ دونوں صورتیں ناپسندیدہ ہیں۔ درحقیقت دونوں ساتھی اور ایک دوسرے کے ازلی دوست ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی تکمیل اور رہنمائی کرتے ہیں۔ لہذا جان ڈیوی کی اس بات میں بڑا وزن ہے کہ مواد اور طریق تدریس ایک دوسرے پر برابر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے مکمل طور پر علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

زبان کی تدریس کا تقاضا ہے کہ بچے کی زبان چلے اور فر فر چلے۔ تاریخی واقعہ چاہتا ہے کہ اسے بیان کیا جائے۔ معاشرتی مسئلہ تقاضا کرتا ہے کہ اس پر بحث کی جائے۔ فنون کا تقاضا ہے کہ علمی کام کی طرف قدم اٹھایا جائے۔ گویا ہر مضمون کا مواد اپنے مزاج کے مطابق طریق تدریس کا خود بھی کسی حد تک مطالبہ کر دیتا ہے۔ یہ ہے مواد کے طریق تدریس سے فطری رشتہ کی بات۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک ہی مضمون کے مواد کو مختلف طریقوں سے نبھایا جا سکتا ہے۔ تاریخی مواد کو پیش کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ جغرافیہ و شہریت اور معاشیات و معاشریات کا بھی یہی حال ہے۔ مگر ایک ہی مضمون کے مختلف طریقوں میں سے کس طریقے کو اپنایا جائے اور کیوں؟ یہ بڑی نہایت اہم سوال ہے۔ طریق تدریس کے انتخاب پر بہت سے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں جن میں مضمون اور نوعیت، موضوع، مقاصد تعلیم و تدریس، طلبہ کی عمر، صلاحیت اور درجہ تعلیم، تدریسی معاونات کی دستیابی، معلم کی پیشہ ورانہ مہارت اور ذاتی استعداد اور مقدار وقت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ معاشرتی علوم کے معلم کو یہ سب باتیں پیش نظر رکھ کر انتخاب کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ محض اندھا دھند تقلید یا فیشن کے طور پر کسی طریق تدریس کو اختیار کرنا بالکل نامناسب بات ہے۔

معاشرتی علوم کی تدریس کے بہت سارے طریقے ہیں اور ہر طریقہ و تدریس مخصوص مقاصد کو ہی حاصل کر سکتا ہے۔ ہر قسم کے مواد کے لیے ایک اہم طریقہ قطعاً نامناسب ہے اور نہ ہی یہ مناسب

ہے کہ قدیم اور جدید طریقوں کے درمیان دیوار کھڑی کر دی جائے اور صرف جدید طریقوں کو ہی مفید اور لائق توجہ سمجھا جائے - پھر ایک ہی سبق کے دوران بھی ایک سے زائد طریقوں کو استعمال کیا جا سکتا ہے - پھر استاد کو حق ہے کہ مختلف طریقوں میں حسب ضروریات تبدیلیاں پیدا کرے - طریق کار میں ترمیمات کرنا ہر معلم کا پیشہ ورانہ حق ہے اور اس میں شرمانے یا مرعوب ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں - صرف اس طرح ہی پاکستانی معلم نئے نئے طریقے وضع اور تخلیق کر سکتا ہے - ہمیں اپنے اوپر اعتماد کر کے اس اہم اقدام کی بسم اللہ کرنی چاہیے - مشاہدہ بتلاتا ہے کہ کچھ اساتذہ دوران تدریس ضرور نئے اور زیادہ مؤثر انداز معلوم کر لیتے ہیں اور انہیں آزماتے بھی رہتے ہیں - البتہ کتابوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا اس لیے کہ وہ لکھتے کم ہیں اور ان کی مناسب حوصلہ افزائی بھی نہیں کی جاتی - یہ دونوں باتیں بے حد افسوس ناک ہیں - بہرحال تدریسی طریقوں کو سمجھ بوجھ سے اختیار کرنا نہایت ضروری ہے -

طریقہ تدریس :

یہ وہ مجموعی ، منظم اور مربوط انداز ہے جس کے ذریعہ معلم طلبہ کے ساتھ علمی و نفسی اور جذباتی و روحانی مشارکت کرتا ہے - یہ دو چیزوں تدریسی حکمت عملی اور تدریسی چالوں (Tactics) پر مشتمل ہوتا ہے ، اگرچہ بالعموم اسے تدریسی حکمت عملی (Strategy) سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے - بعض ماہرین اسے صرف واسطہ اور ذریعہ ہی سمجھتے ہیں اور بعض ذریعہ کے ساتھ ساتھ اسے بطور مقصد بھی لے لیتے ہیں جیسا کہ انکوائری اپروچ کے دلدادہ حضرات یعنی شیدان فکر و جستجو کا خیال ہے -

تدریسی حکمت عملی تدریس کی مجموعی اپروچ ہوتی ہے جسے استاد کام میں لا کر طلبہ کے انداز فکر و عمل اور ان کی مجموعی کوششوں کو رخ عطا کرتا ہے - یہ ایک منظم ، منطقی اور شعوری کاوش ہے جو جملہ تدریسی سرگرمیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے - یہ ایسا کل ہے جس کے کئی اجزا اور حصے ہوتے ہیں - یہ کچھ زنجیر نما اقدامات پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کے پیچھے کوئی مخصوص تعلیمی فکر یا نقطہ نظر بھی کام کر رہا ہوتا ہے - دراصل ،مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لیے مختلف تدریسی تکنیکوں کو ایک مخصوص انداز میں استعمال کرتے وقت ہم کسی مخصوص تدریسی حکمت عملی سے کام لے رہے ہوتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح ایک جرنیل میدان جنگ جیتنے کے لیے جنگی حکمت عملی سے کام لیتا ہے -

ایک جرنیل میدان جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لیے مختلف چالیں چلتا ہے کبھی فوجوں کو آگے بڑھا دیتا ہے ، کبھی پیچھے ہٹا لیتا ہے ، کبھی پہلو سے دشمن پر وار کرتا ہے ، کبھی سامنے سے طوفانی حملہ کر دیتا ہے اور کبھی شب خون مارتا ہے - یہ سب کچھ وہ ایک سوچی سمجھی ہوئی جنگی سکیم کی روشنی میں کرتا رہتا ہے - یہ مجموعی جنگی سکیم اس کی جنگی حکمت عملی اور اس کے مختلف

جزوی اقدامات اس کی جنگی چالیں شمار ہوتی ہیں ۔ معلم بھی دوران تدریس یہی کچھ کرتا رہتا ہے ۔ وہ بھی ایک مجموعی تدریسی سکیم وضع کرتا ہے جسے اس کی تدریسی حکمت عملی کہا جا سکتا ہے ۔ اس حکمت عملی کی روشنی میں مختلف تدریسی چالیں چلتا ہے جنہیں عرف عام میں تدریسی تکنیکیں (Techniques) کہتے ہیں اور یہ مختلف اور رنگ برنگی ہوتی ہیں ۔ سوال و جواب ، بیان و وضاحت ، تلخیص و تفصیل ، تجزیہ و تنقید ، استخراج و استقرا ، مقابلہ و موازنہ ، جائزہ و محاکمہ ، تکرار و اعادہ اور تعارف و استنتاج (Inference) مختلف تدریسی تکنیکیں ہیں جنہیں معلمین موقع و محل کے مطابق استعمال کرتے رہتے ہیں ۔ فلم ، فلم سٹرپ ، ٹیلی ویژن ، تدریسی مشین ، تعلیمی سیر ہوی ان میں شامل ہیں ۔ کوئی معلم کس موقع پر کس تکنیک یا تکنیکوں کے مجموعے کو کام میں لاتا ہے اور اس کی مختلف تکنیکیں کس ترتیب سے دوران تدریس نمودار ہوتی اور بڑھتی گھٹتی آگے پیچھے ہوتی رہتی ہیں ۔ یہ سب نہایت اہم باتیں اور نازک فیصلے ہیں جن پر تدریس کی کامیابی یا ناکامی کا دار و مدار ہوتا ہے ۔

ہر معلم کی اپنی اپنی تدریسی حکمت عملی ہوتی ہے جس سے اس کی تدریس جانی پہچانی جاتی ہے ۔ مثلاً ابن خلدون کی تدریسی حکمت عملی یہ ہے کہ سب سے پہلے سبق کا سرسری سا جائزہ پیش کر دیا جائے تاکہ طلبہ کو معلوم ہو جائے کہ کیا کچھ پیش آنے والا ہے ۔ پھر تمام اہم نکات پر تفصیلی بحث کی جائے اور آخر میں تنقیدی جائزہ لیا جائے کہ طلبہ کس حد تک سبقی باتوں کو سمجھ پائے اور کن کن باتوں میں اب تک ابہام کا شکار ہیں تاکہ معلم ان کی مشکلات رفع کر سکے ۔ یہ تمام سلسلہ واری اقدامات مل جل کر اس خاص ترتیب میں ابن خلدون کی تدریسی حکمت عملی اور علیحدہ علیحدہ تدریسی تکنیکیں کہلائیں گے ۔ اب جن مقاصد اور نقطۂ نظر کے پیش نظر ابن خلدون نے یہ طریق کار تجویز کیا ہے ۔ ظاہر ہے وہ بھی طریق تدریس کا حصہ شمار ہوں گے ۔ گویا طریقہ تدریس مخصوص نقطۂ نظر، حکمت عملی اور تدریسی تکنیکوں کا جامع و مظہر ہوتا ہے ۔

حاصل کلام یہ کہ طریقہ تدریس ایک وسیع تر اور جامع شے ہے جو مختلف تدریسی تکنیکوں کے ربط و اتصال سے معرض وجود میں آتا ہے اور اس کے پیچھے ایک خاص تعلیمی نقطۂ نظر ہوتا ہے ۔ تدریسی تکنیکوں کو ایک خاص ترتیب میں لایا جاتا ہے ۔ اس طرح ان کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے جو ایک خاص رخ کی نشاندھی کرنے لگتا ہے ۔ طلبہ و اساتذہ اس رخ پر چلنا شروع کر دیتے ہیں حتیٰ کہ وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں ۔ رہا یہ سوال کہ یہ منزل مقصود کیا ہے اور کس نقطۂ نظر کی روشنی میں یہ سارا سفر طے ہوا ہے تو اس کی درجنوں تعبیریں اور توضیحات ہو سکتی ہیں اور ہر طریقہ تدریس اپنا خاص نقطۂ نظر اور اپنے مخصوص مقاصد رکھتا ہے ۔ اب چاہے مقصد زیادہ معلومات بہم پہنچانا ، طلبہ کو بحث مباحثہ میں شریک کرنا یا ان کو جز قدمی انداز (منضبط تدریس) سے آگے بڑھانا ہو ، مؤثر حکمت عملی کے لیے ضروری ہے کہ خیال افروز اور لچکدار ہو اور اپنا واضح رخ متعین

کرکے ترقی پسندانہ انداز میں آگے بڑھے حتیٰ کہ قلیل وقت میں زیادہ سے زیادہ مقاصد بطریق احسن حاصل کر لے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ تدریسی طریقے مختلف اور رنگ برنگے ہیں۔ ہر طریقہ تدریس کسی خاص مقصد کو حاصل کرنے میں مفید ہو سکتا ہے۔ اس لیے کوئی طریقہ تدریس برا نہیں۔ اس کا برا یا اچھا استعمال ہی اسے برا یا اچھا بنا دیتا ہے۔ کسی طریقے کے انتخاب میں متعدد امور مدنظر رہنے چاہییں۔ اندھی تقلید اور فیشن پرستی سے احتراز کرنا چاہیے۔ نیز مواد اور طریقہ لازم و ملزوم ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ طریقے کا انتخاب مضمون کے مواد کی توسیع بھی کر سکتا ہے اور تحدید بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ طریقہ تدریس حکمت عملی اور تدریسی چالوں دونوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور ایک مخصوص نقطہ نظر بھی رکھتا ہے۔

سوالات

۱۔ دو مثالوں کے ذریعے عمومی اور کرداری مقاصد کا فرق بیان کیجیے۔

۲۔ وسطانی جماعتوں کے معاشرتی علوم کے عمومی مقاصد بیان کیجیے۔

۳۔ مقاصد تدریس کی اہمیت پر نوٹ لکھیے۔

۴۔ مواد اور طریق تدریس کے تعلق کی وضاحت کیجیے۔

۵۔ طریق تدریس کے انتخاب پر اثر انداز ہونے والے عوامل کی تشریح کیجیے۔

۶۔ معاشرتی علوم کی تدریس کے لیے کوئی ایک طریقہ نہ مناسب ہے اور نہ کافی۔ بحث کیجیے۔

۷۔ طریقہ تدریس سے کیا مراد ہے؟ مفصل بیان کیجیے۔

۸۔ تدریسی حکمت اور تدریسی تکنیکوں کے درمیان مثالوں کے ذریعہ فرق واضح کیجیے۔

۹۔ تدریسی تکنیکوں پر نوٹ لکھیے۔

۱۰۔ تدریسی طریقے کے تین اہم اجزا کا آپس میں ربط و تعلق واضح کیجیے۔

———

تیسرا باب

طریقہ ہائے تدریس معاشرتی علوم

اب ہم ان طریقہ ہائے تدریس کا مفصل ذکر کرتے ہیں جو عام طور پر معاشرتی علوم میں استعمال کیے جاتے ہیں ، یا کیے جا سکتے ہیں ۔ ان کا انتخاب تدریسی مقاصد اور دیگر ضروری عوامل پر موقوف ہے جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے ۔ معلم معاشرتی علوم پر واجب ہے کہ ان مختلف طریقوں کا پورا پورا فہم رکھے اور حسب موقع و ضرورت ان میں سے کسی ایک یا ان کے مختلف مرکبات کو کام میں لے آئے ۔ ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کہ معلم صرف ایک ہی طریقے تک محدود رہے ۔ عام طور پر معاشرتی علوم کا استاد دو تین طریقوں سے بیک وقت کام لے رہا ہوتا ہے ۔ مگر کس طریقے پر زیادہ زور دے اور کس پر کم اس کا فیصلہ تدریسی صورت حال دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے ۔

تقریری طریقہ

تقریری طریقہ قدیم ترین طریقہ تدریس ہے ۔ جدید زمانے میں اس پر تعلیمی حلقوں میں بڑی تنقید کی گئی اس کے باوجود اب بھی تعلیمی دنیا میں سب سے زیادہ مروج بھی طرز تدریس ہے ۔ یہی بات اس طریقہ کی افادیت کی علامت ہے غالباً اس کی خوبیاں خامیوں سے کہیں زیادہ اور وزنی ہیں ۔ جہاں تک معاشرتی کی تدریس کا تعلق ہے اس طریقے کی مقبولیت اور موزونیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

نوعیت :

تقریری طریقے میں معلم زیادہ وقت خود بولتا ہے ۔ بڑے منظم اور منطقی انداز میں مواد کو پیش کیا جاتا ہے ۔ انداز پیشکش نفسیاتی اور جذباتی بھی ہو سکتا ہے اور سنجیدہ و منطقی بھی ۔ بہرصورت معلم معلومات و افکار کے انبار لگاتا چلا جاتا ہے ۔ طلبہ خاموشی سے سنتے رہتے ہیں ۔ دوران تدریس کچھ سوال و جواب بھی ہو جاتے ہیں ۔ بعض اوقات کوئی سوال جواب نہیں ہوتے ۔اس طریقے

میں معلم الفاظ ، انداز گفتار اور دیگر بدنی حرکات و علامات کے ذریعہ بھی مخصوص جذبات و احساسات ، رویوں اور افکار و عقائد کو طلبہ کی طرف منتقل کرتا رہتا ہے ۔

معلم اعظم جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی طریقہ تھا نہایت نرم لب و لہجے میں تقریر فرماتے، تقریر واضح اور مختصر مگر جامع ہوتی ، زبان سادہ اور فصیح اور رفتار درمیانہ ہوتی، آواز معتدل اور صاف ، جس نکتے پر زور دینا چاہتے اسے بیان کرنے کے بعد قدرے توقف فرماتے ، تاکہ دل و دماغ میں پوری طرح اتر جائے ، اسی طرح حیرت و استعجاب اور دلچسپی بڑھانے کے لیے خاص قسم کے الفاظ و تراکیب سے کام لیتے ، مخاطب کی ذہنی استعداد کو مدنظر فرماتے۔یہ سب چیزیں نہایت مفید اور تقریری طریق کے لیے بے حد ضروری ہیں ۔

تقریری سبق کی اقسام :

اس کی تین مشہور اقسام حسب ذیل ہیں :

(الف) داستان گوئی کا طریق ۔

(ب) سقراطی طریق ۔

(ج) ملا جلا طریق ۔

(الف) داستان گوئی :

یہ قصہ گوئی کا معروف طریقہ ہے ۔ اس میں معلم واقعات کو قصے کی صورت میں پیش کرتا ہے ۔ بڑے دھیمے لب و لہجے اور سادہ الفاظ میں کلام رواں دواں رہتا ہے ۔ انداز بیان پُر تاثیر اور دلکش ہوتا ہے ۔ طلبہ دم بخود ہوکر سنتے رہتے ہیں اور خوب لطف اٹھاتے ہیں ۔ سنانے والا بھی لطف اندوز ہوتا رہتا ہے ۔ مگر یہ ایک فن ہے جس کے لیے مہارت کی خاصی ضرورت ہے ۔ ہاں بعض اساتذہ کو یہ فن خدا کی طرف سے بطور تحفہ ملتا ہے مگر ایسے لوگوں کی تعداد انتہائی قلیل ہے ۔

تاریخ کے لیے داستان گوئی بطور خاص موزوں ترین ہے ۔ دیگر علوم مثلاً سیاسیات ، معاشریات ، جغرافیہ اور اقتصادیات کے مخصوص پہلوؤں کو بھی داستانی انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے ۔ اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ لازماً ہر جز اور ہر عنوان کو قصے میں ڈھالا جائے ۔ بہرکیف جب معلم سواد کو قصے کی صورت میں سنانا چاہے تو لازم ہے کہ اسے داستان کا رنگ دے ۔ داستانی طریقہ ابتدائی جماعتوں میں بالخصوص بڑا کامیاب رہتا ہے ۔ وسطانی منزل کے طلبہ بھی برابر لطف اندوز ہوتے ہیں ۔ اگر استاد کو یہ فن آتا ہے اور وہ خود بھی داستان سرائی میں دلچسپی لیتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ طلبہ دلچسپی نہ لیں ۔ لکھنے والوں نے سائنسی حقائق کو بھی داستان کی صورت میں پیش کر دیا ہے اور سبھی عمروں کے لوگ برابر لطف اٹھاتے ہیں ۔

فوائد :

۱- داستانی حالات و معلومات جلدی ذہن میں جذب ہو جاتے ہیں -
۲- طلبہ کا جذبہ تجسس بیدار ہوتا اور پروان چڑھتا ہے -
۳- خشک حقائق دلچسپ اور قابل فہم بن جاتے ہیں -
۴- طلبہ توجہ اور انہاک سے سنتے رہتے ہیں -
۵- مطلوبہ رویوں اور جذبات کی تعلیم آسان ہو جاتی ہے -

(ب) سقراطی طریق :

یہ طریقہ مشہور فلسفی سقراط کے نام سے منسوب ہے - یہ سوال و جواب کا طریقہ ہے جس میں معلم سوال کرتا ہے اور طالب علم جواب دیتا ہے - بظاہر یہ ایک تدریسی تکنیک ہے مگر سقراط نے اپنی فکری اپج اور انداز طبیعت کے زور سے اسے تکنیک سے اٹھا کر طریق تدریس کے مقام پر کھڑا کر دیا اور جس انداز میں سقراط اس طریقے کو نبھاتا ہے وہ تو خیر سقراط ہی کا حصہ ہے - پھر بھی معاشرتی علوم کے اساتذہ اس طریقے سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں ، خاص طور پر اقدار اور تصورات کے سلسلے میں اور ویسے تو ہر علمی موضوع پر سوال در سوال کیے جا سکتے ہیں -

سوال کرنا تدریس کا اہم حصہ ہے اور موزوں اور بامعنی سوال کرنا بڑا مشکل کام ہے - کہا جاتا ہے اچھا سوال آدھا علم ہے ، بیشک سوال کرنے سے ذہن کے دریچے کھلنے لگتے ہیں - نئی نئی باتیں سوجھتی ہیں اور دلچسپی بڑھ جاتی ہے - سقراطی طریقے میں معلم راہنما کا کام دیتا ہے - وہ طلبہ پر سوال کر کے ان کے ذہنوں کو جھنجھوڑتا اور بیدار کرتا ہے - انہیں جھوٹ اور سچ ، مفید اور مضر، اعلیٰ اور ادنیٰ میں تمیز کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے - وہ ان میں تجزیے اور غور و فکر کی عادت ڈالتا ہے اور صحیح نتیجہ نکالنے میں ان کی مدد اور تربیت کرتا ہے - اور بالاخر ان پر خود ان کے ذریعے حقیقت کا انکشاف کراتا ہے - تعلیمی نقطۂ نظر سے یہ سب باتیں قابل قدر اور مفید ہیں -

سقراط کچھ اس طرح کے سوالات کرتا ہے : حق کیا ہے ؟ صداقت کسے کہتے ہیں ؟ بہادر کون ہے ؟ انصاف کیا شے ہے ؟ پھر اس ابتدائی سوال سے سوالات کا ایسا جالا بنتا چلا جاتا ہے کہ مخاطب حیران و ششدر رہ جاتا ہے کہ کہاں سے چلے تھے اور کہاں پہنچ گئے -

سقراطی طریقہ دراصل ڈراماتی انداز میں بحثی و انکشافی طریق تدریس ہے - اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ طلبہ موضوع زیر بحث سے متعلق پہلے اچھی خاصی معلومات بھی رکھتے ہوں - اس لیے سابقہ تیاری نہایت ضروری ہے - یہ معلومات درسی کتاب سے ہوں یا دیگر ذرائع علم سے طلبہ کو معلومات کا حامل ہونا لازمی ہے -

یہ طریقہ بالکل علیحدہ طور پر معاشرتی علوم کی تدریس میں نہیں اپنایا جا سکتا ہے۔ البتہ کسی اور طریق تعلیم کے ساتھ مل کر مفید نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ دوران سبق وضاحت کے طور پر اور اعادہ سبق میں بالخصوص اسے بڑی کامیابی سے آزمایا جا سکتا ہے۔ ہاں بعض عنوانات کے متعلق اگر طلبہ پہلے سے معلومات رکھتے ہوں تو سارا سبق بھی اس کے ذریعے پڑھایا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بڑی جماعتوں میں اس طریقے کا استعمال غیر موزوں معلوم ہوتا ہے۔

فوائد :

۱۔ معلم اور متعلم دونوں عمل تعلیم میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔
۲۔ ذہنی آزادی کا احساس ہوتا ہے۔
۳۔ فکری غلطیوں اور عقلی مغالطوں سے آگاہی ہوتی ہے۔
۴۔ قوت استدلال نکھرتی اور ترقی پاتی ہے۔
۵۔ علمی ذوق و شوق کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔
۶۔ سوچ میں ربط و تسلسل کا فن ہاتھ آ جاتا ہے۔

(ج) ملا جلا طریق :

یہی طریقہ اکثر مدرسوں میں رائج ہے اور یہی متوازن اور حقیقت پسندانہ نظر آتا ہے۔ اس میں معلم پہلے سے تیار شدہ مواد اور تدریسی معاونات کی مدد سے سبق کو بیان کرتا ہے۔ مواد کو ایک خاص تنظیم و ترتیب میں ڈھال کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ترتیب سبقی اشارات کہلاتی ہے۔ سبقی اشارات میں مقاصد، تدریسی معاونات، مواد، طریقہ یا طریقہ ہائے تدریس جائزہ اور اعادہ کا واضح مگر مختصر ذکر ضرور موجود ہوتا ہے۔

معلم بڑی چابکدستی سے مواد کو پیش کرتا ہے۔ تدریسی معاونات کو موقع محل کی مناسبت سے استعمال کرتا رہتا ہے۔ کچھ معلم کی تقریر، کچھ سوال و جواب اور کچھ تدریسی معاونات کے سبق جاری رہتا ہے۔ تا آنکہ سبق اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔ عام طور پر ہم سب اسی طریقہ تدریس کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اور اس کی خوبیوں اور خرابیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔

تقریری طریق تدریس کے موزوں استعمالات :

یہ کہنا کہ تقریری طریقہ بالکل فضول اور زائد المیعاد ہے درست نہیں۔ اس کے صحیح استعمال کے مواقع درج ذیل ہیں :

۱۔ تدریسی یونٹ یا عنوان کا تعارفی جائزہ کرانا۔
۲۔ عنوان کا پس منظر مہیا کرنا۔
۳۔ طلبہ کے مطالعہ میں مدد و اضافہ کرنا۔

۴- تھوڑے وقت میں زیادہ سے زیادہ علم و اطلاع منظم طور پر دینا -
۵- طلبہ میں جوش و خروش پیدا کرنا اور ان کے لطیف احساسات کو بیدار کرنا -
۶- اصطلاحات کی توضیح اور تشریح اور غلط افکار کی تصحیح کرنا -
۷- وقت کی بچت کرنا -
۸- خلاصے اور جائزے تیار کرنا -

یہ ہیں وہ مواقع جن میں تقریری طریقے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور ضرور اٹھانا چاہیے -

تقریری طریقے کے استعمال کی ہدایات :

۱- لیکچر منظم و مرتب اور پوری طرح تیار ہونا چاہیے -
۲- سبقی اشارات اہم اور ذیلی عنوانات پر مشتمل ہوں -
۳- اہم موضوعات و افکار تفاصیل میں دب کر نہ رہ جائیں -
۴- انداز بیان سادہ اور مکالماتی ہو-
۵- آہستہ آہستہ اور وقفوں کے ساتھ بیان جاری رکھا جائے
۶- جب بات طویل اور گراں بار ہونے لگے تو بحث چھیڑ دی جائے
۷- طلبہ سے ذہنی و جذباتی رابطہ قائم رہے تاکہ ان کی مشکلات کا احساس ہو سکے -
۸- مزاح کا عنصر ضروری ہے مگر غیر متعلق اور بیہودہ باتوں سے اجتناب کیا جائے -
۹- اہم عنوانات کے خاتمہ پر سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دینا چاہیے -
۱۰- موضوع سے متعلق رنگ برنگی اور دلچسپ معلومات مہیا کیجیے -

بوقت ضرورت تقریری طریقے سے استفادہ کیا جانا چاہیے - اس سے گریز اور بے جا استعمال دونوں سے احتراز لازمی ہے- اسے معتدل صورت میں استعمال کیا جائے -

درسی کتابی طریق

درسی کتاب کو بطور طریقہ تدریس استعمال کرنا کوئی نئی بات نہیں -پہلے زمانے میں درسی کتاب طلبہ سے لفظ بہ لفظ رٹوائی جاتی تھی - اور اپنی طرف سے کچھ کمی بیشی کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا شاید اب بھی بعض سکولوں میں کچھ استاد کتاب رٹواتے ہیں لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں - محض حقائق کو حرف بہ حرف رٹ لینا کوئی مفید کام نہیں - اصل چیز تو فہم و ادراک اور نقد و تبصرہ

ہو اس طریقہ کو دوسرے طریقوں سے ملا جلا کر استعمال کرے تاکہ طلبہ اکتاہٹ اور خشکی کا شکار نہ ہوں۔

۳۔ عنواناتی قرآت :

معلم سبق کے کچھ عنوانات طے کر کے طلبہ کو کام تفویض کر دیتا ہے۔ ہر طالب علم سے توقع کی جاتی ہے کہ ہر عنوان کو درسی کتاب سے پڑھ کر خوب تیار کرے، تاکہ جماعت میں ہر عنوان پر بات چیت کر سکے۔ اس طرح طلبہ مجوزہ عنوانات کی تلاش کے لیے درسی کتاب کا رخ کرتے ہیں اور مطلوبہ مواد کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طریق کار سے استفادہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ طلبہ پر اچھی طرح واضح کر دیا جائے کہ معلم ان سے کیا توقعات رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی ہدایاتی خاکہ مہیا کیا جا سکے تو اچھا ہے۔

اس طریقے کا ایک نقص یہ ہے کہ سب طلبہ ایک ہی طرح کے عنوانات پر کام کرنے کی وجہ سے ایک جیسے مواد کا اعادہ و تکرار کرتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی تنوع اور رنگا رنگی نہیں پائی جاتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ طلبہ کو عنوانات پر مطلوبہ مواد حاصل کرنے کی تربیت ضرور مل جاتی ہے طلبہ ایک دوسرے کے پیش کردہ مواد پر تنقید و تبصرہ بھی کر سکتے ہیں۔ مفوضہ عنوانات کا تلخیصی خاکہ تیار کر کے طلبہ ہر عنوان پر مختصر سی بحث بھی کر سکتے ہیں۔ اگر معلم نے درسی کتاب کے علاوہ اضافی تدریسی مواد بھی ذمہ لگایا ہو تو طلبہ بحث و تمحص کی تربیت بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

چھٹی اور ساتویں جماعتوں میں استاد، شاگرد شراکتی مطالعہ کا طریقہ مناسب ہے۔ البتہ اس میں تقریری، منصوبی، بحثی اور قرآت آزمائش طریقے کا مناسب ترامیم کے ساتھ حسب ضرورت پیوند ضرور لگایا جائے۔ آٹھویں جماعت میں شراکتی اور عنواناتی قرآت کو ملا جلا کر اختیار کیا جائے اور دیگر طریقوں کے ساتھ مناسب پیوند کاری کی جائے۔ اس طرح درسی کتاب کے استعمال کے مختلف طریقوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ معلم کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ جب بھی جس طریق تدریس کو مفید پائے اس سے فائدہ اٹھانے میں دریغ نہ کرے۔ البتہ ایسا کرنے کے لیے اس کے پاس ٹھوس دلائل ہونے چاہیں جو مقاصد تدریس سے بھی ہم آہنگ ہوں اور دیگر عوامل تدریس سے بھی مطابقت رکھتے ہوں۔

مسئلی طریقہ :

تعلیم میں ترقی پسند تحریک نے مسئلی طریقہ کو بڑی اہمیت دی ہے۔ جان ڈیوی (John Dewey) اس طریقہ تدریس کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ تدریس میں ترقی پسندی مسئلی تدریس کے ہم معنی قرار پا گئی۔ بعض جگہ ہر مضمون میں اسے برتنے کی خاص کوشش بھی کی گئیں۔ کچھ اچھے اثرات مرتب ہوئے، بعض لغزشیں ہوئیں، کچھ تجاوزات ہوئے، اور اس طریقے کے استعمال میں احتیاط برتی جانے لگی۔

خود معتقدین حیران پریشان ہو کر رہ گئے - اس کا رد عمل یہ ہوا کہ اس طریقے کے استعمال میں احتیاط برتی جانے لگی - اور معلمین پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ نہ تو ساری تدریس اس کے سہارے چل سکتی ہے اور نہ ہی یہ کوئی مفید اور مناسب بات ہے - لہذا جس مضمون میں جس جگہ ضرورت ہو اسے کام میں لایا جائے اور پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے، مگر حدود سے تجاوز نہ ہونے پائے - جہاں تک معاشرتی علوم کا تعلق ہے اس کے بعض حصوں کے لیے مسئلی طریقہ نہایت موزوں ہے - خاص طور پر مسائل اور متنازع امور کے مطالعہ کے سلسلے تاریخ اور شہریت کا خاصا حصہ اس کے ذریعہ پڑھایا جا سکتا ہے - لیکن سارے معاشرتی علوم کو اس طرز پر ڈھالنا ممکن ہے اور نہ مناسب - اس طریق کار کی دلچسپی مسلم مگر یہ خاصا ٹیکنیکل اور وقت طلب طریقہ ہے - اسے بڑی ہوشمندی اور ہوشیاری سے استعمال کرنا چاہیے -

نوعیت :

نفس مضمون یا مواد کو مسائل کی صورت میں ڈھال کر ان کا حل ڈھونڈنا مسئلی طریق تدریس کہلاتا ہے - آپ اسے فکری مہم جوئی بھی کہہ سکتے ہیں - یہاں مواد کو سوالوں کی شکل دے کر طلبہ کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے تاکہ وہ سوچ بچار اور ذاتی عمل کے ذریعے اس کا حل نکال لیں - اس سلسلہ میں ان کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی بھی کی جاتی ہے - مگر سارا کام خود طلبہ سرانجام دیتے ہیں - استاد پس منظر میں رہتا ہے - مقصود یہ ہے کہ طلبہ خود کاوش کریں اور اپنی جملہ فکری و عملی صلاحیتوں کو کام میں لے آئیں -

مسئلی طریقے کے دو امتیازی خصائص ہیں: ایک یہ کہ عمومی مواد کی بجائے ان مسائل کو لیا جاتا ہے جن کا طلبا کی زندگی سے براہ راست یا بالواسطہ تعلق ہوتا ہے - دوم یہ کہ اصل زور علمی و فکری انداز کار (Process) اور انداز جستجو پر ہوتا ہے نہ کہ محض پہلے سے طے شدہ علمی مواد کی جذب و تحصیل اور حفظ و ترسیل پر - یہاں مقدار کی بجائے معیار پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور منزل سے زیادہ جادہ پیمائی بہتر سمجھی جاتی ہے - اس طریقہ کے تین بنیادی اجزا:

(۱) مسئلے کا احساس و شعور -

(۲) اس کو حل کرنے کی ضرورت -

(۳) اور فکری اقدامات ہیں جن کے ذریعے اسے حل کیا جاتا ہے -

ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ طلبا کو مسائل سے فطری دلچسپی ہوتی ہے اور الجھنیں سلجھانے کا انہیں ذوق شوق رہتا ہے - اگر بچپن سے انہیں مسائل کے حل کی تربیت دی جائے تو وہ حال اور مستقبل کے مسائل کو بطریق احسن حل کر لیں گے - پھر موجودہ دور میں تو زندگی مسائل کی آماجگاہ بنتی جا رہی ہے - لہذا مسائل سے نمٹنے کا طریقہ جاننا از بس ضروری ہے - اور لطف یہ کہ خود تعلیم کا مرکزی نقطہ بچوں کے غور و فکر کی پرورش اور عملی مسائل حیات سے عہدہ برا ہونا ہے - یہ سب امور اس

طریق تدریس کے حق میں جاتے ہیں ۔

مسئلی طریق کی اہمیت :

تین عوامل نے معاشرتی علوم کے لیے اس طریق کار کی اہمیت کو خاصا چمکا دیا ہے :

(۱) مسئلے کے ذریعے حاصل شدہ علم زبانی رٹنے اور میکانکی آموزش سے بہت زیادہ مؤثر اور مضبوط ہوتا ہے ۔

(۲) ہمعصر سوسائٹی دن بدن پیچیدہ بنتی جا رہی ہے اور طلبہ کو نت نئے اور پیچیدہ مسائل سے سابقہ پڑتا ہے ۔

(۳) جمہوریت کا تقاضا ہے کہ شہریوں کو حال اور ماضی کے سماجی مسائل سے نمٹنے کی تربیت دی جائے ۔

مسئلی طریقے کے اقدامات :

مختلف ماہرین تعلیم نے اس طریقے کے مختلف اقدامات پیش کیے ہیں ۔ جن میں کافی اشتراک اور قدرے اختلاف پایا جاتا ہے ۔ جان ڈیوی (John Dewey) کا پنج اقداماتی فارمولا بھی خاصا مشہور ہے مگر یہاں معاشرتی علوم اور وسطانی جماعتوں کے طلبا کی رعایت سے ویزلے اور رانسکی (Wesley and Wronski) کے مجوزہ اقدامات کا ذکر کیا جاتا ہے جو نسبتاً آسان اور قابل فہم ہیں ۔

۱۔ بیان مسئلہ :

مسئلے کو ٹھیک ٹھیک طرح صاف واضح زبان میں بیان کرنا مشکل کام ہے ۔ بہت سارے لوگ اپنی الجھن کو صحیح طور پر دوسروں پر واضح نہیں کر سکتے ۔ اس لیے بیان مسئلہ کی خاص مشق کرانی چاہیے ۔ بہرحال مسئلے کی نوعیت اور وسعت کو سمجھنا اور صاف سادہ زبان میں بیان کرنا پہلا قدم ہے ۔ مسئلے کو دو چار فقروں یا پھر آٹھ دس سطروں تک کے پیراگراف میں بیان کیا جا سکتا ہے ۔ اس سے بڑا پیراگراف بھی ہو سکتا ہے، مگر غیر ضروری طوالت سے اجتناب کیا جائے ۔

مسئلے کے انتخاب اور بیان میں درج ذیل معیار مفید ثابت ہو سکتا ہے ۔

۱۔ مسئلہ عمومی دلچسپی کا حامل ہوتا ہے کہ سب طلبہ اس پر کام کرنا پسند کریں ۔
۲۔ ایسا مسئلہ ہو جس کے متعلق فاضلانہ اختلاف رائے بھی موجود ہو ۔
۳۔ مسئلے سے متعلق کافی تحریری مواد اور دیگر اطلاعاتی وسائل بھی دستیاب ہوں ۔
۴۔ مسئلے کو غیر مبہم زبان میں بالکل واضح طور پر بیان کیا جائے ۔
۵۔ قابل عمل حصوں میں تقسیم کرکے تحدید (حدبندی) کی جا سکتی ہو ۔
۶۔ مسئلے کو اس طور پر بیان کیا جائے کہ اس سے متبادل نتائج یا حل نکل سکیں ۔

۲- معلومات جمع کرنا :

مسئلہ کو حل کرنے کے لیے متعلقہ حقائق اور معلومات جمع کیے جاتے ہیں۔ مطلوبہ چیزیں چاہے مختلف ذرائع سے ہیں یا ایک ہی منبع سے مل جائیں، معلم کا فرض ہے کہ متعلقہ معلومات کے جمع کرنے میں طلبہ کی مناسب راہنمائی کرے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ تمام مطلوبہ ذرائع کی پہلے تیار شدہ مکمل فہرست مہیا کر دے۔ البتہ استاد مطلوبہ معلومات کی اقسام اور عنوانات کے ضمن میں طلبہ کو مشورہ دے سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ طلبہ سوچیں کہ مطلوبہ چیزیں کہاں کہاں سے دستیاب ہوں گی اور ان کی کس طرح تنظیم و ترتیب کی جائے گی۔

معلومات جمع کرنے کے دوران طلبہ کو درج ذیل کام کرنے پڑتے ہیں۔

۱- حاصل شدہ معلومات کا خلاصہ تیار کرتے ہیں۔

۲- معلومات کے تمام مآخذ مثلاً کتب اخبارات، رسالے، عجائب گھر، لائبریریاں وغیرہ درج فہرست کیے جاتے ہیں۔

۳- طلبہ اپنے ذرائع اطلاعات از قسم سروے، رائے شماری اور مشاہدات وغیرہ کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔

جن مہارتوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

۱- امر واقعہ اور رائے میں فرق و امتیاز کرنا۔

۲- ذرائع کے قابل اعتماد ہونے کا جائزہ لینا۔

۳- ابتدائی اور ثانوی ذرائع معلومات میں فرق کر سکنا۔

۴- بیانات میں تعصب اور رو رعایت کو تاڑ جانا۔

۵- متاثر کرنے والے انداز مثلاً جذبات انگیز ادائیں، دشنام طرازی اور غیر معتدل تعلیات معلوم کر لینا۔

۳- استنتاج : (Inference)

حقائق سے نتائج نکالنے کا عمل استنتاج کہلاتا ہے۔ نتائج بڑی ہوشمندی سے نکالنے چاہییں اور انہیں عارضی تصوّر کرنا چاہیے تاکہ نئی معلومات جانے پر تو ان میں مناسب رد و بدل کر دیا جائے۔ نتائج کے سلسلے میں درج ذیل باتوں کو مدنظر رکھا جائے۔

۱- نتائج حقائق کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں۔

۲- نتائج کے لیے منطقی دلائل بھی موجود ہوں۔

۳- نتائج پر متعلقہ افراد یا گروہوں کی پرچھائیاں نہ پڑیں۔

۴- نتائج ملکی نظریۂ حیات کی متفقہ سماجی اقدار سے ہم آہنگ ہوں۔

۴- عمل درآمد :

نتیجہ بین یا تعمیم کی صورت میں سامنے آ جاتا ہے ۔ دونوں صورتوں میں عمل کے ذریعے ہی اسے ٹیسٹ کیا جائے اور اس کے اثرات توجہ سے نوٹ کیے جائیں، شہریت کا تقاضا ہے کہ طلبہ زبانی کارروائی کے ساتھ عملی اقدام بھی کریں ۔ خود اسلام میں علم و عمل ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔ علم بے عمل کو صلحائے امت نے کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا ۔عمل در آمد میں حسب ذیل نکات پیش نظر رہنا چاہییں ۔

۱- مجوزہ عمل نتیجہ کے مطابق ہو ۔

- عمل در آمد میں مقامی حالات اور زمانے کا مزاج ملحوظ خاطر رہے ۔

۳- مجوزہ عمل کی تکمیل کو ہر طالب علم اپنا مقدس فریضہ سمجھے ۔

۴- مجوزہ عمل قابل عمل ہونا چاہیے ۔

۵- مجوزہ عمل ملکی نظریہ حیات کی بنیادی، سماجی اقدار سے مطابقت رکھتا ہو ۔

یہ چار اقدامات ہیں جو مسئلی طریق میں اٹھائے جا سکتے ہیں ۔ ان میں کمی بیشی ہو سکتی ہے ۔ جان ڈیوی کے بیان کردہ فارمولے میں ایک اہم اقدام مفروضہ سازی کا ہے جسے مسئلہ میں اہم مقام حاصل ہے مگر ہم نے بخوف طوالت اس کا ذکر نہیں کیا ۔

مباحثی طریق (Discussion Method)

پاکستان میں تعلیمی انقلاب کی کوششیں کی جا رہی ہیں لیکن پڑھانے کے طریقوں میں بنیادی تبدیلیاں کیے بغیر تعلیمی نظام میں کسی انقلابی تبدیلی کا رونما ہونا بہت مشکل ہے ۔ سکولوں میں آج بھی کتابی یا تقریری طریقے سے پڑھایا جا رہا ہے جسے بدل کر مباحثی طریق اپنانے کی ضرورت ہے تا کہ اس جمہوری دور میں تنقیدی انداز فکر، منطقی استدلال، آزادانہ رائے اور فیصلہ کی صلاحیتیں طلبہ میں پیدا کی جا سکیں ۔

مباحثہ کا مفہوم :

کسی موضوع پر کھلے دل و دماغ کے ساتھ غور و فکر اور اظہار خیال کرنا مباحثہ کہلاتا ہے ۔ مباحثہ میں دو یا دو سے زیادہ افراد یا گروہ کسی ایک مسئلہ کی تہہ تک پہنچنے کے لیے دلائل پیش کرتے ہیں ۔ مباحثہ میں شرکت کرنے والوں کو حق ہوتا ہے کہ وہ پیش کردہ دلائل پر کڑی تنقید کر سکیں ۔ مباحثے کے تین بنیادی عناصر ہوتے ہیں :

۱- مباحثہ ہمیشہ متنازعہ امور سے متعلق ہوتا ہے ۔ اگر مسئلہ میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہ ہو تو بحث کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

۲- غور طلب مسائل میں سب شرکت کر سکتے ہیں اور اپنی رائے پیش کر سکتے ہیں اور دوسروں کی رائے کو دلیل سے رد کر سکتے ہیں ۔

۳- مباحثے کا بنیادی مقصد حقیقت کی تہہ تک پہنچنا ہوتا ہے۔

مباحثہ سمجھنے اور سمجھانے کا ایک طریقہ ہے اور اس میں طلبہ کی عقل و عمل کی صلاحیتوں کو فروغ دینے کے لیے کسی مسئلہ کے متعلق تمام حقائق اور خیالات کی چھان بین کی جاتی ہے۔ یہ بات سمجھ لینا نہایت ضروری ہے کہ مباحثہ تدریس کے مکمل عمل کا محض ایک جز ہے، بذات خود ایک مکمل عمل نہیں۔ یہ علمی ماحول میں ایک تعمیری عمل ہوتا ہے جس میں سننے، سوچنے اور بولنے کے تینوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ مباحثہ مقصد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے۔ لہذا ان مقاصد کی وضاحت ضروری ہے جن کے حصول کے لیے یہ طریق اختیار کرنا چاہیے۔

مقاصد :

۱- اتفاق رائے کی ضرورت کا احساس، بحث و مباحثہ سے طلبہ پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نئی شہادت کی روشنی میں پرانے مسلمہ نتائج و عقائد کو از سرنو تشکیل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے طلبہ پر یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حقیقت میں بالآخر کس قدر لچک ہے۔

۲- جماعتی یا گروہی عمل کا تعین: مباحثہ میں پورے غور و فکر کے بعد نتائج کا فیصلہ کثرت رائے سے کیا جاتا ہے، اور اقلیت اکثریت کے حق میں دستبردار ہو جاتی ہے۔ مباحثہ کا ماحصل عموماً ایک ایسا سمجھوتہ ہوتا ہے جس میں مخالف نظریات کو پہلے کی نسبت زیادہ بہتر طور پر سمجھا جاتا ہے۔

۳- انفرادی نتائج: مباحثہ کے بعد طلبہ جو بھی فیصلہ کریں گے وہ ان کا اپنا ذاتی فیصلہ ہوگا اور اس پر عمل کی تمام تر ذمہ داری خود ان پر عائد ہوگی۔

موضوع کا انتخاب :

استاد کو چاہیے کہ مباحثہ کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کرے جن کی چھان بین کی جا سکتی ہو۔ وہ واقعی بحث طلب مسائل ہوں اور غور و فکر کے بعد ان کے نتائج حاصل کیے جا سکتے ہوں۔ مثلاً جمہوریت میں کون سا طرز حکومت زیادہ بہتر ہے، پارلیمانی یا صدارتی۔

مناسب ماحول :

بحث کے لیے موزوں ماحول کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ استاد کو چاہیے کہ وہ طلبہ کے لیے ایسا مناسب ماحول پیدا کرے جس میں شرکت کرنے والے کسی قسم کی جھجک اور رکاوٹ کے بغیر اپنے خیالات اور نظریات کا اظہار کر سکیں۔

مناسب ماحول مہیا کرنے کے لیے مثبت رواداری کا ہونا بہت ضروری ہے تاکہ اقلیت بھی اپنے خیالات کا اظہار کر سکے۔ انتہائی مخالف خیالات کی بھی گنجائش ہو۔ ہر نے لاگ خیال پر سنجیدگی سے غور ہو سکے، اس کی جانچ پڑتال کی جا سکے اور سختی سے اس کا محاسبہ کیا جا سکے۔ طلبہ کو ہر

خیال پر کڑی تنقید کرنے اور ان کے ولولوں کی پڑتال کرنے کا موقعہ دینا نہایت ضروری ہے۔

اچھا مباحثہ وہی ہے جس میں ایک دوسرے کی بات کو غور سے سنا جائے اس سے ایک دوسرے کے خیالات کی اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ نئے شواہد کی روشنی میں نقطہ نظر میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ شاید اسی تربیت کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ ہم روزمرہ زندگی میں اپنے خلاف بات سننے اور برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ اپنی بات منوانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کی باتیں صبر و تحمل سے سننے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

طریق کار:

مباحثے کے لیے تین طریق کار استعمال کیے جاتے ہیں۔ (۱) گروہی (۲) جماعتی (۳) پارلیمانی، گروہی مباحثہ میں استاد طلبہ کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور ہر گروہ کو کوئی نہ کوئی عنوان دے دیا جاتا ہے۔ طلبہ اس عنوان کے بارے میں رپورٹ تیار کرتے ہیں اور پھر گروپ کی صورت میں اس پر بحث کرتے ہیں۔ رپورٹ کی تیاری کے بعد اسے جماعت کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور طلبہ کے سوالات کا جواب دیا جاتا ہے۔ آخر میں زیر بحث موضوع کے متعلق کوئی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔

جماعتی مباحثہ میں پوری جماعت شرکت کرتی ہے۔ استاد زیر بحث موضوع کے متعلق طلبہ کو ہفتہ دس دن قبل بتا دیتا ہے۔ بحث سے قبل طلبہ اس موضوع کے بارے میں مختلف ذرائع سے معلومات اکٹھی کرتے ہیں۔ ہر طالب علم کو بولنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ طلبہ کو بحث کے قواعد کا خیال رکھنا ہوتا ہے اور مناسب صورتوں اور موقعوں پر استاد طلبہ کی مناسب راہنمائی کرتا ہے۔ اس قسم کی بحث میں کلاس کو مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا بلکہ طلبہ ایک ہی جگہ پر بیٹھ کر بحث کرتے ہیں۔ آخر میں زیر بحث موضوع کے متعلق کوئی نتیجہ نکالا جاتا ہے۔

پارلیمانی مباحثہ کے لیے اختلافی مسائل کو جماعت میں پیش کرنے سے قبل استاد موضوع کا مختصر سا تعارف کراتا ہے اور طلبہ کو ایسے تمام ذرائع بتا دیتا ہے جن سے وہ زیر بحث موضوع کے متعلق مواد حاصل کر سکتے ہوں۔ جماعت میں باقاعدہ بحث شروع ہونے سے پہلے استاد کلاس کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک گروہ حزب موافق اور دوسرا حزب مخالف۔ بحث شروع ہونے سے قبل مختلف عہدیداروں کا چناؤ کیا جاتا ہے۔ مثلاً صدر اور سیکریٹری وغیرہ۔ صدر مباحثے کو کنٹرول کرتا ہے اور سیکریٹری تمام کارروائی نوٹ کرتا ہے۔ طلبہ صدر سے مخاطب ہو کر بات کرتے ہیں۔ استاد کا فرض ہے کہ جب بھی وہ محسوس کرے کہ طلبہ زیر بحث موضوع سے ہٹ رہے ہیں تو اس وقت ان کی راہنمائی کرے۔

مباحثی طریق میں استاد کو اپنی رائے طلبہ پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ استاد اپنا نقطہ نظر طلبہ سے چھپانے کی کوشش کرے اسے اپنا نقطہ نظر احتیاط سے پیش کرنا چاہیے۔ استاد اپنی رائے کو اس طریقہ سے پیش کرے جس سے طلبہ کی رائے پر مضر اثر نہ

اور وہ اپنی آزادانہ سوچ سے کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔

فائدے :

۱- مباحثی طریق تدریس سے جماعت میں جمہوری ماحول پیدا ہو جانے سے طلبہ اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کر سکتے ہیں جس سے ان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

۲- طلبہ ایک دوسرے کی رائے کا احترام کرنا سیکھتے ہیں جس سے آپس میں محبت بڑھتی ہے۔

۳- ان میں ناقدانہ سوچ بچار اور سوالات کا تجزیہ کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

۴- انہیں اظہار خیال کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر آتے ہیں۔

۵- طلبہ میں اختلاف رائے برداشت کرنے اور اختلافات کو حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

۶- وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ آیندہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل پر ناقدانہ نظر ڈال سکیں اور ان کا ممکن حل تلاش کر سکیں۔

۷- ان میں تجسس کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ مختلف ذرائع سے مواد اکٹھا کرنے کی تحریک ہوتی ہے اور پراپیگنڈہ کو ہر پہلو سے پرکھ کر واقع کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تفویضی کام (ASSIGNMENT)

تفویضی کام سے مراد وہ کام ہے جو استاد طلبہ کو انفرادی یا اجتماعی طور پر مقررہ وقت کے اندر مکمل کرنے کے لیے دیتا ہے اور جس کا مقصد طلبہ میں چھان بین، سوچ بچار اور اپنا کام خود کرنے کی اہلیت پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ صلاحیتیں صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہیں جب طلبہ کو خود پڑھنے اور لکھنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ دوسرے مضامین کی طرح معاشرتی علوم کو بھی ایک عملی مضمون تصور کیا جاتا ہے۔اس میں نہ تو چپ چاپ بیٹھ کر استاد کے لیکچر سننے کی گنجائش ہے اور نہ ہی درسی کتب کو من و عن رٹنے کی۔ اس کے برعکس معاشرتی علوم کی تدریس کا ایک اہم مقصد موضوع کے مطابق مواد اکٹھا کرنا، اسے جانچنا ترتیب دینا اور پیش کرنا ہے۔ یہ مقصد تفویضی کام کے ذریعے نہایت کامیابی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

تفویضی کام کی تکمیل کے لیے-استاد کی راہنمائی بہت ضروری ہوتی ہے۔ مثلاً استاد چاہتا ہے کہ طلبہ دو قومی نظریہ کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کریں ان کا جائزہ لیں اور اپنے خیالات کو رپورٹ کی صورت میں پیش کریں۔ جو کام انہیں تفویض کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ کون سی کتب پڑھیں۔ یہ کتب کہاں سے مل سکتی ہیں۔ سکول لائبریری سے یا شہر کی کسی اور لائبریری سے۔ معلومات حاصل کرنے کے دیگر ذرائع کیا ہیں۔ کن شخصیتوں سے مل کر وہ مطلوبہ معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ کس قسم کے نقشے، گوشوارے یا گراف تیار کرنے کی ضرورت ہوگی

وغیرہ وغیرہ ۔ تفویضی کام مکمل ہونے سے پہلے طلبہ کو استاد سے صلاح مشورہ کرنے یا اپنی کوششوں سے مطلع کرنے کی آزادی ہونی چاہیے ۔ طلبہ کو یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ مقاصد کی تکمیل کے لیے وہ اپنی طرف سے جو طریقے مناسب سمجھیں اختیار کر سکتے ہیں ، لیکن جو بات سب سے اہم ہے وہ استاد کی راہنمائی اور تفویضی کام کی پروگرام کے مطابق تکمیل ہے ۔ اگر کام ادھورا چھوڑ دیا گیا تو طلبہ میں کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی لگن مفقود ہو جائے گی اور اس طرح تفویضی کام کا مقصد ختم ہوکر رہ جائے گا ۔

اچھے تفویضی کام کی خوبیاں :

طلبہ کے ذمہ جو کام لگایا جائے اس میں مندرجہ ذیل خوبیوں کا ہونا ضروری ہے ۔

۱۔ کام بالکل واضح اور غیر مبہم ہونا چاہیے ۔ مثلاً یہ کہہ دینا کہ کل جہانگیر کے متعلق پڑھ کر آئیں قطعاً ناکافی ہے ۔اس طرح طلبہ کو بالکل واضح نہیں ہوگا کہ جہانگیر کے متعلق کن باتوں پر زیادہ زور دیا جائے گا ۔ وضاحت کے لیے کلیدی سوالات تجویز کر دینا چاہیں جن کی روشنی میں طلبہ مقررہ موضوع کا مطالعہ کریں ۔

۲۔ اس کی بنیاد طلبہ کی سابقہ معلومات پر ہونی چاہیے ۔

۳۔ کام دلچسپ ہونا چاہیے ۔

۴۔ کام کی تفویض میں انفرادی اختلافات کا لحاظ رکھنا چاہیے ۔

۵۔ کام کی اہمیت طلبہ پر اچھی طرح واضح ہونی چاہیے ۔

۶۔ کام فکر انگیز ہونا چاہیے ۔

۷۔ کام کرنے کا محرک لالچ یا سزا کی بجائے جذبہ جستجو ہونا چاہیے ۔

۸۔ اس سے طلبہ میں مطالعہ کی موزوں عادات استوار ہونی چاہیں ۔

۹۔ کام کو مکمل کرنے کے لیے طلبہ کو وقت اور مواقع میسر ہونے چاہیں ۔

۱۰۔ کام میں تنوع ہونا چاہیے تاکہ طلبہ ایک ہی قسم کے کام سے اکتا نہ جائیں ۔

۱۱۔ کام ایسا ہونا چاہیے جس سے فہم اور بصیرت پیدا ہو۔

اقسام :

تاریخی لحاظ سے تفویضی کام کی دو بڑی قسمیں ہیں (۱) روائتی (۲) جدید ۔

روائتی تفویضی کام سے مراد وہ کام ہے جو استاد طلبہ کو یاد کرنے کے لیے دیتے ہیں اور پھر طلبہ سے زبانی سن لیتے ہیں ۔ عموماً طلبہ کو مشکل اور غیر دلچسپ کام دیا جاتا ہے اور اس پہلو پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے کہ کس طرح کام کو آسان بنایا جائے ۔ طلبہ کو تفویضی کام کی منصوبہ بندی میں شریک نہیں کیا جاتا اور نہ ہی ان میں سوچنے اور سمجھنے کی عادات پیدا کرنے کے لیے تحریک

کی جاتی ہے ۔

جدید تفویضی کام کی بنیاد سبق کی بہتر منصوبہ بندی اور تنظیم پر رکھی گئی ہے ۔ اس میں کام کی نوعیت واضح ، متعین اور مربوط ہوتی ہے اور یہ روائتی تفویضی کام کے مقابلہ میں استاد سے بہت زیادہ مہارت اور تیاری کی توقع کرتا ہے ۔

اقدام :

جدید تفویضی کام کے لیے استاد کو مندرجہ ذیل اقدام کرنے ہوں گے ۔

۱- سابقہ تجربات کا حوالہ دینا ۔
۲- بحث و تمحیص ۔
۳- کسی نئی سرگرمی کی تجویز ۔
۴- بحث و تمحیص کے بعد نئی سرگرمی کی قبولیت ۔
۵- مشکلات کی وضاحتیں اور حل ۔
۶- استعمال کیے جانے والے مواد کا خاکہ تیار کرنا ۔
۷- تقسیم کار ۔
۸- اگر ممکن ہو تو کام کے آغاز کی نگرانی ۔

عام طور پر تفویضی کام کو تختہ سیاہ یا طلبہ کی کاپیوں پر لکھنا بہتر ہوگا ۔ اس سے طلبہ کو کام کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوگا اور یہ بھی یاد رہے گا کہ انھیں کون سا کام کرنا ہے ۔

تفویضی کام کو مکمل کرنے کی مدت کا انحصار طلبہ کی عمر اور سمجھ بوجھ پر ہوگا ۔ مڈل جماعتوں کے لیئے گھر پر کام کرنے کے لیے عام طور پر آدھ سے ڈیڑھ گھنٹے تک کا وقت کافی خیال کیا جاتا ہے ۔

تفویضی کام کو باقاعدہ اور موثر بنانے کے لیے اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت متاسب ہونی چاہیے ۔ تفویضی کام کی تیاری اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ استاد کو اپنے مضمون پر پورا عبور حاصل ہو ۔ وہ طلبہ کی ذہنی استعداد ، دلچسپیوں اور علم حاصل کرنے کی اہلیت کو بخوبی جانتا ہو اور اپنے مضمون کے متعلق دستیاب مواد سے باخبر ہو ۔ اس کے ساتھ ہی سکول میں ایک اچھی لائیبریری کا ہونا بہت ضروری ہے ۔ کیونکہ اس کے بغیر طلبہ اور اساتذہ کے لیے ضروری معلومات کی فراہمی انتہائی مشکل ہوتی ہے ۔

تمثیل کاری

DRAMATISATION

ڈرامہ تاریخی واقعات کو حقیقت کا روپ دینے اور گذشتہ زمانے کا ماحول پیدا کرنے کا ایک موثر

ذریعہ ہے اور ماضی و حال کے درمیانی فاصلہ کو کم کرنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔ اس سے صرف یادداشت کی ہی نشو و نما نہیں ہوتی بلکہ یہ جذباتی تجربات ، گہری ہمدردی ، وسیع النظری اور ماضی کے بارے میں صحیح معلومات پہنچاتا ہے۔

ڈرامہ دیکھنے والے کے جذبات کو براہ راست اپیل کرتا ہے۔ اس کا اثر فوری اور دیرپا ہوتا ہے۔ اگر ڈرامے کو موقع و محل کی مناسبت سے دانشمندی اور حکمت کے ساتھ استعمال کیا جائے تو یہ معاشرتی علوم پڑھانے کی ایک موثر تکنیک ثابت ہو سکتی ہے۔ تمثیل کاری سے طلبہ کے اندر ایک نیا ولولہ پیدا ہوتا ہے انھیں خیالات کے اظہار کے مواقع فراہم کرتا ہے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ یہ تدریس کے بیش قیمت معاونات میں سے ایک ہے۔

فوائد :

استاد ڈرامہ کو تدریس کے لیے دو طرح سے استعمال کر سکتا ہے ایک تو ڈرامہ میں طلبہ کو کسی کردار کی نمائندگی دے کو اور دوسرے طلبہ کو اچھے اور معیاری ڈرامے دیکھنے کا موقع دے کر یہ دونوں صورتیں تحصیل علم میں مدد دے سکتی ہیں۔ جب طلبہ کسی ڈرامے میں کوئی کردار ادا کرتے ہیں تو انھیں ڈرامہ کے ذریعے پیش کیے جانے والے مضمون یا واقعہ کے مفہوم کو سمجھنے کا بہتر موقع ملتا ہے۔ فرض کیجیے کوئی طالبعلم مشہور مسلم فاتح طارق بن زیاد کے کردار میں اس لازوال تقریر کو دہراتا ہے جو اس نے سپین پر حملے کے وقت اپنی فوج کے سامنے کشتیاں جلا کر کی تھی تو درحقیقت وہ طالبعلم اصلی کردار کا روپ دھار کر اس واقعہ میں سے خود گزر رہا ہوتا ہے ان کے برعکس جو طلبہ اس تقریر کو سن رہے ہوتے ہیں وہ بھی تعلیمی فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ طلبہ خواہ ڈرامے میں براہ راست شرکت کریں یا اس کا مشاہدہ کریں دونوں صورتوں میں ڈرامہ ایک مصنوعی تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈرامے میں شرکت سے بیشتر نفسیاتی امراض کے علاج کا ایک زرین موقعہ ملتا ہے۔ بعض طلبہ شرمیلے ہوتے ہیں وہ لوگوں کی نظروں میں آنے سے شرماتے ہیں۔ ایسے بچوں کی اصلاح کے لیے ڈرامہ موثر وسیلہ ہے۔ گفتگو کے نقائص مثلاً لکنت اور جھجک کو ڈرامہ میں شرکت کے ذریعہ آسانی سے رفع کیا جا سکتا ہے۔ ڈرامہ اچھے جذبات کی تسکین اور برے جذبات کے نکاس کے لیے ایک مفید اور بیحد ضروری ذریعہ بھی ہے۔ اس سے نہ صرف شرکت کرنے والوں کے ہیجانات کی تسکین ہوتی ہے بلکہ دیکھنے والے اپنے آپ کو ہیرو ، ولن یا کسی اچھے کردار کے روپ میں دیکھتے ہیں اور اس طرح اپنے جذبات کی تسکین کر لیتے ہیں۔ ڈرامہ کے ذریعے بچوں کو اہم قومی اور معاشرتی مسائل سے بھی آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ کمرہ جماعت میں کھیلے جانے والے ڈراموں کے لیے سٹیج یا زیادہ ساز و سامان اور تکلفات کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ ان ڈراموں میں زیادہ زور کردار ، حرکات آواز اور اظہار بیان

پر دینا چاہیے۔

ڈرامے کی اقسام :

ڈرامے کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً کھیل ، مکالمہ ، سوانگ Pageant تابلو Tableau ،

کھیل میں عام طور پر زندگی کا کوئی کردار یا کوئی تہذیبی پہلو پیش کیا جاتا ہے۔ سماجی مسائل ، بچوں کی بے راہ روی ، بیروزگاری ، زراعتی مسائل ، تربیت اطفال ، قواعد آمد و رفت وغیرہ کے ذریعہ نہایت عمدہ اور موثر طور پر طلبہ کے سامنے پیش کیے جا سکتے۔

کسی کہانی یا نظم کو مکالمے کی مدد سے ڈرامے کی شکل دینا ایک عام تدریسی حربہ ہے۔ اس صورت میں اداکار اظہار مطلب کے لیے حرکات و سکنات سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مکالمے میں زیادہ سے زیادہ افراد کو حصہ لینا چاہیے بصورت دیگر اس میں گڑ بڑ پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

سوانگ ایسا ڈرامہ ہے جسے کوئی مذہبی فرقہ پیش کرتا ہے۔ اس کے پلاٹ کی اساس مذہبی روایات یا مقامی تاریخ پر ہوتی ہے۔ ہندو رام سیتا کی کہانی اور عیسائی کرسمس اور ایسٹر کے تہواروں کو سوانگ کی صورت میں موثر انداز میں ہر سال پیش کرتے ہیں۔

تابلو میں اداکار خاموشی سے کام لیتے ہوئے صرف حرکات و سکنات کے ذریعے کسی تاریخی واقع کی تصویر پیش کرتا ہے اور ڈرامہ صرف بصری حد تک محدود ہوتا ہے۔

کٹھ پتلیوں کے تماشوں کے ذریعے خیالات کو انتہائی سادگی کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے اور کسی پُر تکلف ساز و سامان، مناظر یا لباس کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ کٹھ پتلیوں کا تماشہ سادہ ، غیر مبہم، اور پریشان کن تفاصیل سے مبرا ہوتا ہے۔

تاریخ سے تمثیل کاری کے مواد کا انتخاب بڑی احتیاط سے کرنا چاہیے۔ بعض تاریخی واقعات کو ڈرامہ کے ذریعے سکول میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً محمود غزنوی کا سومنات پر حملہ۔ شہریت پڑھاتے ہوئے تمثیل کاری کے کئی ایک مواقع میسر آ سکتے ہیں۔ ووٹ ڈالنے کا طریقہ باقاعدہ طور پر ڈرامے کے ذریعے پیش کیا جا سکتا ہے۔ فینسی ڈریس شو پاکستان کے مختلف علاقوں کے بچوں کے لباس کی نمائش کے لیے منعقد کیا جا سکتا۔ جغرافیہ کی تدریس میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ دنیا کے دوسرے علاقوں کے بچوں کو بھی اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ ، شہریت یا جغرافیہ کے کسی پہلو کو ڈرامے کے ذریعے پیش کرنے کے بعد طلبہ کو اس پر بحث کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ استاد کو خود مناسب سوالات کر کے اس بحث کا آغاز کرنا چاہیے۔ تمثیل کاری پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا

ہے کہ اس میں بہت زیادہ وقت لگ جاتا ہے اور مضمون کے نسبتاً کم اہم پہلوؤں پر زور دیا جاتا ہے۔ لیکن اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ یہ جذبات کے اظہار کا ایک موثر ذریعہ ہے اور اس سے انسانی تجربات کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

منصوبی طریق تعلیم (PROJECT METHOD)

طلبہ معاشرتی علوم سے بالعموم نفرت کیوں کرتے ہیں ؟ اس لیے کہ بے ربط معلومات و واقعات کو رٹنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے یا ان کے ذہنوں میں ٹھونسنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نتیجتاً طلبہ کو مضمون سے ہی نفرت ہو جاتی ہے۔ اگر کسی طرح طلبہ کو ایسی بامقصد سرگرمیوں میں لگا دیا جائے جن میں انھیں ذہن اور ہاتھوں سے کام لینا پڑے تو مضمون کی تدریس دلچسپ اور موثر ہو سکتی ہے۔ وہ طریقہ جو بامقصد عملی سرگرمیوں پر زور دیتا ہے منصوبی طریق تعلیم کہلاتا ہے۔ اس کی تعریف یوں کی گئی ہے :

"ایسا بامقصد کام جس کی طلبہ منصوبہ بندی کریں اور جو انھیں کے ہاتھوں عام حقیقی زندگی کے ماحول میں تکمیل پائے"۔

اس تعریف کو غور سے پڑھیں تو مندرجہ ذیل باتیں ذہن میں آتی ہیں :

۱۔ طلبہ کو پہلے کی ضرورت یا دشواری کا احساس ہونا چاہیے۔ پھر وہ اس مشکل پر قابو پانے کے لیے عملی تدابیر سوچیں اور ایک عملی منصوبہ ترتیب دیں۔

۲۔ منصوبہ ایسا ہو جس کے لیے لگاتار مطالعہ اور مسلسل سرگرمیوں کی ضرورت ہو۔

۳۔ کام کی منصوبہ بندی اور تکمیل طلبہ خود کریں۔

۴۔ منصوبہ کی نوعیت عملی ہونی چاہیے۔

مسئلی اور منصوبی طریق میں فرق :

بظاہر مسئلی اور منصوبی طریق ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں لیکن دونوں کے درمیان ایک بنیادی فرق موجود ہے۔ مسئلی طریق میں زیر مطالعہ مسئلہ کا صرف ذہنی حل ڈھونڈا جاتا ہے منصوبی طریق ذہنی حل کو عملی شکل دیتا ہے اور اس مقصد کے لیے مادی وسائل سے کام لیتا ہے۔ فرض کیجیے سکول کی صفائی کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے طلبہ سکول سے پانی کے نکاس، کمروں، برآمدوں اور صحن کی صفائی کا معائنہ کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پانی کے نکاس کا انتظام غلط ہے، صحن سے گھاس کاٹی نہیں جاتی اور کمروں اور برآمدوں میں سفیدی کرانے کی ضرورت ہے۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد وہ رک جاتے ہیں اور اپنے مطالعہ کے نتائج سے ہیڈ ماسٹر صاحب کو آگاہ کرتے ہیں تاکہ وہ پانی کے نکاس، گھاس کی کٹائی اور سفیدی کا انتظام کریں۔ یہ مسئلی طریق کی ایک مثال ہے۔

لیکن اگر طلبہ اس ذہنی حل سے اگلا عملی قدم بھی خود ہی اٹھائیں یعنی پانی کے نکاس کا انتظام خود درست کر دیں، خود سفیدی کریں اور گھاس کاٹیں تو ان کا طریق کار مسئلی کی بجائے منصوبی بن جائے گا۔

اس طرح مسئلی اور منصوبی طریقوں کے درمیان صرف آخری قدم کا فرق ہے مگر اس فرق سے دونوں طریقوں میں نمایاں فرق پڑ جاتا ہے۔ یہاں یہ بات شروع سے معلوم ہو کہ مسئلہ کا جو حل تجویز کیا جاتا ہے اس کی ہر چھوٹی بڑی تفصیل کو عملی شکل دینے کی ذمہ داری بھی حل تجویز کرنے والوں پر ہے تو وہاں پہلے ہی قدم سے ہر قسم کی عملی سرگرمیاں ذرا مختلف نوعیت کی ہوں گی۔

منصوبوں کی قسمیں :

منصوبے دو قسم کے ہوتے ہیں : (۱) انفرادی منصوبے۔ (۲) گروہی منصوبے۔ انفرادی منصوبہ وہ ہے جس کی تکمیل اکیلا طالبعلم کرتا ہے۔ گروہی منصوبے سے مراد ایسا منصوبہ ہے جس کی تکمیل بہت سے طلبہ مل کر کرتے ہیں۔

طریق کار :

کسی منصوبے کو تکمیل تک پہنچنے کے لیے چار مرحلوں میں سے گزرنا پڑتا ہے :

۱۔ مقصد اور دستیاب وسائل کا تعین کرنا۔
۲۔ منصوبے کا تفصیلی خاکہ تیار کرنا۔
۳۔ منصوبے کو عملی شکل دینا۔
۴۔ نتائج کا جائزہ لینا۔

۱۔ مقصد اور دستیاب وسائل کا تعین کرنا :

منصوبی طریق میں اس بات پر بڑا زور دیا جاتا ہے کہ طلبہ کسی کام کو کرنے سے پہلے اس کے مقاصد طے کر لیں۔ انہیں اس بات کا بھی علم ہونا چاہیے کہ دستیاب وسائل کیا ہیں جن کی مدد سے کام کو مکمل کرنا ہوگا۔ یہ ذمہ داری استاد کی ہے کہ وہ دیکھے کہ طلبہ کسی ایسے منصوبے کو ہاتھ نہ ڈالیں جو حقیقی تعلیمی قدر و قیمت نہ رکھتا ہو اور جسے مکمل کرنے کے لیے وسائل دستیاب نہ ہوں۔ اگر کبھی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو استاد کو چاہیے کہ وہ جماعت میں بحث کے دوران منصوبے پر اس انداز سے روشنی ڈالے کہ طلبہ اسے ترک کر کے کسی دوسرے منصوبے پر کام کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

۲۔ منصوبے کا تفصیلی خاکہ تیار کرنا :

مقاصد اور وسائل کا تعین کر لینے کے بعد منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے حکمت عملی کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ کام کا یہ مرحلہ بڑا اہم ہے۔ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر اسے حاصل کرنے کے

لیے عملی راہیں تلاش کرنا اور ان راہوں کو باہم اس طرح ملانا کہ مقصد حاصل ہو جائے، گہری سوچ بچار کا مطالبہ کرتا ہے۔ طلبہ میں چھوٹی چھوٹی جزئیات پر غور و فکر کرنے کی عادت ڈالنا ہی منصوبی طریق کا سب سے بڑا منشا ہے۔

منصوبے کی تفصیلات طے کرتے وقت یہ بات قدرتی ہے کہ طلبہ کچھ غلطیاں بھی کریں گے۔ استاد کو چاہیے کہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو نظر انداز کر دے۔ تاہم اگر منصوبہ بندی میں کوئی نمایاں غلطی نظر آئے تو اس سے خبردار کر دینا ضروری ہے۔ اس قسم کی غلطی سارے منصوبے کو تباہ کرکے طلبہ کے جذبۂ عمل کو سرد کر سکتی ہے۔

۳- منصوبے کو عملی شکل دینا :

منصوبے کی تفصیلات طے کر لینے کے بعد اگلا قدم اسے عملی شکل دینے کا ہے۔ طلبہ خود کام کرنے اور اپنے کام کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھنا پسند کرتے ہیں ان کے اس فطری جذبہ عمل کو تعمیری راستے پر لگائے رکھنا چاہیے۔ لیکن اس سلسلے میں دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ (۱) طلبہ کام میں اس حد تک نہ کھو جائیں کہ منصوبے کے مقاصد ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ (۲) منصوبے کی جو تفصیلات طے کی گئی ہیں ان کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔ پہلی صورت میں استاد کا فرض ہے کہ وہ موزوں اشاروں کی مدد سے منصوبے کے مقاصد کی یاد دہانی کراتا رہے اور یہ احساس دلاتا رہے کہ طلبہ ان مقاصد کے کتنے قریب پہنچ گئے ہیں۔ دوسری صورت میں ہر تفصیل کو عملی شکل دینے کے بعد اس بات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے کہ مقاصد کی کس حد تک تکمیل ہوئی ہے اور باقی کتنا کام رہتا ہے۔ اس مرحلے پر استاد کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ ہر قسم کا ضروری مواد پہلے سے مہیا رکھے تاکہ طلبہ کا وقت ضائع نہ ہو اور منصوبہ بر وقت مکمل ہو سکے۔

منصوبے کے تکمیلی مراحل میں یہ بات بھی بڑی ضروری ہے کہ استاد طلبہ کے کام میں مداخلت نہ کرے، ان کے برے بھلے کام کی تعریف کرکے ان کی حوصلہ افزائی کرتا رہے۔ اگر استاد یہ محسوس کرے کہ کسی طالب علم کی سست رفتار سے ساری جماعت کے کام میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے تو ایسی صورت میں وہ اس کی تھوڑی بہت مدد کر سکتا ہے۔

۴- نتائج کا جائزہ لینا :

منصوبے کا آخری مرحلہ تکمیل کے بعد اس کا جائزہ لینا ہے۔ اگر تیار کردہ چیز میں کوئی کمی یا کوتاہی نظر آئے تو یہ معلوم کیا جائے کہ منصوبہ بندی میں کیا غلطی رہ گئی ہے جس کی وجہ سے یہ کمی پیدا ہوئی ہے تاکہ آئندہ ایسی غلطی کا احتمال نہ رہے۔

جائزہ لینے کا کام زیادہ تر طلبہ خود سرانجام دیں۔ استاد طلبہ کو صرف تنقید کے معیاروں سے آگاہ کر دے تاکہ ان معیاروں کی روشنی میں تیار شدہ چیز کی خوبی کا اندازہ لگایا جا سکے۔ گروہی منصوبے کا جائزہ ہمیشہ پوری جماعت مل کر لے۔ انفرادی منصوبوں کے متعلق استاد اپنی رائے کا اظہار

کر سکتا ہے، مگر یہ رائے ایسے انداز میں ظاہر کی جائے کہ طلبہ اپنے کام کی خوبی اور خامی کے دل سے قائل ہو جائیں ۔

عملی مشکلات :

منصوبی طریق طلبہ کے اندر جو ذہنی اور عملی مہارتیں پیدا کرتا ہے ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر اس طریقہ تدریس کو اختیار کرنے کے راستے میں کئی مشکلات حائل ہیں جن پر قابو پانا استاد یا سکول کے بس میں نہیں ۔ بڑی بڑی مشکلات یہ ہیں :

۱- موزوں قسم کے منصوبوں کا ملنا آسان کام نہیں ۔

۲- منصوبے جس قسم کی عملی سرگرمیوں کا تقاضا کرتے ہیں ان کے دوران نظم و ضبط قائم رکھنا محال ہوتا ہے ۔

۳- مقررہ نصاب تعلیم کا تسلسل قائم نہیں رہتا ۔

۴- سکول کے اوقات کی پابندی مشکل ہو جاتی ہے ۔

ان عملی مشکلات کی بنا پر منصوبی طریقہ تدریس کا استعمال بڑا محدود ہے ۔

شراکتی تدریس (Team Teaching) :

مڈل جماعتوں کے لیے معاشرتی علوم کا نصاب تاریخ ، جغرافیہ ، شہریت ، معاشیات اور عمرانیات پر مشتمل ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس سطح پر معاشرتی علوم پڑھانے والے اساتذہ ان سب مضامین میں سوجھ بوجھ رکھتے ہوں ۔ ایک استاد کے لیے خواہ وہ کتنا ذہین اور محنتی ہی کیوں نہ ہو ایک ہی وقت میں اتنے سارے مضامین پر یکساں عبور رکھنا ممکن نہیں ہوتا ۔ سکولوں میں بالعموم معاشرتی علوم کی تدریس کے لیے ایسے روایتی طریقے استعمال کیے جاتے ہیں جن سے نہ صرف تدریس غیر دلچسپ اور غیر موثر ہوتی ہے بلکہ ان مقاصد کی تکمیل بھی نہیں ہو پاتی جن کے حصول کے لیے یہ مضمون پڑھایا جاتا ہے ۔

معاشرتی علوم کی تدریس کو کامیاب اور پائیدار بنانے کے لیے ایک موثر طریقہ شراکتی تدریس کا ہے ۔ اس طریقے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اگر سکول کے اوقات میں کسی درجے کے طلبہ کو دو یا دو سے زیادہ استاد مل کر تمام یا کچھ مخصوص اسباق پڑھائیں تو اسے شراکتی تدریس کہتے ہیں اور مل کر پڑھانے والے استاد ٹیم (Team) کہلاتے ہیں ۔ یہ طلبہ اور استاد کے کام کو منظم کرنے کا ایک نیا طریقہ ہے جس میں اساتذہ کی انفرادی قابلیت ، دلچسپیوں اور مخصوص تربیت سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے ۔ ٹیم میں اساتذہ کی تعداد کا تعلق جماعت کے سائز ، مضمون کے مقاصد اور پڑھانے کے لیے دستیاب سہولتوں سے ہوتا ہے ۔ اساتذہ کی ٹیم مل کر تدریس کا منصوبہ بناتی ہے اور اس کی تکمیل کرتی ہے ۔ اس کے علاوہ یہ ٹیم طلبہ کے کام کا جائزہ لیتی ہے اور اپنی تدریس کو نئے نئے وسائل سے دلچسپ ،

موثر اور پائیدار بنانے کی کوشش کرتی رہتی ہے ۔ شراکتی تدریس کی بنیاد اس امر پر ہے کہ ہر استاد کسی مخصوص صلاحیت کا مالک ہوتا ہے ۔ جب بہت سے استاد تدریس کے عمل میں شریک ہوں گے تو تو ان کی خصوصی صلاحیتیں مل کر تدریس و تعلم کے معیار کو بلند کر دیں گی ۔

شراکتی تدریس کے بنیادی عناصر تین ہیں ۔

۱۔ تغیر پذیری **(Variability)** ۔

۲۔ تفرید **(Individualization)** ۔

۳۔ مشترکہ منصوبہ بندی **(Team Planning)** ۔

شراکتی تدریس پڑھانے کا کوئی مخصوص طریقہ نہیں بلکہ تدریس کی ایک تنظیمی شکل ہے ۔ اس تنظیمی شکل میں کوئی سا تدریسی طریقہ استعمال کیا جا سکتا ہے جسے ماہر مضمون مقاصد کے حصول کے لیے موزوں خیال کرتا ہو ۔ تنظیمی شکل بھی موقع محل کے مطابق بدلتی رہتی ہے ۔

شراکتی تدریس کے پروگراموں میں طلبہ کی تعداد ، ان کے بیٹھنے کی جگہ ، پڑھانے کا وقت اور استاد بدلتے رہتے ہیں ۔ ان تغیرات کا مقصد ایک ایسا مکمل تعلیمی ماحول مہیا کرنا ہوتا ہے جس سے انفرادی تدریس ممکن ہو سکے ۔ ٹیم میں شامل اساتذہ طلبہ کے چھوٹے بڑے گروہوں اور افراد کے ساتھ کام کرتے ہیں ۔ گروپ کی تعداد کے لحاظ سے کمرہ جماعت بھی بدلتا رہتا ہے ۔ اوقات تدریس میں کمی بیشی گروہوں یا افراد کی ضروریات کے مطابق کی جاتی ہے ۔ شراکتی تدریس کو کامیاب بنانے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی ضرورت ہے ۔ تمام ٹیموں کی طرح تدریسی ٹیم کا بھی ایک لیڈر ہوتا ہے لیکن یہ لیڈر موقع محل کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں ۔ تدریسی ٹیم کے ممبران عہدہ ، مرتبہ اور ذمہ داری میں برابر ہو سکتے ہیں ۔ ان کی ذمہ داریاں اور رتبے مختلف بھی ہو سکتے ہیں لیکن لیڈرشپ ہمیشہ وقتی اور موقعاتی **(Situational)** ہوتی ہے ۔

شراکتی تدریس کی دو صورتیں ہیں :

۱۔ مختلف مضامین کے لوگ مل کر سبق پڑھائیں ۔

۲۔ ایک ہی مضمون کے لوگ مل کر سبق کی تدریس میں حصہ لیں ۔

مڈل جماعتوں کو معاشرتی علوم پڑھاتے وقت دونوں صورتیں استعمال کی جا سکتی ہیں ۔ اگر سکول یک فریقی ہے اور ایک ہی استاد چھٹی ، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کو معاشرتی علوم پڑھا رہا ہے تو اس صورت میں مختلف مضامین پڑھانے والے اساتذہ شراکتی تدریس کے ذریعہ معاشرتی علوم کی تدریس کو موثر اور پائیدار بنا سکتے ہیں ۔ فرض کیجیے کہ معاشرتی علوم پڑھانے والے استاد کو جغرافیہ کی تدریس میں خصوصی مہارت حاصل ہے ۔ انگریزی کا استاد شہریت پر دسترس رکھتا ہے اور اسلامیات کے استاد کو تاریخ پر عبور حاصل ہے تو معاشرتی علوم کی تدریس میں ان اساتذہ کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا

جا سکتا ہے۔ اور ان اساتذہ کی ٹیم بنائی جا سکتی ہے جو مل کر سکول میں معاشرتی علوم کی تدریس کی منصوبہ بندی کریں اور نصاب کے ان حصوں کو فرداً فرداً پڑھائیں جن میں ان کو خصوصی مہارت حاصل ہے۔ ٹیم یہ بات پہلے سے طے کرتی ہے کہ کس ٹیم کے رکن کو نصاب کا کون سا حصہ پڑھانا ہے لیکن اگر سکول میں ایک درجہ مختلف فریقوں میں بٹا ہوا ہے اور مختلف اساتذہ ہر فریق کو الگ الگ معاشرتی علوم پڑھاتے ہوں تو ان کی ٹیم بھی بنائی جا سکتی ہے جو سب فریقوں کو اکٹھا کر کے معاشرتی علوم پڑھائیں گے اس صورت میں شراکتی تدریس کا تنظیمی خاکہ کچھ اس طرح ہوگا۔

تنظیمی خاکہ :

ٹیم میں شامل اساتذہ مل کر معاشرتی علوم کی تدریس کی منصوبہ بندی کریں گے۔ ٹیم کا رکن نصاب کے جس حصہ پر مکمل دسترس رکھتا ہوگا صرف وہی حصہ پڑھائے گا۔ مثلاً اگر ٹیم کا ایک رکن تاریخ میں خصوصی مہارت رکھتا ہے تو بجائے اس کے وہ اپنی جماعت کو معاشرتی علوم کا تمام نصاب پڑھائے وہ صرف تاریخ کا حصہ سب فریقوں کو اکٹھا پڑھائے گا۔ جغرافیہ کا حصہ وہ رکن پڑھائے گا جسے جغرافیہ پر عبور حاصل ہوگا اور شہریت کا حصہ وہ استاد پڑھائے گا جو شہریت میں درک رکھتا ہوگا اس طرح ایک فریق ایک استاد کی بجائے تین اساتذہ سے نصاب کا وہ حصہ پڑھے گا جن میں انھیں خصوصی مہارت حاصل ہوگی۔

درجہ کے تمام فریقوں کو کسی بڑے کمرے میں اکٹھا کیا جائے گا۔ اساتذہ کی ٹیم وہاں پر موجود ہوگی جس رکن نے سبق پڑھانا ہو گا اس وقت وہی ٹیم کا لیڈر ہو گا اور ٹیم کے باقی ارکان اس کے معاون ہوں گے۔

کمرے میں تدریس کے لیے دستیاب تمام وسائل تختہ سیاہ، نقشہ جات، چارٹ، تصاویر، مائیکروفون (اگر ممکن ہو) موجود ہونے چاہئیں۔ چونکہ طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے اس لیے کوشش کی جائے کہ آواز تمام طلبہ تک پہنچ سکے اور نظم و ضبط کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔

ماہر مضمون جو اس وقت ٹیم کا لیڈر بھی ہوتا ہے پندرہ بیس منٹ تک اپنے موضوع کو متعارف کراتا ہے۔ تصورات کی وضاحت کرتا ہے اور طلبہ کے سوالات کے جواب دیتا ہے جس سے بچوں کے ذہن میں کام کا خاکہ بن جاتا ہے۔

موضوع کے متعلق معلومات دینے کے بعد طلبہ کو چھوٹے گروپوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ کسی گروپ میں پندرہ سے زائد طلبہ نہیں ہوتے۔ یہ گروپ الگ الگ کمروں میں اگر ممکن ہو چلے جاتے ہیں۔ اور گروپ ٹیم کے ارکان کی زیر نگرانی اسی موضوع پر خود کام کرتے ہیں اور بحث و مباحثہ کے ذریعے تعلیم کو مؤثر اور پائیدار بناتے ہیں۔ کوئی مشکل در پیش ہو تو اساتذہ ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ہر گروپ کو سامان تدریس اور مطلوبہ سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔

فوائد :

۱- شراکتی تدریس میں اساتذہ منصوبے بنانے اور کام کرنے میں تعاون اور اشتراک عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں اس لیے ان کی انفرادی استعداد اور خصوصی صلاحیتوں سے طلبہ کو بہت فائدہ پہنچتا ہے -

۲- طلبہ چونکہ چھوٹے چھوٹے گروپ میں کام کرتے میں اس لیے استاد ان پر انفرادی توجہ دیتے ہیں اور نتیجہ پائیدار تعلیم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے -

۳- شراکتی تدریس سے اساتذہ بھی بہت کچھ سیکھتے ہیں - ہر استاد اپنے حصے کے نصابی مواد کا مطالعہ بڑی محنت سے کرتا ہے - چونکہ اسے ٹیم کے دیگر ارکان کی موجودگی میں پڑھانا ہوتا ہے اس لیے دوسروں سے سبقت لے جانے کی کوشش میں خاص تیاری کے بعد پڑھاتا ہے جس سے تدریس کا معیار بلند ہو جاتا ہے -

۴- مؤثر تیاری اور سمعی بصری مواد کے استعمال کی وجہ سے طلبہ اس طریقہ تدریس کو روائتی طریقوں سے زیادہ وقعت دیتے ہیں اور اس میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں -

۵- اس طریقے میں طلبہ کو اساتذہ کی ٹیم سے بات چیت کرنے ، سوال پوچھنے اور مشکل مسائل حل کرنے کے مواقع زیادہ ملتے ہیں -

۶- طلبہ طبعاً تنوع پسند ہوتے ہیں - اس طریقے میں اساتذہ بدلتے رہتے ہیں اور طلبہ تدریسی سرگرمیوں میں بھر پور حصہ لیتے ہیں جس سے جماعت میں یکسانیت اور اکتاہٹ کا ماحول پیدا نہیں ہوتا اور طلبہ زیادہ انہاک اور دلچسپی سے تعلیم حاصل کرتے ہیں -

۷- مبتدی استاد ، تجربہ کار اساتذہ کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے - جس سے اسے تدریس کی ابتدائی مشکلات پر قابو پانے میں بڑی مدد ملتی ہے -

مشکلات :

پاکستان میں شراکتی تدریس کو اپنانے کے راستے میں کچھ مشکلات حائل ہیں جن پر صحیح منصوبہ بندی اور شراکتی ٹیم کے ارکان کے درمیان دلی تعاون کے ذریعے قابو پایا جا سکتا ہے :

۱- ٹیم میں شامل تمام اساتذہ تدریس میں مؤثر طور پر حصہ نہیں لیتے - اکثر اساتذہ اپنے ساتھیوں کے سامنے پڑھانے سے گریز کرتے ہیں اور ان خیالات ، تجاویز اور تنقید کو برداشت نہیں کرتے جو تدریس کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہوتی ہیں -

۲- ہمارے سکولوں میں ماہرین مضمون کی قلت ہے اور ان وسائل کی بھی کمی ہے جن کی مدد سے شراکتی تدریس کو موثر اور دلچسپ بنایا جا سکتا ہے -

۳- شراکتی تدریس کے لیے جس قسم کی عمارات کی ضرورت ہوتی ہے ہمارے سکول ان کے مطابق تعمیر نہیں کیے جاتے - اس کے علاوہ شراکتی تدریس کے لیے پڑھانے کا چونکہ وقت متعین نہیں ہوتا اور

اس میں موقع محل کے مطابق کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اس لیے ٹائم ٹیبل کی تیاری میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔

یہ مشکلات ایسی نہیں جن پر قابو نہ پایا جا سکے اگر انتظامیہ اور اساتذہ اس طریقے کو آزمانے کے لیے تیار ہوں تو صحیح منصوبہ بندی اور باہمی تعاون سے ان مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اساتذہ ذہنی طور پر اس طریقہ کو اپنانے کے لیے تیار ہوں۔ اس کی جزئیات سے کماحقہ واقف ہوں، ان میں خود اعتمادی ہو۔ دوسروں پر تعمیری تنقید کرنے اور اپنے اوپر تنقید برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ دوسروں کے ساتھ تعاون کے اہل ہوں اور اپنے احساسات اور رویے کی اچھی جانچ پرکھ کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

مقامی وسائل کا استعمال (Use of Community Resources):

معاشرتی علوم جیسے وسیع مضمون کی تدریس کو موثر بنانے کے لیے کمیونٹی یا مقامی وسائل سے استفادہ کرنا بڑا ضروری ہے کیونکہ عام طور پر یہ تمام وسائل براہ راست طلبہ کے مشاہدات و تجربات میں شامل ہوتے ہیں اور طلبہ کی روزمرہ زندگی کا حصہ بن چکے ہوتے ہیں۔ ان وسائل کے استعمال سے نہ صرف معاشرتی علوم کی تدریس آسان ہو جاتی ہے بلکہ طلبہ میں معاشرتی شعور بیدار کرنے کے لیے یہ ایک ٹھوس بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ یہی شعور قوموں کی ترقی کا ضامن ہے۔

کمیونٹی وسائل کی مدد سے طلبہ کو مقامی جغرافیہ کے خد و خال، آبادی میں کمی و بیشی، لوگوں کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حالات اور تاریخی پس منظر سے آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ طلبہ قریبی عجائب گھر جا کر مختلف ادوار کے متعلق معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ ملک کے لیبر قوانین کے بارے میں مقامی لیبر یونین کے تاثرات معلوم کر سکتے ہیں کسی مقامی کارخانے میں جا کر اشیاء کی پیداوار اور تقسیم کا نظام دیکھ سکتے ہیں یا ایسی ضروری معلومات اکٹھی کر سکتے ہیں جو تجارتی عمل کی وضاحت کرتی ہوں۔ مختصراً کمیونٹی وسائل کے استفادہ سے ایسے مواقع میسر آتے ہیں جن کی مدد سے طلبہ ان اسباب کو سمجھ سکتے ہیں جو معاشرتی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔

کمیونٹی وسائل کو استعمال میں لانے سے پہلے ان کا سروے کرنا ضروری ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ کون کون سے وسائل دستیاب ہیں جن سے فائدہ اٹھا کر معاشرتی علوم کی تدریس کو موثر اور پائیدار بنایا جا سکتا ہے اس طرح کا سروے طلبہ سے کرانا چاہیے اور اس میں مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھنا ضروری ہے:

* آبادی
* تاریخ
* جغرافیہ
* تجارت
* ذرائع آمد و رفت
* ذرائع مواصلات
* امتیازی خصوصیات (Landmarks)
* صحت کی سہولتیں
* معاشرتی بہبود کی سہولتیں

* حکومت	* تعلیم	* ماحول کی آلودگی کے مسائل
* وسائل	* مذاہب	* خصوصی مسائل
* صنعت و حرفت	* نسلی گروہ	* مستقبل کے پروگرام

اہمیت :

کمیونٹی وسائل کے استعمال سے معاشرتی علوم کے پروگرام میں حقیقت پسندی اور زندگی کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ بظاہر کسی مخصوص علاقے کے مطالعہ سے علاقائی اور محدود زاویہ نگاہ پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ لیکن اگر اس پروگرام کو حکمت و سلیقہ سے استعمال میں لایا جائے تو اس سے طلبہ کو معاشرے اور اس کے ڈھانچے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور نہ صرف مقامی لحاظ سے بہتر افراد پیدا ہوتے ہیں بلکہ ان کا کردار ملک اور قوم کے لیے بھی مددگار ہوتا ہے۔

طلبہ اپنی کمیونٹی میں رہنے سے براہ راست جو تجربات سیکھتے ہیں وہ انھیں معاشرتی علوم کے ان تصورات کو سمجھنے میں کافی مدد دیتے ہیں جو مڈل جماعتوں میں معاشرتی علوم پڑھانے کا اولین مقصد ہے۔ مثلاً کسی مقامی فیکٹری کا دورہ کرنے سے طلبہ کو مزدوروں کی زندگی، مشینوں کی کارکردگی، جدید ٹیکنالوجی اور مزدوروں اور انتظامیہ کے مسائل سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے جو بالاخر ان کی عملی زندگی میں سود مند ثابت ہوتی ہے اور انھیں اچھا شہری بننے میں مدد دیتی ہے اس طرح اگر طلبہ کسی ایسے پراجیکٹ کو دیکھتے ہیں جو مقامی آبادی کی حالت بہتر بنانے کے لیے شروع کیا گیا ہو مثلاً سکول کا اجرا، ہسپتال کا قیام، پینے کے پانی کی فراہمی وغیرہ، تو اس سے معاشرتی بہبود کے لیے جذبہ ابھرتا ہے ظاہر ہے محض ان پراجیکٹوں کے متعلق پڑھ لینے سے یہ جذبہ پیدا نہیں ہوگا جب تک طلبہ اپنی آنکھوں سے انھیں کام کرتا ہوا نہ دیکھ لیں۔ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے سے طلبہ میں جو اجتماعی جدوجہد اور اشتراک عمل میں یقین پیدا ہوگا وہی معاشرے کی ترقی اور خوشحالی کا ضامن ہوگا۔

کمیونٹی وسائل کے صحیح استعمال سے سکول اور مقامی لوگوں کے درمیان خوشگوار تعلقات استوار ہوتے ہیں اور وہ سکول کے پروگراموں کی بہتری کے لیے دلچسپی لینی شروع کر دیتے ہیں نتیجتاً سکول کے پروگرام زیادہ مثالی بن جاتے ہیں۔

کمیونٹی سروے کے طریقے :

کمیونٹی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے طریقے یہ ہیں :

۱۔ انٹرویو : اس کے ذریعے کمیونٹی کے با اثر لوگوں سے بالمشافہ گفتگو کر کے کمیونٹی کی اقدار، اختلافی مسائل اور لوگوں کے رجحانات کے متعلق بہتر سے بہتر اور زیادہ معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

۲- مشاہدہ : مشاہدے کی مدد سے مظاہر قدرت ، صنعتی مراکز ، عمارات وغیرہ کا بہترین جائزہ لیا جا سکتا ہے مشاہدے کی مدد سے ہم تعلیمی سیر کے دوران کئی چیزوں کے متعلق معلومات حاصل کر سکتے ہیں - موثر مشاہدے کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں ان معلومات کا علم ہو جو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں خواہ مشاہدہ اتفاقی ہو یا منظم -

۳- مسودات کا تجزیہ : مقامی اخبارات و رسائل ، لائبریری ، سکول ریکارڈ ، تھانہ کی رپورٹیں وغیرہ ایسے مسودات میں جن کے تجزیے سے کمیونٹی کے بارے میں گراں قدر معلومات حاصل ہو سکتی ہیں -

۴- سوال نامہ : سوال نامے معلومات کی نوعیت کے پیش نظر تیار کیے جاتے ہیں اور متعلقہ افراد میں تقسیم کر کے ان سے جواب حاصل کیے جاتے ہیں - ان جوابات کی روشنی میں مطلوبہ معلومات اکٹھی کی جاتی ہیں -

۵- غیر رسمی مباحثے : سر راہے لوگوں سے بات چیت کر کے خاص امور کے متعلق ان کی رائے معلوم کی جاتی ہے -

۶- فیلڈ ورک : اصلی ماحول میں لوگوں کے ساتھ کام کر کے ان کے احساسات اور مشکلات کا اندازہ لگایا جاتا ہے مثلاً کسانوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنا ، فیکٹری میں مزدوروں کے کام میں ہاتھ بٹانا وغیرہ -

کمیونٹی کے وسائل کا مکمل سروے کرنے کے بعد استاد کو ان مشکلات پر اچھی طرح غور کر لینا چاہیے جو وسائل سے استفادہ کرتے وقت پیش آ سکتی ہیں - مثال کے طور پر اگر معاشرتی علوم کا استاد طلبہ کو تعلیمی سیر کے لیے سکول سے باہر لے جانا چاہتا ہے تو اس سلسلے میں اسے ہیڈ ماسٹر سے اجازت حاصل کرنا ہوگی ، والدین کی رضا مندی لینی ہوگی اور طلبہ کے ساتھ مل کر منصوبہ بندی کرنی ہوگی یا اگر استاد کسی فاضل مقرر کو جماعت میں بلا کر طلبہ کے سامنے تقریر کرانا چاہتا ہے تو اسے ہیڈ ماسٹر کی پہلے سے اجازت لینا ہوگی اور اپنے اساتذہ کی رضا مندی حاصل کرنا ہوگی -

تعلیمی سیر (Study trips) :

معاشرتی علوم کی تدریس کا سب سے بڑا مقصد طلبہ کو مقامی معاشرہ کے مسائل سے آگاہ کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ ان مسائل کا مشاہدہ کر کے خود ان کا حل تلاش کر سکیں - اس مقصد کے حصول کے لیے تعلیمی سیر اہم کردار ادا کرتی ہے - تعلیمی سیر کے دوران مشاہدے کے ذریعے حاصل کی گئی معلومات کا جب طلبہ موازنہ اور تجزیہ کرتے ہیں تو ان میں تنقیدی انداز فکر پیدا ہوتی ہے جس سے مسائل حل کرنے میں مدد ملتی ہے -

تعلیمی سیر اور عام سیر میں نمایاں فرق یہ ہے کہ تعلیمی سیر کا کوئی تعلیمی مقصد ہوتا ہے -

تعلیمی سیر کی میعاد ایک پیریڈ، ایک دن یا کئی دن ہو سکتی ہے۔ ایک پیریڈ کی تعلیمی سیر میں طلبہ نزدیک ترین کھیتوں میں فصل کی بوائی یا کٹائی دیکھنے، ٹریفک کے حادثے کی جگہ کا معائنہ کرنے، زمین کے کٹاؤ کا مشاہدہ کرنے، کسی پرانی عمارت کے طرزِتعمیر کا جائزہ لینے یا مقصدی بیماریوں کے انسداد کے لیے احتیاطی تدابیر دیکھنے کے لیے ہسپتال جا سکتے ہیں۔ اس قسم کی غیررسمی سیر کی منصوبہ بندی بڑی آسان ہوتی ہے۔ اس میں وقت کی بچت ہوتی ہے، تنظیمی مشکلات بھی کم پیش آتی ہیں اور طلبہ اپنے ماحول کا زیادہ تنقیدی نگاہ سے مشاہدہ کرتے ہیں۔

ایک دن کی سیر کا مقصد مقامی معاشرہ کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔ اس سیر میں مندرجہ ذیل مقامات دیکھے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ اس کمیونٹی میں واقع ہوں:

* شہر کی تاریخی عمارات	* اخبارات کے دفاتر	* پبلک لائبریری
* ہوائی اڈہ	* پبلک پارکس	* عجائب گھر
* بنک	* ڈاک خانہ	* ہسپتال
* پولٹری یا ڈیری فارم	* بجلی گھر	* پولیس سٹیشن
* بندرگاہ کی گودیاں	* زراعتی فارم	* ٹیلیفون ایکسچینج
* کارخانے	* آگ بجھانے کا سٹیشن	* چڑیا گھر
* عدالتیں	* ریڈیو سٹیشن	* واٹر سپلائی کا مرکز
* اسمبلی کا اجلاس	* ٹیلی ویژن اسٹیشن	* پولنگ سٹیشن
* میونسپل کمیٹی کا دفتر		

ان کے علاوہ مقامی معاشرہ کی آبادی کو کام کرتے دیکھنے کا پروگرام بھی بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً کسانوں کو کھیتی باڑی کرتے، جولاہے کو کپڑا بنتے، دکاندار کو سودا بیچتے اور موچی کو جوتا بناتے وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح مقامی حالات کا جائزہ لینے کے لیے بازار، گلی، کوچے اور نالیوں کی صفائی کا انتظام، گندے پانی کے نکاس کا انتظام، صحت، تعلیم اور رہائش کی سہولتیں وغیرہ بیشمار ایسے موضوعات ہیں جن کا براہ‌راست مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور ضروری بھی۔

ایک دن کی تعلیمی سیر رسمی ہوتی اور اس کے لیے ہیڈ ماسٹر کی منظوری اور باقی اساتذہ کی حمایت حاصل کرنا ہوگی۔ قبل از وقت منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت ہوگی۔ سیر کے مقاصد سے طلبہ کو آگاہ کرنا ہوگا۔ جس جگہ کو دیکھنے طلبہ جا رہے ہیں وہاں کے انچارج یا منیجر کو پہلے سے اطلاع دینی ہوگی کہ طلبہ کی کتنی تعداد کس ذریعے سے کون سی تاریخ کو کس وقت پہنچ رہی ہے اور ان کے آنے کا مقصد کیا ہے اور طلبہ وہاں کتنا عرصہ ٹھہریں گے۔ تاکہ انچارج یا منیجر کو علم ہو کیا کیا باتیں طلبہ کو بتانی ہیں۔ طلبہ کے پاس نوٹ بکیں ہونی چاہئیں جن میں وہ ضروری معلومات

درج کریں تاکہ واپسی پر نوٹ بکوں کی مدد سے سیر کی رپورٹ تیار کی جا سکے۔

کئی دنوں میں مکمل ہونے والی تعلیمی سیر کے لیے ٹھوس منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے ہیڈ ماسٹر کی اجازت اور ساتھی اساتذہ کی حمایت کے علاوہ تعلیمی سیر کے لیے جانے کے خواہشمند طلبہ کے والدین سے شرکت کے لیے تحریری اجازت حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ کسی ناگہانی حادثہ کی صورت میں استاد اور سکول دونوں کا تحفظ ممکن ہو سکے۔

سب سے اچھی بات یہ ہوگی کہ تعلیمی سیر کی تجویز طلبہ کی طرف سے آئے اور پوری جماعت اس تجویز کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح بحث کرکے سیر کے تعلیمی مقاصد کا تعین کرے۔ مقاصد کے تعین کے بعد سیر کا انتظام کرنے کے لیے طلبہ کی کمیٹیاں بنا لینی چاہئیں۔ طلبہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ سیر کے سلسلہ میں وہ کہاں جائیں گے، کن لوگوں سے ملیں گے، کہاں ٹھہریں گے، آمد و رفت کے وسائل کیا ہوں گے، رہائش اور کھانے کا انتظام کیا ہوگا۔ اس سلسلہ میں پیسے اکٹھے کرنا، حساب کتاب رکھنا، سکول سے امداد لینا یہ تمام انتظامات طلبہ کی مختلف کمیٹیوں کے سپرد کرائے جائیں۔ طلبہ اپنی نوٹ بکس اپنے ساتھ لے جائیں جن میں ضروری معلومات لکھتے جائیں تاکہ واپسی پر ان کی مدد سے مفصل رپورٹ تیار کی جا سکے۔ واپسی پر جماعت میں پھر آزادانہ بحث ہو تاکہ طلبہ ایک دوسرے کے نقطہ نظر سے آگاہ ہو سکیں اور اگر کسی کو کوئی بات اچھی طرح سمجھ نہیں آئی تو وہ اسے سمجھ لے۔ پھر آخر میں سیر کے انتظامات کا جائزہ لیا جائے تاکہ اگر کوئی خامی رہ گئی ہو تو آئندہ اس کا اعادہ نہ ہو۔

تعلیمی سیر کے انعقاد سے جمہوری طرز عمل کی کافی تربیت حاصل ہو جاتی ہے جو کہ معاشرتی علوم کی تدریس کا ایک اہم مقصد ہے کیونکہ سیر کو کامیاب بنانے میں ہر ایک کو کچھ نہ کچھ کرنا ہوتا ہے اور بالآخر تمام کو احساس ہو جاتا ہے کہ یہ سیر پایہ تکمیل تک نہ پہنچتا اگر تمام مل کر اپنا کام خوش اسلوبی سے سرانجام نہ دیتے۔

شخصی وسائل (Resource Persons) :

شخصی وسائل سے مراد ایسے افراد ہیں جو یا تو کسی کام کو کرنے کا وسیع تجربہ رکھتے ہوں یا کسی چیز کے متعلق ان کی معلومات ذاتی تجربہ پر مبنی ہوں، مثال کے طور پر اگر طلبہ پاکستان میں زراعت کے مسائل کے متعلق پڑھ رہے ہیں اور استاد ایک ایسے کسان کو جماعت میں لا کر طلبہ کے ساتھ زراعت کے مسائل پر بات چیت کرنے کی دعوت دیتا ہے جو ان مسائل سے دوچار رہا ہو اور جس نے کامیابی کے ساتھ ان پر قابو پا لیا ہو تو وہ کسان اس سبق کے لیے شخصی وسیلہ ہوگا اسی طرح اگر استاد سعودی عرب کے لوگوں کے متعلق پڑھا رہا ہے اور وہ کسی ایسے شخص کو جماعت میں آکر طلبہ کو سعودی عرب کے لوگوں کے متعلق بتانے کی دعوت دیتا ہے جو حال ہی میں حج کرکے آیا ہو یا جو

کچھ عرصہ سعودی عرب میں رہ چکا ہو تو وہ شخص اس سبق میں شخصی وسیلہ ہوگا ۔ اس قسم کے شخصی وسائل معاشرتی علوم کی تدریس کو بامعنی ، دلچسپ اور متنوع بنا دیتے ہیں ۔ کسی مقامی معاشرہ میں کس طرح کے شخصی وسائل دستیاب ہیں ۔ اس کا دارو مدار اس بات پر ہے کہ معاشرہ کس قسم کا ہے ۔ معاشرتی علوم کے استاد کو بہر حال تمام ممکنہ شخصی وسائل سے تدریس کے دوران فائدہ اٹھانے کے لیے تیار رہنا چاہیے ۔ یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے اگر استاد کے پاس پہلے سے شخصی وسائل کی لسٹ موجود ہوگی ۔ اگر کوئی ایسا شخص جماعت میں نہ آ سکتا ہو یا اگر اسے اپنے اصلی ماحول میں کام کرتے ہوئے دیکھنا زیادہ سودمند ہو تو اس صورت میں ایک طالب علم یا طلبہ کا ایک چھوٹا گروپ اس کا انٹرویو لے سکتا ہے اور انٹرویو کی رپورٹ پوری جماعت کے سامنے پیش کی جانی چاہیے ۔ شخصی وسائل کو مہمان مقررین (Guest speakers) بھی کہتے ہیں ۔

سمعی و بصری مواد کا استعمال

معاشرتی علوم پڑھاتے وقت استاد ایسا مواد استعمال کرتا ہے جو تدریس کو دلچسپ بنا دے اور تصورات کو صاف واضح کر دے ۔ اس مواد میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں ۔

۱۔ اصل اشیاء (Realis) اصل چیزوں کے ہوبہو ماڈل ، نمائشیں اور مظاہرے ۔

۲۔ سمعی مواد ۔ فلم ، ٹیلویژن ، ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر ۔

۳۔ ہر قسم کی تصویریں ، سلائیڈیں ، متحرک تصویریں ۔

۴۔ چاک بورڈ ، بلیٹن بورڈ ۔

۵۔ چارٹ ، پوسٹرز ، کارٹون ، گراف اور ٹائم لائنز ۔

اصل اشیاء یا ان کی ہوبہو نقول :

اصل اشیاء سے مراد زیورات ، سکے ، برتن ، اوزار ، ہتھیار ، کپڑے ، مسودات ، خطوط اور مہریں وغیرہ ہیں ۔ معاشرتی علوم کی تدریس کے لیے ان چیزوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ مثلاً علامہ اقبال یا حضرت قائد اعظم کے خطوط اگر طلبہ پڑھیں تو ان پر تحریک پاکستان کے بہت سے ایسے پہلو واضح ہو جائیں گے جو استاد شاید کئی اسباق میں سمجھا نہ سکا ہو اسی طرح وادیٔ سندھ کی تہذیب کے متعلق زیادہ‌تر تعلومات ان زیورات ، برتنوں ، اوزاروں اور مہروں سے اخذ کی گئی ہیں جو موہنجوڈیرو کی کھدائی میں ملی تھیں ۔ بعض اوقات اصل اشیاء کی بجائے ان کی ہوبہو نقول (Replicas) تیار کرکے تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کی جاتی ہیں ۔ ٹیکسلا کے عجائب گھر میں ناچنے والی لڑکی کا مثنیٰ رکھا ہوا ہے جو ایک گڑیا کو اس زمانے کا لباس اور زیورات پہنا کر بنایا گیا ہے ۔ جس سے طلبہ کو زمان و مکان کے فرق کے ساتھ اسے سمجھنے میں آسانی رہتی ہے ۔ ان اشیاء کو استعمال کرتے وقت استاد کو طلبہ کے سوالات اور تبصروں کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے ۔

نمائش :

معاشرتی علوم میں نمائشیں بہت سے مواد کو دکھانے کے لیے لگائی جاتی ہیں - مثال کے طور پر ذرائع آمد و رفت کا مطالعہ کرتے وقت کشتیوں ، بیل گاڑیوں ، رتھوں ، موٹر گاڑیوں ، ہوائی جہازوں ، بحری جہازوں اور ریل گاڑیوں کی تصاویر اور ماڈلز کی نمائش لگا کر دکھایا جا سکتا ہے - اسی طرح سعودی عرب کا مطالعہ کرتے وقت تیل نکالنے کے عمل سے لے کر پٹرولیم کی مصنوعات کی تیاری تک کے لیے تمام مراحل کی نمائش تصاویر اور ماڈلز سے کی جا سکتی ہے - نمائش دیکھنے والوں کے سوالات کا جواب دینے یا کسی بات کی وضاحت کرنے کے لیے نمائش میں حصہ لینے والے طلبہ کو موقع پر موجود رہنا چاہیے -

فلم :

فلموں کے ذریعے واقعات کی بڑی عکاسی کی جا سکتی ہے اور یہ معاشرتی علوم کی تدریس کے لیے وسیع پیمانے پر استعمال کی جا سکتی ہیں - مثلاً اگر پاکستان میں کپڑے کی صنعت کی ترقی کے مختلف مراحل فلم کے ذریعے طلبہ کو دکھائے جائیں تو وہ ملک میں کپڑے کی صنعت کے ابتدائی مراحل ، ترقی اور صنعت کو درپیش موجودہ مسائل کو خام مال ، مشینری ، لیبر ، پیداوار ، لاگت وغیرہ کے حوالے سے بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے - کوئی فلم دکھانے کے بعد استاد کو ان تصورات کی وضاحت کرنی چاہیے جو طلبہ کو بتانا چاہتا تھا اور جنہیں واضح کرنے کے لیے فلم دکھائی گئی تھی -

ٹیلیویژن اور ریڈیو :

ٹیلیویژن اور ریڈیو پروگرام معاشرتی علوم کے مقاصد کے حصول میں بڑی مدد دیتے ہیں - قومی تقریبات کو ٹیلی ویژن سے براہ راست نشر کرکے طلبہ پر ان کی افادیت اور اہمیت واضح کی جا سکتی ہے - مثلاً ۲۳ مارچ کو یوم پاکستان کے سلسلے میں ہونے والی تقریبات کو طلبہ جب ٹیلی ویژن سے نشر ہوتا دیکھیں گے تو ان کو ایسا محسوس ہوگا جیسے وہ خود ان تقریبات میں حصہ لے رہے ہیں - جس سے اس قومی واقعہ کی اہمیت ان کے ذہن پر پوری طرح نقش ہو جائے گی - اس طرح ملک کے مختلف حصوں میں رہنے والے لوگوں کے متعلق جب طلبہ ٹیلی ویژن پروگرام دیکھیں گے تو ان حالات اور مسائل سے آگاہ ہو کر ان کے درمیان اخوت اور یگانگت بڑھے گی - ریڈیو نشریات مثلاً سکول براڈ کاسٹ ، بچوں کا پروگرام حالات حاضرہ پر تبصرہ ، معلوماتی پروگرام (Quiz Programme) مشاعرے ، مباحثے وغیرہ ایسے پروگرام ہیں جو ہر عمر کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں -

ٹیلی ویژن اور ریڈیو نشریات سے پہلے استاد کو چاہیے کہ طلبہ کو نشری پروگرام کے بارے میں ضروری باتیں بتائے اور پروگرام دیکھنے یا سننے کے بعد سوال ، جواب کی شکل میں جماعت میں بحث کی جائے تاکہ نشری پروگرام کی معلومات میں جو کمی رہ گئی ہو استاد اسے دور کر سکے -

ٹیپ ریکارڈر :

معاشرتی علوم پڑھانے کے لیے ٹیپ ریکارڈر بھی ایک اہم وسیلہ ہیں جسے استعمال کرکے تدریس کو پائیدار اور دلچسپ بنایا جا سکتا ہے۔ یہ طلبہ کے لیے دلچسپی کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔ ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے استاد اپنا تدریسی انداز ریکارڈ کرکے اپنی خامیوں کے بارے میں صحیح اندازہ لگا سکتا ہے۔ طلبہ سبق کے اہم حصوں کو بار بار ٹیپ کی مدد سے سن سکتے ہیں اور اہم نکات پر ٹیپ روک کر بحث کر سکتے ہیں جس سے تدریس کے مواقع بہت بہتر ہو جاتے ہیں۔ ٹیپ ریکارڈر میں بہت سے اہم سبق ڈرامے ، تقاریر وغیرہ محفوظ کی جا سکتی ہیں اور جب موقع ہو انھیں دوبارہ سنا جا سکتا ہے۔

ساکن تصاویر (Still Pictures) :

تصاویر بہت ہی سستے بصری مواد میں شامل ہوتی ہیں۔ انھیں آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور جب اصل اشیا یا ان کے ماڈل فراہم نہیں ہوتے تو ایسی صورت میں اشیاء کی تصاویر استعمال کی جا سکتی ہیں۔ اگر استاد پن بجلی کے منصوبوں یا پاکستان کی دستکاریوں یا کسی مشہور شہر کے بارے میں پڑھانا چاہتا ہے تو تصویروں کے ذریعے مفید اور مکمل معلومات دے سکتا ہے۔ تصاویر دکھانے سے پہلے تصدیق کر لینی چاہیے کہ یہ اصل کی ہوبہو نقل ہے۔ اسی طرح تصویریں سائز میں بڑی رنگین اور دلکش ہونی چاہییں تاکہ طلبہ انھیں واضح طور پر دیکھ سکیں اور ان سے لطف‌اندوز ہو سکیں۔ استاد کو اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ تصویروں کی اپنی ایک تعلیمی افادیت ہے اور یہ نصابی مواد کی تشریح کے لیے انتہائی موزوں ہیں۔

پوسٹرز :

کسی خیال کو ایک ہی نگہ میں دوسرے تک پہنچانے کے لیے پوسٹر تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد کسی خیال ، موضوع یا سرگرمی کا فوری اور دیرپا اثر چھوڑنا ہوتا ہے۔ اچھے پوسٹر کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک ہی خیال کو کسی عنوان کے تحت واضح طور پرزوردار اور پرکشش انداز میں پیش کرتا ہے۔ معاشرتی مسائل کی طرف توجہ دلانے کے لیے پوسٹرز کو استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر معاشرتی برائیوں جیسا کہ رشوت ، ذخیرہ اندوزی اور سمگلنگ کے خلاف عوام کی توجہ دلانے کے لیے پوسٹرز کا استعمال کیا جا رہا ہے۔

کارٹون :

مزاح ، مزاحیہ خاکوں ، طنزیہ مبالغہ کے ذریعے کسی خیال کی جلد تشہیر کو کارٹون کہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے کچھ اشارات استعمال کیے جاتے ہیں۔ جن کا مفہوم عام لوگ سمجھتے ہوتے ہیں۔ ان کی مدد سے تاریخی واقعات اور موجودہ مسائل کو اچھی طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔ استاد کو چاہیے کہ طلبہ سے کارٹون کی ان باتوں کی نشاندہی کرائے جن میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور ان کی وضاحت کرائے۔

گراف :

گراف عددی معلومات دینے کا سب سے مفید ذریعہ ہیں۔ یہ کسی مواد کی وضاحت نقطوں، لکیروں، یا شکلوں سے کرتے ہیں ۔ گراف پر ایک نظر ڈالنے سے مختلف چیزوں کا آپس میں مقابلہ ، موازنہ اور تناسب فوراً سمجھ میں آ جاتا ہے ۔ یوں تو گراف کئی قسم کے ہوتے ہیں لیکن عموماً لائن گراف ، بار گراف اور تصویری گراف استعمال کیے جاتے ہیں ۔ سادہ لکیروں سے مقدار ظاہر کرنے کے لیے لائن گراف استعمال کیے جاتے ہیں۔ پیداوار میں کمی بیشی لائن گراف یا بار گراف کے ذریعے ظاہر کی جاتی ہے ۔ تصویری گراف مختلف علاقوں کی پیداوار یا آبادی کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں مثلاً اگر ہم پاکستان کے مختلف حصوں کی آبادی ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو ہر صوبے کے سامنے مختلف تعداد میں آدمیوں کی شکلیں بنا دیں گے ۔ نیچے پیمانہ لکھ دیں گے ۔ ایک آدمی — ایک لاکھ ۔ اب ہر صوبے کے سامنے آدمی کی جتنی تصویریں ہوں گی ان سے آبادی کا اندازہ ہوگا ۔

گوشوارے :

معاشرتی علوم میں گوشوارے پیداوار ، قیمتوں ، درآمد ، برآمد ، آبادی وغیرہ کے موازنہ کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں ۔ گوشواروں کی مدد سے گراف بنائے جاتے ہیں لہذا گوشواروں کو متعلقہ گراف کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ استاد کا فرض ہے کہ طلبہ کو گوشوارے پڑھنے اور ان کی تعمیم کرنے کی بھی تربیت دے ۔

چارٹس اور ٹائم لائینز :

ٹائم چارٹس اور ٹائم لائینز زمانی تعلقات کو واضح کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً ایک ٹائم چارٹ پر تحریک پاکستان میں بھر پور حصہ لینے والی شخصیتوں کے نام اور کام سن وار لکھنا ۔ چارٹ سادہ اور واضح ہونے چاہئیں ۔ استاد خود تیار کرے اور طلبہ سے بھی چارٹ تیار کرائے ۔ چارٹس کا مقصد سبق کے مواد کو واضح کرنا ہوتا ہے ۔

نقشے :

نقشے سطح زمین کو لکیروں کی صورت میں پیش کرتے ہیں ۔ یہ کسی جگہ یا ملک کی جسامت شکل اور موقع کو ظاہر کرتے ہیں ۔ یہ آبادی خشکی ، تری ، جانور ، زرعی پیداوار ، موسم ، معاشی وسائل وغیرہ کی صحیح اور واضح تصویر پیش کرتے ہیں ۔ نقشے طلبہ کو دنیا کے بارے میں وہ معلومات دیتے ہیں جو استاد کی باتوں سے ممکن نہیں ۔ نقشے کی تعلیمی اہمیت کے پیش نظر استاد کا فرض ہے کہ طلبہ کو نقشے کا مطالعہ کرنا سکھائے ۔ خاکوں کو پر کرنے اور اپنے ہاتھوں سے نقشے بنانے کی مشق کرائے تاکہ اپنے ماحول اور دنیا کے بارے میں وہ مفید معلومات فراہم کر سکیں ۔ گلوب بھی نقشے کی ہی ایک بہتر شکل ہے ۔ ماہرین تعلیم گلوب کو نقشے پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اس کی شکل زمین کی طرح گول ہوتی ہے اور اس کی مدد سے کئی معلومات زیادہ صحیح ، واضح اور ٹھوس انداز میں طلبہ کو دی

جا سکتی ہیں۔

جستجوئی طریق
(INQUIRY APPROACH)

جستجوئی طریقہ تدریس سے مراد طلبہ کو ایسا ماحول مہیا کرنا ہے جس میں وہ آزادانہ طور پر جستجو کر سکیں، استاد کی بتائی ہوئی باتوں کو حتمی تصور کرنے کی بجائے ازخود حقائق و واقعات کو معلوم کرنے کی کوشش کر سکیں اور ان کا تجزیہ کر سکیں، ان سے نتائج اخذ کر سکیں اور ان کو شواہد کی روشنی میں قبول کر سکیں۔ یہ اس صورت میں ممکن ہوگا اگر طلبہ میں ایسی صلاحیتیں ہوں جو تخلیقی سوچ کی نشو و نما کرتی ہوں اور تنقیدی انداز فکر کی تربیت دیتی ہوں۔ جستجوئی طریقہ تدریس میں طلبہ میں ان صلاحیتوں کو پیدا کرنے کے لیے درج ذیل عمل پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔

۱۔ یاد کرنا (Recalling) :

زیر مطالعہ موضوع کے متعلق سابقہ تجربات و معلومات میں سے ایسی باتیں یاد کرنا جو شکوک و شبہات، غلط فہمیاں اور تعصبات دور کرنے میں مفید ثابت ہوں۔

۲۔ مشاہدہ کرنا (Observing) :

مشاہدہ مقصد کو ذہن میں رکھ کر صرف متعلقہ اشیاء کا کرنا چاہیے۔ مشاہدہ کرنے والے کو علم ہونا چاہیے کہ اسے کس چیز کی تلاش ہے۔ دیکھنا، سننا، چھونا، سونگھنا اور چکھنا بالواسطہ مشاہدہ کہلاتا ہے۔ کتابیں، نقشے، گراف اور چارٹ وغیرہ پڑھنا بالواسطہ مشاہدہ کہلاتا ہے۔ مشاہدے میں ذاتی احساسات کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔

۳۔ تعریف کرنا (Defining) :

تعریف سے مراد کسی لفظ، نقشے، علامت (Symbol) جملے یا مشکل کو بیان کرنا ہے۔ صحیح تعریف ہی مفہوم کا تعین کرتی ہے۔ اور یہی مزید جستجو میں مدد دیتی ہے۔

۴۔ تعبیر کرنا (Interpreting) :

اس سے مراد جمع شدہ معلومات اور مشاہدات کی وضاحت اور اہمیت بیان کرنا ہے۔

۵۔ موازنہ/ مقابلہ کرنا (Comparing / Contrasting) :

موازنہ یا مقابلہ چیزوں کی یکسانیت یا تضاد کو ظاہر کرنا ہے۔

۶۔ درجہ بندی کرنا/ ترتیب دینا (Categorizing/Ordering) :

درجہ بندی سے مراد ایک جیسے اوصاف رکھنے والی چیزوں کو اکٹھا کرنا ہے۔ تعداد، سائز، رقبہ، قیمت وغیرہ کی مناسبت سے چیزوں کو رکھنا ترتیب دینا کہلاتا ہے۔

۷- تعمیم کرنا (Generalizing) :

اس سے مراد اعداد و شمار کی مدد سے اصول وضع کرنا ہے ۔ مثلاً یہ کہنا کہ یہودی بخیل ہوتے ہیں ۔ پٹھان مہمان نواز ہوتے ہیں ۔ یہ ایسے تصورات ہیں جو شواہد پر مبنی ہیں ۔

۸- تجزیہ کرنا (Analyzing) :

کسی چیز کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں اس لیے تقسیم کرنا تا کہ ان کے باہمی تعلقات کی نشان دہی کی جا سکے ۔

۹- مربوط کرنا (Synthesizing) :

الگ الگ اجزا کو اس طرح باہم ملانا کہ ایک مکمل بامعنی نئی شکل ابھر آئے ۔

۱۰- نتیجہ نکالنا (Inferring) :

جمع شدہ معلومات سے ایسے منطقی نتائج اور مضمرات نکالنا جو بظاہر دکھائی نہیں دیتے ۔

۱۱- مفروضے قائم کرنا (Hypothesizing) :

ایسی ممکنہ وضاحت ، حل ، تعمیم یا دعویٰ جو دو یا اس سے زیادہ چیزوں کے باہمی تعلقات کو بیان کرتا ہو مفروضہ کہلاتا ہے ۔ مفروضے مطلوبہ اعداد و شمار (Data) کے حصول یا تلاش کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں ۔ اگر شواہد سے مفروضوں کی توثیق ہو جائے تب وہ نتائج یا تعمیم بن جاتے ہیں ۔

۱۲- پیشینگوئی کرنا (Predicting) :

کسی رونما ہونے والے واقعہ کو قبل از وقت بتا دینے کو پیشنیگوئی کہتے ہیں ۔ ماضی میں موجود حالات سے مطابقت رکھنے والی معلومات کے جو نتائج نکلے ہوتے ہیں انھیں پیشنگوئی کی بنیاد بنایا جاتا ہے ۔

۱۳- جائزہ لینا (Evaluating) :

جائزہ سے مراد داخلی اور خارجی جائزہ ہے ۔ داخلی جائزے کا مقصد معیار کے مطابق رپورٹوں مسودات اور اعداد و شمار کی خوبیوں کو پرکھنا ہوتا ہے ۔ خارجی جائزہ مقاصد کی روشنی میں کیا جاتا ہے ۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مقاصد کس حد تک پورے ہوئے ہیں ۔ کیا خامیاں رہ گئی ہیں اور انھیں کس طرح دور کیا جا سکتا ہے ۔

معاشرتی علوم کے بنیادی تصورات کو واضح طور پر سمجھانے کے لیے اساتذہ مختلف تدریسی طریقے استعمال کرتے ہیں ۔ اس بات پر بڑا زور دیا جاتا ہے کہ طلبہ ان تصورات کو اپنی کوشش اور جستجو سے سیکھیں ۔ ان تصورات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے معاشرتی علوم میں تین مختلف انداز ہائے جستجو (Modes of Inquiry) اختیار کیے جاتے ہیں ۔

۱- تجزیاتی (Analytic) ۔

۲- امتزاجی (Integrative) ۔

۳۔ تحکیمی (Decision-Making)۔

تجزیاتی انداز جستجو میں کسی ایک موضوع میں شامل تصورات کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے مختلف ماحول (setting) سے معلومات اکٹھی کی جاتی ہیں۔ مثلاً گندم کی پیداوار کے متعلق کئی علاقوں اور ملکوں سے معلومات اکٹھی کی جائیں گی۔ اس کا مقصد طلبہ میں تجزیہ کرنے کی اہلیت پیدا کرنا اور انھیں تعمیم کا عمل سکھانا ہوتا ہے۔ دوسرے اعمال (Processes) جیسا کہ اعداد و شمار کی درجہ بندی کرنا، ان کی تعبیر کرنا وغیرہ موزوں تعمیمات بنانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، طلبہ پر یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ تعمیمات کے لیے انھیں بہت سی مثالوں کا مطالعہ کرنا ہوگا اور ایک ہی مثال سے تعمیم بنانے سے گریز کرنا ہوگا۔

امتزاجی انداز جستجو کا مقصد طلبہ میں ایسی صلاحیتیں پیدا کرنا ہے جن کی مدد سے وہ مخصوص ماحول کے کسی موضوع پر معلومات اکٹھی کریں۔ اعداد و شمار کا تجزیہ کرکے متعلقہ عناصر کا انتخاب کریں اور پھر انھیں باہم ملا کر لوگوں اور واقعات وغیرہ کے متعلق ایک واضح نقطہ نظر اختیار کریں۔ مثلاً بلوچستان میں زندگی گزارنا۔ اس انداز جستجو میں مربوط کرنے کے عمل پر زور دیا جاتا ہے اور دوسرے اعمال مناسب نتائج حاصل کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ امتزاجی انداز جستجو کے ذریعہ طلبہ کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہر شخص شہر، ملک وغیرہ کے اپنے مخصوص اوصاف ہوتے ہیں جو اسے دوسروں سے ممیز کرتے ہیں۔ قائداعظم صرف محمد علی جناح ہیں کوئی دوسرا قائداعظم نہیں بن سکتا ہے۔ کسی مخصوص ماحول کی مکمل تفتیش کرنے کے لیے کلیدی عناصر کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ اس سے طلبہ یہ بھی سیکھتے ہیں کہ مخصوص ماحول سے اخذ کی ہوئی تعلیمات دوسرے ماحول پر منطبق نہیں ہوتی ہیں۔

تحکیمی انداز جستجو کا مرکزی مقصد طلبہ میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ مثلاً متبادل آواز کو جانچنا، تجاویز کا جائزہ لینا، مختلف سرگرمیوں سے متوقع نتائج کی امید رکھنا وغیرہ۔ اس میں سارا زور جائزہ لینے کے عمل پر ہوتا ہے۔ دوسرے اعمال معلومات کو اکٹھا کرنے اور جمع شدہ معلومات کی تعبیر کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ طلبہ کو سکھایا جاتا ہے کہ مسائل و مشکلات کی کس طرح واضح تعریف کی جاتی ہے۔ مسائل سے متعلقہ اقدار کی کیسے وضاحت کی جاتی ہے۔ کیونکہ اگر مسائل اور اقدار کے متعلق طلبہ کے خیالات میں اختلاف ہے تو پھر وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائیں گے۔ مسائل اور متعلقہ اقدار کی وضاحت کے بعد تجاویز کا جائزہ لیا جاتا ہے اور فیصلہ کیا جاتا ہے۔

جستجوئی طریق کے لیے حکمت عملی:

استاد کے ذہن میں یہ بات واضح ہونا چاہیے کہ وہ جستجوئی طریقہ کو کیوں استعمال کرنا چاہتا ہے؟ کیا وہ طلبہ میں جستجوئی طریقہ کی مخصوص مہارتیں پیدا کرنا چاہتا ہے؟ اس کا مقصد تصورات

کی نشو و نما ہے؟ یا وہ طلبہ کو ایسے طریق کار سکھانا چاہتا ہے جن کی مدد سے اقدار کی وضاحت کی جاتی ہے۔ جب تک استاد کے ذہن میں مقصد واضح نہیں ہوگا وہ جستجوئی طریقے کی حکمت عملی کا فیصلہ نہیں کر سکے گا۔

جستجو کا عمل:

اگر مقصد طلبہ کو انکوائری کی مہارتیں اور ان کا عمل سکھانا ہو تو اس کے لیے مندرجہ ذیل طریق کار اختیار کرنا ہوگا:

۱- مشکل کی تعریف کریں اور معلومات اکٹھی کرنے کے لیے سوالات یا مفروضے قائم کریں۔

۲- کوئی طریق کار اختیار کریں۔ اقدام کی منصوبہ بندی کریں۔

۳- ہر سوال یا مفروضے کے تحت معلومات کی درجہ بندی کریں۔

۴- ضروری اضافی معلومات کی نشاندہی کریں تاکہ خلا کو پر کیا جا سکے۔

۵- نتائج اخذ کریں اور نتائج اور طریق کار کا جائزہ لیں۔

یہ حکمت عملی مسئلی طریقے سے ملتی جلتی ہے لیکن اس میں سارا زور صرف مواد اکٹھا کرنے کی مہارت سکھانے پر دیا جاتا ہے۔

تصورات کے نشو و نما کی حکمت عملی:

تصورات کے ارتقا کے لیے دو ماڈل استعمال کیے جاتے ہیں: (۱) اکتشافی استقرائی ماڈل (Discovery-Inductive Model)۔ (۲) بیانیہ استقرائی ماڈل (Expository-Inductive Model) اکتشافی استقرائی ماڈل میں اشیا کے مشترکہ خد و خال معلوم کرنے کے لیے طلبہ کی رہنمائی کی جاتی ہے اور انہیں اشیا کو اکٹھا کرنے اور ان کا نام رکھنے کے طریق کار سکھائے جاتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱- ان اشیا کو جنہیں اکٹھا کرنا مقصود ہے۔ مشاہدہ کرنا اور ان پر بحث کرنا۔

۲- اشیا کو اکٹھا کرنے کے لیے مشترکہ خصوصیت کی نشاندہی کرنا۔ نیز واضح اختلاف بھی نوٹ کرنا۔

۳- اس بات کا فیصلہ کرنا کہ ان اشیا کو کس بنیاد پر اکٹھا کیا جائے۔

۴- ہر گروپ کا نام تجویز کرنا۔

۵- زیر استعمال مواد میں سے مزید مثالیں تلاش کرنا۔

بیانیہ استقرائی ماڈل:

اس ماڈل کی حکمت عملی اکتشافی استقرائی ماڈل سے ملتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں

جاتا ہے جنھیں ایک ایک کر کے اس وقت تک تقویت دی جاتی ہے جب تک جواب پختہ نہیں ہو جاتے ۔ ماہرین نفسیات کے نزدیک تعلم کی بنیاد عمل پر ہے ۔ تعلم صرف اسی صورت میں واقع ہوگا جب طلبہ جواب دیں گے ۔ اگر کوئی عمل نہیں ہوگا تو تعلم بھی واقع نہیں ہوگا ۔ سکنر کے اس نظریہ کا بنیادی اصول عمل ہے ۔ جس کے تحت تعلم کے لیے خود طلبہ کو جواب مرتب کرنا ہوتا ہے اور اس کے لیے انھیں وہ باتیں یاد کرنا ہوتی ہیں جن کو وہ پہلے سیکھ چکے ہوتے ہیں سکنر کے نزدیک یاد کرنا (R.co.l ct:on) سیکھی ہوئی باتوں کو جانچنے کا بہترین طریقہ ہے ۔ اس لیے وہ جواب مرتب کرنے کے علاوہ غلطیوں کی تعداد کم کرنے ، مواد کو چھوٹے چھوٹے اجزا میں پیش کرنے ، تقویت بہم پہنچانے اور فوری نتائج معلوم ہونے کے انتظامات پر بہت زور دیتا ہے ۔

لازمی عناصر :

منضبط تدریس کے لازمی عناصر کا نچوڑ یہ ہے :

۱- مواد کو ترتیب دیتے وقت تسلسل قائم رکھا جاتا ہے ۔

۲- مواد کو کنٹرول کرنے کی غرض سے چھوٹے چھوٹے اجزا (ٹکڑوں) میں پیش کیا جاتا ہے جنھیں فریم کہتے ہیں ۔

۳- طلبہ کو ہر ایک فریم کا لازمی جواب دینا ہوتا ہے

۴- ہر درست جواب سے طلبہ کو تقویت ملتی ہے اور مزید علم حاصل کرنے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں ۔

۵- طلبہ اپنی ذہنی استعداد اور مرضی کے مطابق سیکھتے ہیں - ان کے سیکھنے کی رفتار الگ الگ ہوتی ہے کوئی دیر سے سیکھتا ہے اور کوئی جلدی ۔

۶- جو کچھ سکھانا مقصود ہوتا ہے اسے طلبہ کی سابقہ معلومات پر استوار کیا جاتا ہے ۔

۷- طلبہ کسی بیرونی امداد کے بغیر سیکھتے ہیں ۔

۸- طلبہ کے درست جوابات کو پختہ کرنے (Feedback) کے لیے طلبہ کو نئی معلومات مہیا کی جاتی ہیں ۔

۹- علم اس وقت پختہ ہوتا ہے جب اسے بار بار دہرایا جاتا ہے ۔

خصوصیات :

منضبط تدریس کی بنیاد ٹھوس نفسیاتی اصولوں پر رکھی گئی ہے جن میں سے مندرجہ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں :

۱- یہ انفرادی اختلاف کو پیش نظر رکھتی ہے - ہر طالبعلم اپنی رفتار اور ذہنی استعداد کے مطابق سیکھتا ہے اس کے لیے اسے ایک مقررہ مدت میں سبق یاد کرنے کی پابندی نہیں ہوتی ۔

۲- اس کی بنیاد تعلم بذریعہ عمل پر ہے - اس میں ہر طالبعلم کچھ نہ کچھ کرتا ہوا نظر آتا ہے -

۳- طلبہ کو دوران سبق اپنی کامیابی کا علم ہوتا رہتا ہے - جس سے مزید علم حاصل کرنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے - مزید برآں اس سے صحیح علم حاصل کرنے اور غلط جواب سے پرہیز کرنے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں -

۴- اس میں تمام اسباق باہم مربوط ہوتے ہیں -

انضباطی پروگرام پیش کرنے کے طریقے

انضباطی مواد (Programmed Materials) کو یا تو منضبط کتب (Programmed Texts) کے ذریعے یا تدریسی مشینوں (Teaching Machines) کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے - انضباطی مواد کو پیش کرنے کے مندرجہ ذیل دو بڑے طریقے ہیں :

۱- خطی (Linear) -

۲- شاخی (Branching) -

خطی طریق سڈنی - ایل - پریسی (Sidney L. Pressey) اور بی - ایف - سکنر (B. F. Skinner) نے انضباطی مواد پیش کرنے کے لیے اختیار کیا ہے لیکن ان دونوں کے طریقوں میں بڑا واضح فرق ہے - شاخی طریق نارمن اے - کراوڈر (Norman A. Crowder) نے تجویز کیا ہے -

پریسی کا خطی پروگرام :

پریسی نے سب سے پہلے ۱۹۲۴ء میں خطی پروگرام پیش کیے - پریسی منضبط تدریس کو پڑھانے کے روائتی طریقوں سے الگ کوئی طریقہ تصور کرنے کی بجائے اسے ان سے منسلک سمجھتا تھا اس کے خیال میں معلومات کو پہلے روائتی طریقوں سے حاصل کیا جائے اور پھر انھیں منضبط تدریس کے ذریعے پختہ کرنا چاہیے -

پریسی نے جو انضباطی اسلوب (Style of Programming) اختیار کیا وہ خطی تھا ، لیکن اس میں کثیر جوابوں میں سے صحیح جواب کا انتخاب کرنا ہوتا تھا - شروع شروع میں اس نے مواد کو پیش کرنے کے لیے جو ترکیب استعمال کی اس میں سوال کا صحیح جواب حاصل کرنے کے لیے طلبہ کو تدریسی مشین کا بٹن دبانا پڑتا تھا - جواب درست ہونے کی صورت میں اگلا سوال خود بخود سامنے آ جاتا لیکن اگر غلط جواب کا بٹن دبایا جاتا تو اس صورت میں مشین میں کوئی حرکت نہ ہوتی - یہ مشین صرف یہی نہیں بتاتی تھی کہ جواب درست ہے یا غلط، بلکہ اس کا اہم مقصد یہ تھا کہ تعلم میں پختگی آ جائے - پریسی اس بات کے حق میں تھا کہ فریم کے اجزا کا سائز نہ زیادہ بڑا ہو اور نہ بہت

چھوٹا ، بلکہ درمیانہ ہو۔ وہ اغلاط کو اتنا اہم نہیں سمجھتا تھا کیونکہ پریسی کے منضبط پروگرام میں غلطیوں کو تقویت نہیں ملتی تھی اور مشین صرف اسی صورت میں حرکت کرتی تھی اگر جواب درست ہوتا تھا۔

سکنر کا خطی پروگرام :

سکنر اور پریسی کے خطی پروگراموں میں تین امور میں فرق ہے :

۱۔ پریسی پہلے سے دیے ہوئے کثیر جوابات میں سے مناسب جواب تلاش کرنے پر زور دیتا ہے۔ اس کے برعکس سکنر سوالات کے جوابات لکھنے یا نامکمل جملوں کو مکمل کرنے کے لیے طلبہ کو موزوں الفاظ خود تلاش کرنے کو کہتا ہے۔ سکنر کے خیال میں کثیرالجواب سوالات میں یادداشت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعے غلط الفاظ سیکھنے کا احتمال برابر موجود رہتا ہے۔ اس کے برعکس جب طلبہ اپنے حافظہ پر زور دے کر مناسب الفاظ کا انتخاب خود کرتے ہیں تو ان کی صلاحیتوں کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک یہی صحیح تعلم ہے۔

۲۔ سکنر طلبہ کو پروگرام کے فریم کے چھوٹے چھوٹے اجزا (ٹکڑوں) میں پیش کرنے کے حق میں ہے سکنر کے خیال میں معلومات چھوٹے ٹکڑوں میں دی جائیں تو طلبہ ہمیشہ صحیح جواب دیں گے۔

۳۔ انضباطی پروگرام تیار کرنے والے کو اپنا پروگرام مسلسل بہتر بناتے رہنا چاہیے تا آنکہ عام پر ذہانت رکھنے والے طلبہ بھی صحیح جواب دینے لگیں۔

سکنر کے خطی پروگرام کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں :

۱۔ ہر طالبعلم کو باہمی ربط رکھنے والے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے حل کرنا ہوتے ہیں۔

۲۔ ہر طالبعلم پچھلی معلومات کی روشنی میں کوئی لفظ یا ہندسہ لکھ کر جواب دیتا ہے۔

۳۔ اشارات کی مدد سے طلبہ کی کارکردگی کو غلطی سے مبرا رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انضباطی پروگرام میں ۵ فیصد سے کم غلطیاں قابل معافی ہوتی ہیں۔

۴۔ غلطی کی صورت میں طلبہ کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاتا بلکہ پروگرام کے اس حصے کو جس میں طلبہ سے کوئی غلطی ہوئی ہو ناقص تصُور کیا جاتا ہے اور اس میں مناسب رد و بدل کر کے طلبہ کو درست جواب خود معلوم کرنے میں مدد دی جاتی ہے۔

فریم کی تیاری :

منضبط تدریس میں سب سے اہم حصہ پڑھانے کے طریقوں کی بجائے فریم کی تیاری ہے۔ ایک فریم میں ایک ہی تصور کو شامل کیا جاتا ہے اور ایک کے بعد دوسرے تصور کو پڑھانے کا عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ پورا انضباطی پروگرام مکمل نہں ہو جاتا۔ جہاں ضروری ہو وہاں مشق کرائی جاتی ہے اور اشارات دیے جاتے ہیں۔ ایک موثر انضباطی پروگرام کو ان مراحل سے

گزرنا پڑتا ہے : (۱) تصور اور اس کے لیے مواد کا انتخاب ۔ (۲) کرداری (Behavioural) انداز میں مقاصد کا بیان ۔ (۳) مواد کو فریم کی شکل میں لکھنا ۔ (۴) جوابات درج کرنا ۔ ڈاکٹر محمد ایوب کے تیار کردہ مندرجہ ذیل مختصر پروگرام کے مطالعہ سے سکنر کے خطی پروگرام کو سمجھنے میں آسانی رہے گی :

فریم

موضوع :

ستارے اور سیارے ۔

اس انضباطی پروگرام میں مندرجہ ذیل تصورات واضح کیے گئے ہیں :

(۱) کائنات ۔ (۲) سیارے ۔ (۳) ستارے ۔

مقاصد

اس فریم کو ختم کر لینے کے بعد طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ

(الف) کائنات کے معنی بیان کر سکیں ۔

(ب) سیاروں اور ستاروں کا فرق بتا سکیں ۔

فریم

۱۔ خلا اور اس میں موجود تمام چیزیں مل کر کائنات بنتی ہے ہر ایک چیز ۔ ۔ ۔ ۔ کا حصہ ہے۔

(جواب والے حصے کو فولڈر سے چھپا لیا جاتا ہے اور جب طالبعلم مطلوبہ جگہ پر جواب لکھ دیتا ہے ، تو وہ فولڈر کو وہاں سے ہٹا کر اپنا جواب چیک کر لیتا ہے) ۔

(جواب کی جگہ آپ کو لفظ کائنات لکھنا ہے ۔ اب نچلے خانے میں بائیں طرف دیکھیں وہاں آپ لفظ کائنات لکھا ہوا دیکھیں گے) ۔

۲۔ انسان ہمیشہ سے کائنات کے بارے میں سوچتا رہا ہے اور اس نے اس کے متعلق بہت سی معلومات حاصل کی ہیں انسان نے ۔ ۔ ۔ ۔ کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کی ہیں ۔

کیا آپ نے خالی جگہ میں لفظ کائنات لکھا ہے ؟

آپ جواب کی پڑتال نچلے خانہ میں بائیں طرف درج شدہ لفظ سے کریں ۔

۱۔ کائنات

۳- اب تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ کائنات میں ہر چیز حرکت کرتی ہے۔ کائنات میں ہر چیز - - - - کر رہی ہے۔	۲- کائنات
۴- زمین کائنات کا حصہ ہے، اور کائنات میں ہر چیز حرکت کر رہی ہے۔ زمین - - - - کر رہی ہے۔	۳- حرکت
۵- کائنات میں بعض اجسام بعض دوسرے اجسام کے گرد گھوم رہے ہیں۔ مثال کے طور پر زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ - - - - سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔	۴- حرکت
۶- کچھ اجسام اور بھی ہیں جو سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔ زمین بھی ایسی چیزوں میں سے ایک ہے جو - - - - کے گرد گھوم رہی ہیں۔	۵- زمین
۷- پندرھویں صدی میں پولینڈ کے کوپرنیکس نے سب سے پہلے یہ معلوم کیا کہ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے کوپرنیکس پہلا شخص تھا جس نے معلوم کیا کہ - - - - کے گرد گھوم رہی ہے۔	۶- سورج
۸- سورج اور دوسرے ستاروں کی حرکت کے بارے میں کوپرنیکس نے یہ اصول بنایا کہ - - - - سورج کے گرد گھومتی ہے۔	۷- زمین سورج
۹- ایسے اجسام: (۱) جو سورج کے گرد گھومتے ہیں اور خود (۲) حرارت اور روشنی پیدا نہیں کرتے سیارے کہلاتے ہیں۔ وہ اجسام جو خود حرارت اور روشنی پیدا نہیں کرتے - - - - کہلاتے ہیں۔	۸- زمین
۱۰- سیارے - - - - کے گرد گھومتے ہیں لیکن یہ خود - - - - اور روشنی پیدا نہیں کرتے۔ زمین خود حرارت اور روشنی پیدا نہیں کرتی اس لیے زمین ایک - - - - ہے۔	۹- سیارے
۱۱- کائنات میں کچھ ایسے اجسام بھی ہیں جو خود حرارت اور روشنی پیدا کرتے ہیں یہ سب جلتی ہوئی گیس سے بنے ہوئے ہیں۔ ایسے اجسام کو ستارے کہتے ہیں۔	۱۰- سورج حرارت سیارہ

سورج جلتی ہوئی گیسوں سے بنا ہوا ہے اور خود حرارت اورر وشنی
پیدا کرتا ہے اس لیے سورج ایک - - - - ہے -

۱۱- ستارہ

۱۲- کیا ستارے خود حرارت اور روشنی پیدا کرتے ہیں -

ہاں نہیں

۱۲- ہاں

۱۳- کیا یہ کہنا درست ہے کہ سیارے خود حرارت اور روشنی پیدا نہیں کرتے -

ہاں نہیں

۱۳- ہاں

۱۴- ستارے یا سیارے خود حرارت اور روشنی پیدا کرتے ہیں -
ستارے یا سیارے (ایک پر نشان لگائیں) -

۱۴- ستارے

شاخی پروگرام

کراؤڈر کے شاخی پروگرام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اکتساب کا عمل اس وقت زیادہ مؤثر ہوتا ہے جب طلبہ معلومات کو تفصیل سے پڑھیں اور انھیں ذہن نشین کر لیں - اگر کثیر جوابات میں سے طلبہ صحیح جواب کا انتخاب نہیں کر سکے تو ظاہر ہے انھیں اس موضوع پر مزید معلومات بہم پہنچانے کی ضرورت ہے - اس کا مطلب یہ ہوا کہ طلبہ کے جواب سے اگلا قدم متعین ہوتا ہے - اگر جواب صحیح ہے تو طلبہ دوسرا قدم اٹھا سکتے ہیں ، لیکن اگر جواب صحیح نہیں تو دوسرا قدم اٹھانے سے پہلے انھیں اپنی غلطی کی وجہ معلوم کرکے اصلاح کرنی ہوگی - سکنر کے خطی پروگرام کے برعکس کراوڈر کے شاخی پروگرام میں تسلسل نہیں ہوتا بلکہ یہ انفرادی حالات کے مطابق اپنی شکل بدلتا چلا جاتا ہے - چونکہ شاخی پروگرام میں غلطیاں متوقع ہوتی ہیں اس لیے اشارات نہیں دیے جاتے - بلکہ ان کی جگہ اصلاحی تعلم (Remedial Instruction) مہیا کی جاتی ہے تاکہ طلبہ اپنے جواب کی خامیوں کو دور کر سکیں - کراوڈر کے اس شاخی پروگرام کو مندرجہ ذیل نقشے سے ظاہر کیا جا سکتا ہے -

کمزوریاں (Limitations)

۱- معاشرتی علوم کی تدریس کا اولین مقصد طلبہ کو حقائق و واقعات بتانے کی بجائے ان میں تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتیں پیدا کرنا ہے۔ منضبط تدریس کے ذریعے بنیادی اور ٹھوس حقائق کے متعلق معلومات تو دی جا سکتی ہیں لیکن طلبہ میں تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتیں پیدا کرنا کچھ مشکل کام ہے۔

۲- ایسے تصورات جن کا ایک ہی جواب ممکن ہو ان کے فریم تیار کیے جا سکتے ہیں، لیکن جہاں اختلاف رائے کی گنجائش ہو اسے منضبط شکل میں ڈھالنا ممکن نہیں ہوتا۔ معاشرتی علوم میں اکثر معاملات میں اختلاف رائے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس لیے معاشرتی علوم کے تصورات اور نفس مضمون کو فریم کی شکل میں پیش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

۳- انضباطی پروگراموں سے صرف وہی طلبہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو فریموں کو پڑھ کر سمجھ سکتے ہوں۔

۴- بسا اوقات استاد کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ استاد کا کام صرف فریم تیار کرنا یا تیار شدہ فریم طلبہ کو مہیا کرنا رہ جاتا ہے۔ جس سے استاد اور شاگرد کے باہمی تعلقات مجروح ہوتے ہیں اور استاد اپنے طلبہ کے کردار پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

ماڈیولز Modules

ماڈیول کا مفہوم:

ماڈیولز کے ذریعے پڑھانا نسبتاً ایک نیا طریقہ ہے۔ ایک ماڈیول ہر لحاظ سے مکمل اور خود مکتفی تدریسی یونٹ ہوتا ہے جس میں تدریسی مواد، تعلمی سرگرمیوں (Learning Activities) اور جائزہ کے طریق کار کو اکٹھا کر دیا جاتا ہے تاکہ طلبہ استاد کی مدد اور نگرانی کے بغیر خود تعلمی (Self Learning) کے ذریعے ممکنہ حد تک مطلوبہ تدریسی مقاصد آسانی سے حاصل کر سکیں۔ ماڈیولز کے ذریعے مہارتیں اور تصورات موثر اور باکفایت طور پر سکھائے جا سکتے ہیں۔ تدریس کے لیے ماڈیولز کیوں استعمال کیے جائیں؟ ان کے حق میں کم ازکم پانچ دلائل دیے جا سکتے ہیں۔

۱- طلبہ مختلف معاشرتی اور معاشی ماحول سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی مہارتوں، توقعات، استعدادی، ضروریات اور ذاتی مقاصد میں اتنا تنوع پایا جاتا ہے کہ روائتی تدریسی طریقوں سے سب کی ضرورت کو پورا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن ایک ماڈیول انفرادی ضروریات پوری کرنے کے لیے تعلم کے متبادل راستے مہیا کرتا ہے۔

۲- انفرادی اور مادی وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھانے میں بھرپور مدد دیتا ہے۔

۳- یہ حالات کے مطابق طلبہ کے ذاتی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے قابل عمل متبادل راستے فراہم کرتے ہیں -

۴- ان میں طلبہ اپنے انداز اور رفتار سے جن مقاصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں ، انھیں اچھی طرح حاصل کر لیتے ہیں -

۵- رٹا لگانے کی بجائے یہ طلبہ کو ان کا علم ، سہارتیں اور تجربات استعمال میں لانے کے مواقع سہیا کرتا ہے -

بناوٹ و ترتیب :

ایک ماڈیول کے مندرجہ ذیل پانچ حصے ہوتے ہیں :

۱- تعارف -

۲- مقاصد کی توضیح -

۳- سابقہ واقفیت کا جائزہ -

۴- تدریسی سرگرمیاں -

۵- اکتسابی جائزہ -

تعارف :

تعارف کے ذریعے طلبہ کو ماڈیول کے متعلق مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات ملتے ہیں -

۱- ماڈیول کے مقاصد کیا ہیں اور مقاصد کا انتخاب کس بنا پر کیا گیا ہے ؟

۲- ان مقاصد کے حصول کے لیے طلبہ کس قسم کی سرگرمیوں میں حصہ لیں گے اور وہ کن تجربات سے گزریں گے ؟

۳- ماڈیول کے لیے کس قسم کے مواد اور ضروری سامان کی ضرورت ہوگی اور یہ تمام چیزیں کہاں سے ملیں گی ؟

۴- ماڈیول پر کام شروع کرنے سے پہلے طلبہ کو کیا کچھ معلوم ہونا چاہیے اور کام ختم کر لینے کے بعد ان کے علم میں کیا اضافہ ہونا چاہیے ؟

۵- ماڈیول کی مختلف سرگرمیوں کی تکمیل کے لیے اندازاً کتنا وقت درکار ہوگا ؟

۶- طلبہ کسی ماڈیول پر کیوں کام کریں گے ؟ ان کے لیے اس کی تعلیمی افادیت کیا ہوگی ؟

ویبر (Weber) کے خیال میں یہ ذمہ داری ماڈیول تیار کرنے والوں کی ہے کہ وہ طلبہ کو ان کی تعلیمی افادیت کے متعلق قائل کریں کیونکہ اگر طلبہ کسی ماڈیول کی افادیت کے قائل نہیں تو وہ ہرگز اس پر کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے -

مقاصد کی توضیح :

طلبہ کو آغاز سے ہی بتا دینا چاہیے کہ ماڈیول پر کام کر کے انھیں کون سی مہارتیں اور صلاحیتیں (Competencies) پیدا کرنے کی توقع کرنی چاہیے ۔ مقاصد کو کرداری انداز میں بیان کرنا چاہیے (مثلاً طلبہ اس ماڈیول کی تکمیل کے بعد اس قابل ہو جائیں گے کہ ----------)

سابقہ واقفیت کا جائزہ :

سابقہ واقفیت کا جائزہ لینے کا مقصد یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ کسی ماڈیول پر کام کرنے سے پہلے طلبہ کے لیے جن معلومات اور مہارتوں کا جاننا ضروری ہے آیا طلبہ وہ جانتے ہیں ؟ اس سے طلبہ کو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا کچھ نہیں جانتے اور جسے سیکھنے کے لیے ان کے اندر دلچسپی اور آمادگی پیدا ہوتی ہے ۔ مزید برآں ماڈیول پر کام شروع کر دینے کے بعد وہ اس کرب سے بھی بچ سکتے ہیں جس کا سامنا انھیں مواد پر عبور حاصل نہ ہونے کی صورت میں بھگتنا پڑے گا ۔ دراصل سابقہ واقفیت کا جائزہ ایک ایسا تشخیصی عمل ہے جس سے طلبہ کو تدریسی سرگرمیوں کے انتخاب میں مدد ملتی ہے اور جو کچھ وہ نہیں جانتے اسے ماڈیول پر کام کرنے کے نتیجہ کے طور پر سیکھنے کے لیے ان کے اندر زبردست تحریک پیدا ہوتی ہے ۔ انھیں یہ فیصلہ کرنے میں بھی آسانی رہتی ہے کہ آیا وہ سارے ماڈیول پر کام کریں یا اس کے ان حصوں کو چھوڑ دیں جن کے تعلمی ما حصل (Learning Outcomes) کو وہ پہلے سے جانتے ہیں ۔

تدریسی سرگرمیاں :

تدریسی سرگرمیوں سے مراد وہ تجربات ہیں جو طلبہ کو ماڈیول کے مخصوص تعلمی نتائج (Learn-ing Outcomes) کے حصول کے قابل بنانے کے لیے ترتیب دی جاتی ہیں ۔ ماڈیول کا مقصد طلبہ میں کچھ متعین صلاحیتیں (Competencies) پیدا کرنا ہوتا ہے ۔ لہٰذا طلبہ سے اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ اپنی ضروریات ، خواہشات اور سٹائل کے پیش نظر وہ خود فیصلہ کریں کہ دستیاب تدریسی سرگرمیوں میں سے وہ کس قسم کی سرگرمیوں کا انتخاب کریں کہ مطلوبہ تعلمی نتائج حاصل ہو سکیں ۔ ان کا کامیابی کا معیار یہ ہے کہ آیا وہ مطلوبہ تعلمی ماحصل کا اظہار کر سکتے ہیں ، انھیں سمجھا سکتے ہیں یا انھیں دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں ۔ کسی ماڈیول کے لیے کون سی تدریسی سرگرمیاں ، حکمت عملی یا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں ان کا انحصار تدریسی وسائل کی دستیابی پر ہے ۔ تدریسی وسائل میں پڑھنے لکھنے کے علاوہ لیکچر ، سیمینار ، تعلیمی سیر ، مشاہداتی مطالعہ ، منضبط تدریس ، تمثیل کاری فلمیں ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگرام وغیرہ شامل کیے جاتے ہیں ۔ بہر حال جو بھی تدریسی سرگرمیاں منتخب کی جائیں وہ طلبہ کو ایسے مواقع فراہم کریں جہاں وہ ان مہارتوں کی مشق کر سکیں جو انھیں سکھانا مقصود ہیں ۔ تدریسی سرگرمیوں کا انتخاب کرتے وقت ان سوالات پر غور کر لینا چاہیے ۔

۱ - کیا یہ سرگرمی تدریسی مقاصد کو کرداری انداز میں پختہ کرنے کے لیے مشق کے مناسب مواقع فراہم کرتی ہے ؟

۲ - کون سا مواد دستیاب ہے جسے استعمال میں لایا جا سکتا ہے ؟

۳ - اس پر کتنا وقت صرف ہوگا ؟

۴ - کیا دیگر ضروری سامان مہیا کیا جا سکتا ہے ؟

۵ - کیا تدریسی سرگرمی طلبہ کے لیے دلچسپی کی حامل ہوگی ؟

۶ - کیا اعداد و شمار سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ایسی سرگرمی پر اسی درجہ کے طلبہ کی قبل ازیں کارکردگی کیا رہی ہے ؟

اکتسابی جائزہ :

اکتسابی جائزہ کے ذریعے اس بات کا تعین کیا جاتا ہے کہ آیا طلبہ نے ماڈیول پر کام کرکے مطلوبہ تعلمی نتائج حاصل کر لیے ہیں اور کیا وہ ان کا اظہار کر سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں کیا وہ تعلمی ماحصل کا مظاہرہ اپنے کردار سے کر سکتے ہیں۔

مشکلات :

استاد کو ماڈیولز کی تیاری اور استعمال میں مندرجہ ذیل مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔

۱۔ ماڈیولز کو لکھنے ، آزمانے ، دوبارہ لکھنے اور دوبارہ آزمانے کے لیے استاد کے لیے وقت نکالنا مشکل ہوتا ہے۔

۲۔ ماڈیولز کی چھپائی اور تقسیم استاد کے لیے مسئلہ بن جاتا ہے۔

۳۔ استاد کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ ماڈیولز کے لیے منتخب مواد ، حوالہ جات کی کتب اور فلموں کا انتظام کر سکے۔

۴۔ اس مقصد کے لیے اگر استاد وسائلی سنٹر قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جہاں سے ماڈیولز کے لیے سامان مل سکتا ہو تو پھر سنٹر کے اوقات کار ، سامان کی دیکھ بھال اور حفاظت اس کے لیے مسائل پیدا کرتے رہتے ہیں۔

۵۔ ماڈیولز پر کام کرنے کے اوقات مقرر نہیں ہوتے جس سے انتظامی مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔

۶۔ ماڈیولز پر طلبہ کے کام کرنے کی رفتار مختلف ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کے کام میں رابطہ پیدا کرنا نیز انھیں بعض باتوں کے لیے اکٹھا کرنا، ان کے کام کی نگرانی کرنا اور جائزہ لینا مشکل ہو جاتا ہے۔

طلبہ کی آسانی کے لیے مندرجہ ذیل ماڈیول نمونہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے یہ ماڈیول ڈاکٹر شیخ معزالدین اور ان کے ساتھیوں نے ادارہ تعلیم و تحقیق لاہور میں منعقدہ ایک ورکشاپ کے دوران

اپریل ۱۹۷۷ء میں تیار کیا تھا جسے کچھ رد و بدل کے بعد درج کیا گیا ہے ۔

موضوع

زرعی ترقی

تعارف

کسی ملک کی اقتصادی ترقی اور عام آدمی کے معیار زندگی کا انحصار براہ‌راست اس بات پر ہے کہ ملکی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے ۔ پاکستان ایک زرعی ملک ہے اور اس کی زیادہ تر آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے لہذا پاکستان کی اقتصادی ترقی کا دار و مدار زراعت کی ترقی پر ہے ۔ ملک کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کی غذائی ضروریات پوری کرنے اور ملکی صنعتوں کے لیے خام مال فراہم کرنے کے لیے زرعی نظام کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے ۔ مندرجہ ذیل عوامل زرعی ترقی سے متعلق ہیں ۔

۱۔ زمین کی تیاری ۔

۲۔ کھاد ۔

۳۔ آبپاشی ۔

۴۔ بیج ۔

۵۔ دیکھ بھال کے طریقے ۔

۶۔ جڑی بوٹیوں کی تلفی ۔

۷۔ فصلوں کی بیماریاں ۔

زرعی ترقی کے لیے بہت سے ماڈیولوں (Modules) کی ضرورت ہے تاکہ جدید زرعی تعلیم کو زراعت کی ترقی کے لیے استعمال کیا جا سکے ۔ اس ماڈیول کو تیار کرنے والوں نے محسوس کیا کہ زرعی ترقی کے لیے کھیتوں میں جڑی بوٹیوں کا تلف کرنا نہایت ضروری ہے اس لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ "جڑی بوٹیاں زرعی ترقی کی دشمن" پر ایک ماڈیول تیار کیا جائے تاکہ زرعی پیداوار میں اضافہ کیا جا سکے ۔

زرعی ترقی کی دشمن جڑی بوٹیاں

جن کے لیے تیار کیا گیا	:	سی ٹی اساتذہ
تعلیمی قابلیت	:	انٹرمیڈیٹ سی ٹی
مضمون	:	معاشرتی علوم برائے جماعت ششم

سابقہ واقفیت

توقع کی جاتی ہے کہ طلبہ پہلے سے سیکھ چکے ہیں کہ :

۱۔ پاکستان کی بڑی بڑی فصلیں کون سی ہیں ؟

۲۔ ان میں سے کون سی نقدآور فصلیں ہیں ؟

۳- فصلوں کی کاشت کے طریقے کیا ہیں ؟
۴- فصلوں کے پودے مختلف حصوں میں بٹے ہوتے ہیں مثلاً جڑ ، تنا ، شاخ اور پتے -
۵- پودوں کو زندہ رہنے کے لیے خوراک، پانی ، روشنی اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے -
۶- پودوں کے بڑھنے کے لیے ضروری حالات کیا ہیں ؟

توقع کی جاتی ہے کہ طلبہ پہلے سے مندرجہ ذیل مہارتیں حاصل کر چکے ہیں -

۱- کاشتکاری کے آلات کی پہچان اور ان کا استعمال -
۲- سادہ تجربات میں پیمائش کرنے کے طریقے اور ان کا استعمال -

سابقہ واقفیت کا جائزہ :

مندرجہ ذیل سوالات دو حصوں پر مشتمل ہیں - پہلا حصہ بیانات پر مشتمل ہے جب کہ دوسرے حصے میں اس بیان کے چار ممکن حل دیے گئے ہیں - بہترین جواب کے سامنے والے حرف کے گرد دائرہ لگائیں -

۱- پودے کا وہ حصہ جو زمین سے پانی جذب کرتا ہے اسے :

(الف) پتہ کہتے ہیں -
(ب) جڑ کہتے ہیں -
(ج) تنا کہتے ہیں -
(د) شاخ کہتے ہیں -

۲- روشنی پودے کی مدد کرتی ہے -

(الف) اس کی خوراک کو برقرار رکھنے میں
(ب) اس کی ذخیرہ شدہ خوراک کو استعمال کرنے میں
(ج) اس کی خوراک کی تیاری میں
(د) الف اور ج دونوں درست ہیں -

۳- ہوا پودوں کے لیے ضروری ہے کیونکہ :

(الف) یہ پودوں کو کاربن ڈائی آکسائڈ فراہم کرتی ہے -
(ب) یہ پودوں کو نائٹروجن مہیا کرتی ہے -
(ج) یہ پودوں کو نمی فراہم کرتی ہے -
(د) الف ، ب ، ج تینوں ٹھیک ہیں -

۴- پودوں کے لیے مٹی ضروری ہے کیونکہ :

(الف) یہ پودوں کو پانی بہم پہنچاتی ہے -

(ب) یہ پودوں کو معدنی نمکیات بہم پہنچاتی ہے۔
(ج) یہ پودوں کی فالتو خوراک لے لیتی ہے۔
(د) الف اور ب دونوں درست ہیں۔

۵- جب کسی فصل کے بیج کھیت میں بوئے جاتے ہیں تو:

(الف) صرف اس فصل کے پودے اُگتے ہیں۔
(ب) بعض دوسرے پودے بھی اُگتے ہیں۔
(ج) کوئی پودا نہیں اُگتا۔
(د) فصل کے پودے اور دوسرے پودے دونوں اُگتے ہیں۔

کارکردگی کے مقاصد

اس ماڈیول کی تکمیل کے بعد طلبہ میں یہ اہلیت پیدا ہو جائے گی کہ وہ

۱- گندم اور جڑی بوٹیوں کے پودوں میں تمیز کر سکیں۔
۲- جڑی بوٹیوں کے نقصان دہ اثرات کی نشاندہی کر سکیں۔
۳- جڑی بوٹی کے پودے کی زندگی کے دور (Cycle) کو بیان کر سکیں۔
۴- جڑی بوٹیاں تلف کرنے کے دستی طریقے استعمال کر سکیں۔
۵- جڑی بوٹیاں تلف کرنے کے لیے دوائیاں استعمال کرتے وقت حفاظتی تدابیر اختیار کر سکیں۔
۶- اس بات کی وضاحت کر سکیں کہ جڑی بوٹیاں کیسے اُگی ہیں۔
۷- مختلف جڑی بوٹیوں مثلاً پوہلی، گھاس، مینا وغیرہ کی پہچان کر سکیں۔

ماڈیول نمبر ۱

جڑی بوٹیاں کیا ہیں؟

اس ماڈیول میں آپ طلبہ کو بہت سی سرگرمیوں کے ذریعے جڑی بوٹیوں کا مفہوم ذہن نشین کرائیں گے۔ اس ماڈیول کی تکمیل کے بعد طلبہ میں گندم کے پودے اور جڑی بوٹیوں کے پودوں میں تمیز کرنے کی اہلیت پیدا ہو جانی چاہیے۔

تصورات

۱- جڑی بوٹی ایک پودا ہے۔
۲- جڑی بوٹی ایک خود رو پودا ہے۔
۳- جڑی بوٹی ایک غیرضروری پودا ہے۔
۴- جڑی بوٹی گندم کی بہت سی بیماریوں کا باعث بنتی ہے۔

نفس مضمون

۱- جڑی بوٹیاں خود رو پودے ہیں جو عام طور پر گندم کی فصل کے ساتھ اُگتے ہیں -
۲- گندم اور جڑی بوٹیوں کے پودوں میں نمایاں فرق ہوتا ہے -
۳- گندم اور جڑی بوٹیوں کے پودوں کی شکل ، قد ، تنا ، پتے اور نشو و نما کے طریقوں میں فرق ہوتا ہے -
۴ گندم کے پودے کے تنے ایک گچھے کی شکل میں سیدھے اُگتے ہیں -
۵- گندم کے پودے کا پتا مقابلتاً لمبا ، زیادہ سبز ، تیز کناروں والا اور بغیر روئیں (چھوٹے چھوٹے بالوں) کے ہوتا ہے -

تعلمی سرگرمیاں

۱- ہر ایک طالبعلم گندم کے کھیت میں اُگے ہوئے تین مختلف پودے لائے -
۲- طلبہ لائے ہوئے پودوں کا مشاہدہ کریں اور ان میں پائے جانے والے اختلافات کو ایک جدول میں درج کریں -
۳- طلبہ لائے ہوئے پودوں میں سے گندم اور جڑی بوٹیوں کے پودوں کو الگ الگ کریں -

وسائل

۱- گندم کا کھیت -
۲- گندم اور جڑی بوٹیوں کے پودوں کی تصاویر -

ماڈیول نمبر ۲

جڑی بوٹیوں کی قسمیں

(طوالت سے بچنے کے لیے تفصیل نہیں دی گئی) -

ماڈیول نمبر ۳

جڑی بوٹیاں کہاں سے آتی ہیں

(طوالت سے بچنے کے لیے تفصیل نہیں دی گئی) -

ماڈیول نمبر ۴

گندم کی فصل پر جڑی بوٹیوں کے نقصان دہ اثرات :

اس ماڈیول میں طلبہ کو گندم کی فصل پر جڑی بوٹیوں کے نقصان دہ اثرات کے بارے میں بتایا گیا ہے - یہ ماڈیول مکمل کرنے کے بعد طلبہ سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے کہ :
۱- جڑی بوٹیاں زمین میں موجود گندم کے پودے کی خوراک حاصل کر لیتی ہیں -
۲- جڑی بوٹیاں پانی کے ضیاع کا باعث بنتی ہیں -

۳- جڑی بوٹیوں کے ذریعے بیماری بھی پھیلتی ہے۔
۴- جڑی بوٹیاں گندم کی پیداوار میں کمی کا باعث بنتی ہیں۔

تصورات

۱- پودوں کو مناسب غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔
۲- پودے اپنے پتوں کے ذریعے پانی کو خارج کرتے ہیں۔
۳- پودوں کی مختلف بیماریاں۔
۴- جراثیم۔
۵- پیداوار میں کمی کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں۔

نفس مضمون

۱- جڑی بوٹیاں زمین میں موجود گندم کے پودے کی غذا کا زیادہ حصہ خود استعمال کر لیتی ہیں۔

۲- جڑی بوٹیاں زمین سے پانی حاصل کرکے پتوں کے ذریعے اسے اڑا دیتی ہیں جس کی وجہ سے گندم کے پودے کے لیے پانی کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔

۳- ایک چھوٹا سا کیڑا (Stemborer) جڑی بوٹیوں پر انڈے دیتا ہے۔ جن سے بچے نکل کر بڑے ہو جاتے ہیں اور گندم کے پودے کی بیماری کا باعث بنتے ہیں۔

۴- اوپر دی ہوئی تمام وجوہات گندم کی پیداوار میں کمی کا باعث بنتی ہیں۔

تعلمی سرگرمیاں

۱- طلبہ ایک تجربہ کریں گے تاکہ یہ دیکھ سکیں کہ:

(الف) جڑی بوٹیاں گندم کے پودے کی غذا میں حصےدار بن کر اس کی نشو و نما پر کیا اثر ڈالتی ہیں۔

(ب) جڑی بوٹیاں گندم کے پودے کے پانی میں حصدار بن کر اس کی نشو و نما پر کیا اثر ڈالتی ہیں۔

تجربہ

۱- مٹی کے ایک دو گملے لیں اور دونوں میں ایک جیسی مقدار میں مٹی بھر لیں۔

۲- گملا (الف) میں گندم اور جڑی بوٹیوں کے بیج اور گملا (ب) میں صرف گندم کے بیج بوئیں۔

۳- دونوں گملوں میں برابر مقدار میں پانی ڈالیں اور دونوں کو ایک جیسی روشنی اور ہوا میں رکھیں۔

۴- جب بیج اُگ آئیں تو دونوں گملوں میں گندم کے ایک ایک پودے کے علاوہ باقی گندم کے پودے نکال دیں اس طرح گملا (الف) میں گندم کا ایک پودا اور کچھ جڑی بوٹیاں رہ جائیں گی جب کہ گملا (ب) میں صرف گندم کا ایک پودا رہ جائے گا۔

۵- تقریباً ایک ہفتے بعد گندم کے دونوں پودوں کا مشاہدہ کریں اور دونوں کی صحت، قد اور پتوں کے رنگ میں فرق معلوم کریں -

۶- ان تمام مشاہدات کو جدول میں لکھیں -

نتائج

۱- گملا (ب) میں موجود گندم کے پودے کی نشو و نما زیادہ ہوئی ہے - کیونکہ اس میں صرف گندم کے پودے نے مٹی میں موجود خوراک حاصل کی -

۲- دی گئی تصاویر میں سے طلبہ صحت مند اور بیمار پودوں کا مشاہدہ اور موازنہ کریں گے -

۳- طلبہ گندم کے کھیت میں جا کر صحت مند اور بیمار گندم کے پودوں میں فرق معلوم کریں اور ان کی پہچان کریں گے -

۴- محدب عدسے کی مدد سے طلبہ بیمار پودوں پر موجود جراثیم کا مشاہدہ کریں گے -

۵- طلبہ کو محکمہ زراعت کی تیار شدہ مختلف جدول دی جائیں گی جن میں گندم کی پیداوار پر جڑی بوٹیوں کے اثرات درج ہوں گے - طلبہ ان کا مشاہدہ و موازنہ کریں گے -

وسائل

۱- گندم کا کھیت -

۲- دو گملے ، مٹی اور ملے جلے گندم کے بیج -

۳- گندم کی پیداوار اور اس پر جڑی بوٹیوں کے اثرات ظاہر کرنے کے لیے محکمہ زراعت سے حاصل کردہ جدول -

۴- کسی ماہر زراعت یا تجربہ کار کسان کا جڑی بوٹیوں کے نقصان دہ اثرات پر لیکچر -

ماڈیول نمبر ۵

جڑی بوٹیوں کو تلف کرنا

اکتسابی جائزہ

۱- جڑی بوٹیاں گندم کے پودے کے ساتھ پیدا ہوں تو :

(الف) جڑی بوٹی کا پودا گندم کے پودے کی خوراک کھا جاتا ہے -

(ب) جڑی بوٹی کا پودا گندم کے پودے کی خوراک بن جاتا ہے -

(ج) جڑی بوٹی کا پودا گندم کے پودے کو اُگنے میں مدد دیتا ہے -

(د) جڑی بوٹی کا پودا گندم کی خوراک میں اضافہ کرتا -

۲- جڑی بوٹیاں گندم کے پودے :

(الف) کی بیماریاں رفع کرتی ہیں -

(ب) کو بیماری سے روکتی ہیں ۔

(ج) کو بیماری لگا دیتی ہیں ۔

(د) کو تقویت دیتی ہیں ۔

۳- گندم کی پیداوار :

(الف) جڑی بوٹیوں کی موجودگی میں کم ہو جاتی ہیں ۔

(ب) جڑی بوٹیوں کی وجہ سے زیادہ ہو جاتی ہے ۔

(ج) میں جڑی بوٹیوں کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔

(د) میں جڑی بوٹیوں کے اثرات کے متعلق کچھ نہیں بتایا جا سکتا ۔

۴- جڑی بوٹیاں ختم کرنے کے لیے کسان کو ایسے بیج استعمال کرنے چاہئیں جو کہ :

(الف) اعلیٰ درجے کے ہوں ۔

(ب) خالص ہوں ۔

(ج) ملے جلے ہوں ۔

(د) زیادہ مقدار میں ہوں ۔

جوابات

سابقہ واقفیت کا جائزہ

۱- ب ۔

۲- ج ۔

۳- الف ۔

۴- د ۔

۵- د ۔

اکتسابی جائزہ

۱- الف ۔

۲- ج ۔

۳- الف ۔

۴- ب ۔

سوالات

۱-تقریری طریقے کی نوعیت بیان کیجیے ۔

۲- آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے انداز تقریر پر نوٹ لکھیے ۔

۳- تقریری سبق کی تین قسموں میں کون سی قسم آپ چھٹی جماعت میں معاشرتی علوم کی تدریس کے لیے زیادہ مفید سمجھتے ہیں ؟ اپنی رائے کا مفصل اظہار کیجیے۔

۴- طریقہ داستان گوئی اور سقراطی طریقے میں کیا فرق پایا جاتا ہے ؟

۵- تقریری طریقے کو کن موقعوں پر مفید طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے ؟ مفصل بیان کیجیے۔

۶- "معاشرتی علوم کی تدریس کے لیے ملا جلا طریقہ ہی زیادہ موزوں ہے" اس بیان پر تبصرہ کیجیے۔

۷- درسی کتابی طریق کی مشہور تین صورتوں کی نشاندہی کیجیے۔ جس صورت کو آپ آٹھویں جماعت کی معاشرتی علوم کی تدریس کے لیے زیادہ موزوں سمجھتے ہیں. اسے بیان کیجیے اور ساتھ ہی اس کے جواز میں دلائل دیجیے۔

۸- استاد ، شاگرد شراکتی مطالعہ کو کس طرح زیادہ دلچسپ بنایا جا سکتا ہے ؟ وضاحت کیجیے۔

۹- مسئلی طریقہ کی نوعیت واضح طور پر بیان کیجیے۔

۱۰- مسئلی طریقہ کے اہم اقدامات کو مختصر طور پر بیان کیجیے۔

۱۱- مسئلے کے انتخاب کا کیا معیار ہے ؟ وضاحت سے بیان کیجیے۔

۱۲- جمع معلومات اور استنتاج کا آپس میں کیا تعلق ہے ؟ واضح کیجیے۔

۱۳- پاکستان کے سیاسی اور معاشرتی مسائل کے حوالہ سے معاشرتی علوم کی تدریس میں مسئلی طریقے کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

۱۴- مباحثہ سے کیا مراد ہے ؟ اس کے بنیادی عناصر کون سے ہیں ؟

۱۵- کن مقاصد کے حصول کے لیے معاشرتی علوم کی تدریس میں مباحثی طریق اختیار کیا جاتا ہے۔

۱۶- مباحثے کے لیے مناسب ماحول کیوں ضروری ہے ؟

۱۷- مباحثہ کے لیے کونسے طریق کار استعمال کیے جاتے ہیں۔ آپ کس طریق کار کو ترجیح دیں گے اور کیوں ؟

۱۸- مباحثی طریق تدریس میں استاد کا کردار کیا ہونا چاہیے ؟

۱۹- معاشرتی علوم کی تدریس کے لیے مباحثی طریق اپنانے میں کیا فائدے ہیں ؟

۲۰- تفویضی کام کی تعریف کیجیے۔

۲۱- اچھے تفویضی کام میں کیا خوبیاں ہونی چاہیں ؟

۲۲- تفویضی کام کے لیے استاد کو کون سے اقدام کرنے ہوں گے ؟

۲۳- معاشرتی علوم کی تدریس کے لیے تمثیل کاری کی کیا اہمیت ہے ؟

۴۴- جستجوئی طریقہ تدریس سے کیا مراد ہے ؟

۴۵- جستجوئی طریقہ تدریس سے طلبہ میں کون سی صلاحیتیں پیدا کرنے پر زور دیا جاتا ہے ؟

۴۶- معاشرتی علوم کی تدریس کے لیے کون سے انداز ہائے جستجو اختیار کیے جاتے ہیں ؟ ان سے طلبہ میں کون سی اہلیتیں پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے ؟

۴۷- جستجوئی طریق کے عمل اور مسئلی طریق کے عمل میں کیا فرق ہے ؟

۴۸- معاشرتی علوم کے تصورات کی نشو و نما کے لیے آپ کون سا ماڈل پسند کریں گے اور کیوں ؟

۴۹- معاشرتی علوم کی تدریس کا ایک مقصد اقدار کا تجزیہ کرنا ہوتا ہے - اقدار کا تجزیہ کرنے کے لیے کیا طریق کار اپنایا جاتا ہے ؟

۵۰- منضبط تدریس کے لازمی عناصر کون سے ہیں ؟

۵۱- منضبط تدریس کی بنیاد کن نفسیاتی اصولوں پر رکھی گئی ہے ؟

۵۲- پریسی (Pressy) اور سکنر (Skinner) کے خطی (Linear) پروگرام میں نمایاں فرق کیا ہے ؟

۵۳- سکنر کے خطی پروگرام کی خصوصیات کیا ہیں ؟

۵۴- منضبط تدریس میں سب سے اہم حصہ کون سا ہے ؟

۵۵- ایک مؤثر منضبط پروگرام کو کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے ؟

۵۶- خطی اور شاخی (Branching) پروگراموں میں کیا فرق ہے ؟

۵۷- معاشرتی علوم کی تدریس کے لیے منضبط تدریس کی تحدیدات کیا ہیں ؟

۵۸- ماڈیول کیا ہوتا ہے ؟

۵۹- معاشرتی علوم کی تدریس کے لیے ماڈیولز استعمال کرنے کے حق میں کیا دلائل دیے جا سکتے ہیں ؟

۶۰- ایک ماڈیول کے کتنے حصے ہوتے ہیں ؟ آپ کے خیال میں سب سے اہم حصہ کون سا ہے اور کیوں ؟

۶۱- ماڈیولز کی تیاری اور استعمال کے راستے میں کون سی مشکلات حائل ہیں ؟

۶۲- پاکستان کی تجارت کے موضوع پر ایک ماڈیول تیار کیجیے ؟

چوتھا باب

سبقی خاکے

سبقی اشارات کو سبقی خاکہ کہا جاتا ہے ۔ استاد ان اشارات کی مدد سے صحیح معنوں میں سبق کی تیاری کرتا ہے اور ان ہی کی روشنی میں تدریسی اقدامات کرتا ہے ۔ یہ اشارات مختصر مگر واضح ہوتے ہیں ۔ کچھ چھوٹے بڑے چند سوالات کے تحت ہی درج ہوتے ہیں ۔ ان میں نفسیات مدار تدریسی منطق اور مخصوص ترتیب پائی جاتی ہے ۔ اہم اور معنی‌خیز تصورات و حقائق محض نکات کی صورت میں مذکور ہوتے ہیں ۔ سارا سبق انڈیلنے کی کوشش نہیں کی جاتی ۔ جو کچھ پڑھانا ہو ، جس لیے پڑھانا ہو ، جس طرح پڑھانا ہو اور جس طرح طلبہ سے کام کروانا اور ان کا جائزہ لینا مطلوب ہو ان ہی امور کے حوالہ سے اشاراتی خاکہ تیار کیا جاتا ہے ۔ یہ خاکہ سراسر استاد کے ذاتی استعمال کے لیے ہوتا ہے ۔ نہ ہیڈ ماسٹر اور انسپکٹر کے استعمال کے لیے اور نہ ہی استادالاساتذہ کے لیے ۔ اس کا حق‌دار صرف وہی ہے جواسے کمرہ جماعت میں استعمال کرے ۔

سبقی خاکے مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں اور یقیناً ہوتے بھی ہیں ۔ ہر استاد اپنے مضمون اور سبق کی نوعیت اور طلبہ کی استعداد کے مطابق اپنا مخصوص سبقی خاکہ تیار کر سکتا ہے ۔ کوئی ضروری نہیں کہ ایک ہی طرز کو اپنایا جائے ۔ ہمارا ایمان ہے کہ سبقی خاکہ استاد کی ذاتی رہنمائی کے لیے ہوتا ہے ۔ جس طرح معلم موزوں سمجھے اشارات ترتیب دے دے ۔ البتہ ایسا کرتے وقت اس کے پاس واضح دلائل ہونے چاہییں ۔ اگر ہربارٹ (Herbart) اپنا پنج نکاتی تدریسی فارمولا پیش کر سکتا ہے اور درجنوں ماہرین تعلیم اور سینکڑوں ہزاروں اساتذہ اس سے اختلاف کرتے ہوئے عملاً دیگر فارمولوں پر شب و روز عمل در آمد کرتے رہتے ہیں تو ہمیں اس حق سے کیونکر محروم رکھا جا سکتا ہے ۔ لہذا جو لوگ ایک ہی طرز کے سبقی خاکہ پر اصرار کرتے ہیں وہ تدریس کی لچک اور معلم کے انفرادی ذوق اور وجدانی اپج سے بالکل بے خبر ہیں اور جو لوگ سبقی خاکہ کو غیرضروری سمجھتے ہیں وہ بھی خطا پر ہیں ۔

آپ اپنی تخلیقی قوتوں کا اظہار کیجیے اور اچھوتے سے اچھوتا خاکہ تیار کر کے پاکستانی تعلیم کی تدریسی روایات میں شاندار اضافے کیجیے ۔ اس طرح رنگا رنگ سبقی خاکے بھی ہاتھ آ جائیں گے اور ان کا معیار بھی بلند ہو جائے گا ۔ تدریس کے لیے نئے ڈیزائن دریافت کرنا اساتذہ کا فرض ہے ۔ آخر درزی بھی تو نت نئے ڈیزائن بناتے رہتے ہیں اُدھر احمد پور شرقیہ کے کمہار بھی مٹی کے ڈھیلوں سے

رنگ برنگی پھولدار صراحیاں بنا بنا کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں ۔ معاشرتی علوم کے معلم کو بھی کچھ سوچنا چاہیے :

ع شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

فوائد :

سبقی خاکہ فضول کاوش نہیں ۔ اس کے فوائد مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ منزل تدریس متعین اور واضح ہو جاتی ہے ۔

۲۔ نفس مضمون کے انتخاب اور ترتیب میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے ۔

۳۔ وسائل تدریس اور طریق تدریس کی نشاندہی معلم کو بروقت چوکس بنا دیتی ہے ۔

۴۔ معلم پہلے سے اپنی مشکلات کا اندازہ لگا کر مناسب انتظامات کی سوچ بچار میں لگ جاتا ہے ۔

۵۔ سبق کے لیے منظم اور مؤثر تیاری کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے ۔

۶۔ دوران سبق اشارات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ۔

۷۔ استاد میں اعتماد پیدا ہو جاتا ہے ۔

۸۔ پیریڈ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ۔ وقت ضائع نہیں ہونے پاتا ۔

سبقی خاکہ کے اہم خد و خال

ہر سبق کے اہم خد و خال حسب ذیل ہیں :

عنوان :

عنوان سبق کا سرنامہ ہوتا ہے ۔ یہ مختصر اور واضح ہو ۔ جس پہلو پر زور دینا مطلوب ہو اسے اجاگر کیا جائے ۔

تدریسی معاونات :

سبق میں استعمال کی جانے والی متوقع تدریسی معاونات کا ذکر کیا جائے ۔ یہ بجائے خود مقصود نہیں ۔ ان کے استعمال میں دانشمندی اور احتیاط سے کام لیا جائے ۔ ان کی اتنی بھرمار نہ کر دی جائے کہ اصل سبق پس منظر میں جا پڑے اور معلم نرا مداری بن کر رہ جائے ۔ ان کا استعمال موقعہ و محل اور ضرورت کے مطابق ہو ۔ اعتدال اور توازن ہر حال میں ضروری ہے ۔

مقاصد تدریس :

یہ دو قسم کے ہیں :

۱۔ عام مقاصد :

وہ مقاصد ہیں جو معاشرتی علوم کی عمومی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں ۔ ہر مضمون کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں ۔ عام مقاصد ان کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ یہ دو تین ہی کافی ہوتے ہیں ۔

۲- خاص مقاصد :

وہ مقاصد ہیں جو سبق کے عنوان سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں - ان پر خاص توجہ دی جائے اور اس بات کا فیصلہ کیا جائے کہ اس مخصوص سبق سے کون کون سے مقاصد حاصل کرنے مطلوب ہیں - یہ مقاصد واضح اور اہم ہوں -

مقاصد کے بعد سبقی اقدامات شروع ہوتے ہیں اور یہی سبق کی ابتدا ہے -

اقدامات :

۱- تمہید :

تمہید بچوں کی سابقہ معلومات اور زیرِ تدریس سبق میں واسطے کا کام دیتی ہے - یہ سبق کی ابتدائی اٹھان ہے - یہی بسم اللہ ہے اور بسم اللہ اچھی ہونی چاہیے - یہ سبق کے لیے محض راستہ ہموار کرتی ہے - اس میں صرف اس بات کی کوشش کی جائے کہ طلبہ کی ایسی سابقہ معلومات کا جائزہ لیا جائے جن کا پیشگی علم موجودہ سبق کے لیے ضروری ہو - تمہید سے سبق کا عنوان اخذ کرانے کی فضول کوششوں سے بچنا چاہیے - بعض اوقات اساتذہ ان چیزوں کو اخذ کرانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں جو بالکل غیرضروری ہوتی ہیں جن پر خود طلبہ کو بھی بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے - منطقی انداز میں عنوان اخذ کرانا کوئی اہم بات نہیں - معلم کو چاہیے کہ نفس مضمون کو مدنظر رکھ کر تمہید قائم کرے نہ کہ محض عنوان کے اخذ کرانے کے چکر میں گرفتار رہے - ہاں البتہ ایسے سوالات ضرور کرے جن سے سبق نیچرل نظر آنے لگے -

تمہید مختصر ہو - دو چار منٹ کافی ہیں - تمہید سوال جواب ، نقشہ ، کہانی ، چارٹ وغیرہ سے شروع کی جا سکتی ہے -

۲- اعلان سبق :

تمہیدی سوالات کے فوراً بعد معلم کو سبق کا اعلان کر دینا چاہیے -

۳- مختصر تعارف :

معلم کو سبق کی اہم باتوں کا مختصر تعارف کرا دینا چاہیے تاکہ طلبہ کو پتہ چل سکے کہ آج سبق میں کن امور کو پیش کیا جانا ہے - یہ ایک لحاظ سے مختصر پیشگی جائزہ ہے - آنے والے واقعات یا حقائق کا ہلکا سا نظارہ پیش کر دیا جائے تاکہ طلبہ کے ذوق جستجو اور دلچسپی کو مزید تحریک مل سکے - یہ نہایت اہم قدم ہے - ایک اچھا معلم اس انداز سے مختصر جائزہ پیش کرتا ہے کہ طلبہ آنے والے امور کے لیے بیحد بیتاب ہو جاتے ہیں -

۴- تفصیل و تنقید :

اس منزل میں پیش کردہ خلاصہ کی تفصیلات پیش کی جاتی ہیں - یہی سبق کا بڑا حصہ ہے اور

بیحد اہم ہے ۔ حقائق و واقعات کھول کر رکھ دیے جاتے ہیں ۔ وضاحت طلب امور کی وضاحت کی جاتی ہے ۔ متنازع امور پر تنقید اور بحث مباحثہ کیا جاتا ہے ۔ طلبہ اپنے شکوک و شبہات اور آرا کا کھلم کھلا اظہار کرتے ہیں ۔ غرض کہ معلم سبق کی گہرائی میں بھی جاتا ہے اور موضوع کو اچھی طرح پھیلا بھی دیتا ہے ۔ اسے آپ سبق کی گہرائی کہہ سکتے ہیں ۔ گویا اس منزل میں گہرائی اور گیرائی اور تفصیل و تنقید سے کام لیا جاتا ہے ۔

۵۔ نتیجہ :

پیش کردہ مواد اور بحث مباحثہ سے نتیجہ نکالنا ازبس ضروری ہے ۔ تعلیم کا یہ اہم ترین فریضہ ہے ۔ اگر تاریخی واقعات ، جغرافیائی حقائق اور معاشرتی صورت حال سے نتیجہ اخذ نہ کیا جائے تو معاشرتی علوم کی تدریس کا کیا فائدہ ۔

۶۔ اطلاق :

اطلاق کا مطلب ہے کسی چیز کو لاگو کرنا ۔ معاشرتی علوم میں نتائج کو دو طرح لاگو کیا جا سکتا ہے ۔ نظری طور پر اور عملی طور پر ۔ نظری طور پر اس طرح کہ حاصل شدہ نتائج کو کسی اور ملتے جلتے واقعہ پر چسپاں کر دیا جائے ۔ مثلاً گذشتہ قوموں کے عروج و زوال کی کہانی سے نتائج حاصل کرکے موجودہ قوموں پر لاگو کر دینا کہ فلاں قوم بھی زوال پذیر ہو جائے گی ۔ یا فلاں عروج پر چلی جائے گی ۔ عملی طور پر اطلاق ایسے ہے کہ حاصل شدہ نتائج کے مطابق کوئی ٹھوس عملی کام کیا جائے مثلاً اپنے گاؤں کا نقشہ تیار کرنا ، مسجد کا ماڈل بنانا معاشرتی اصلاح کا منصوبہ شروع کرنا ، تعمیر پاکستان کی مہم چلانا وغیرہ ۔

۷۔ اعادہ

سبق کی دہرائی کا نام اعادہ ہے ۔ تحقیق کے مطابق اگر سبق کی ضروری دہرائی کی جائے تو ۸۰ فیصد سبق پختہ ہو جاتا ہے ۔ اگر سبق اور دہرائی میں ۲۴ گھنٹوں کا فاصلہ پڑ جائے تو ۶۰ فیصد سے زائد معلومات اُڑ جاتی ہیں ۔ لہذا فوری اعادہ نہایت ضروری ہے ۔

جزوی اعادہ تو سبق کے ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے ۔ یہاں اعادہ کلی ہونا چاہیے اہم اور مناسب تعداد میں سوالات کیے جائیں ، اور اس طرح سوالات کو سبق پر پھیلا دیا جائے کہ سبق کے اہم اجزا کا اعادہ ہو جائے ۔

۸۔ گھر کا کام

مفوضہ کام کا سبق سے لازماً تعلق ہونا چاہیے ۔ پڑھائی اور تحریری دونوں طرح کا کام ہو سکتا ہے ۔ موضوع سے متعلق اگر اخبارات اور رسالوں میں مواد موجود ہو تو معلم کو گاہے گاہے ایسا کام بھی دینا چاہیے تاکہ صحیح معنوں میں معاشرتی علوم کا فہم اور لگاؤ پیدا ہو ۔ کام نہ بہت زیادہ ہو اور نہ ہی

بہت کم - بہرحال معلم معاشرتی علوم کو احساس رہے کہ طلبہ کو اور مضامین میں بھی گھر پر کرنے کے لیے کام ملتا رہتا ہے -

طلبہ کو محض نقل نویسی کی مشق نہ کرائی جائے - بلکہ اس طرح کے سوالات دیے جائیں کہ طلبہ کو کتاب میں سے جواب ڈھونڈنا پڑے - ہر روز بنا بنایا جواب نہ مل جائے -

سوالات

۱- سبقی خاکے کی نوعیت اور اس کے فوائد بیان کیجیے -
۲- سبقی خاکے کے اہم خد و خال کا خاکہ پیش کیجیے -
۳- سبق کے اقدامات کو بالتفصیل بیان کیجیے -
۴- سبق میں تمہید کی نوعیت پر مختصر نوٹ لکھیے -

نمونے کے اسباق کے خاکے

خاکہ نمبر ۱

موضوع : تحریک پاکستان
جماعت : ہشتم
وقت : ۳۵ منٹ

(الف) تدریسی معاونات :

طبع شدہ مواد جو کہ مندرجہ ذیل ذرائع سے حاصل کیا جائے گا -

۱- درسی کتاب معاشرتی علوم برائے جماعت ہشتم -
۲- اضافی کتب مثلاً پاکستان ناگزیر تھا اور تحریک پاکستان -
۳- یوم جمہوریہ اور یوم استقلال کے موقع پر پاکستان کے متعلق اخبارات اور رسائل میں شائع ہونے والے مضامین -

(ب) سمعی و بصری معاونات :

۱- سرسید ، علامہ اقبال ، قائداعظم اور لیاقت علی خان کی تصاویر -
۲- نقشہ پاکستان ، نقشہ برصغیر پاک و ہند -
۳- چارٹ جس پر قرار داد پاکستان کا متن درج ہے -

مقاصد تدریس

(الف) عام مقاصد :

۱- طلبہ کو باشعور محب وطن شہری بنانا -
۲- طلبہ کے اندر تنقیدی انداز فکر پیدا کرنا -
۳- معاشرتی تبدیلیاں قبول کرنے کے لیے طلبہ کو ذہنی طور پر تیار کرنا -

(ب) خاص مقاصد :

معلوماتی مقاصد (Cognitive)

۱- نظریہ پاکستان سے روشناس کرانا ۔
۲- تحریک پاکستان کے مقاصد بتانا ۔
۳- دو قومی نظریہ سے واقفیت دلانا ۔
۴- برطانوی ہندوستان کی تقسیم کی ضرورت کو سمجھنا ۔
۵- قومیت کی اسلامی بنیادوں کو جاننا ۔

حسیاتی مقاصد (Affective) :

۱- اسلام اور پاکستان سے محبت پیدا کرنا ۔
۲- پاکستان کے شاندار مستقبل کا احساس دلانا ۔
۳- پاکستان کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کا جذبہ پیدا کرنا ۔
۴- اسلامی طرز زندگی کے ارفع و اعلیٰ ہونے پر یقین محکم پیدا کرنا ۔
۵- ہر پاکستانی کو اپنا بھائی سمجھنے کا رجحان پیدا کرنا ۔

عملی مقاصد (Psyco-Motor Skill) :

۱- پاکستان کی نظریاتی اساس کی منطقی طور پر حفاظت کی اہلیت پیدا کرنا ۔
۲- مختلف ذرائع سے معلومات اکٹھی کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ۔
۳- مختلف مسائل پر اظہار رائے کرنے کے قابل بنانا -
۴- مسائل پر غور و فکر کرنے کا مادہ پیدا کرنا ۔

اقدامات

۱- بنیادی تصورات :

(الف) دو قومی نظریہ ، ہندو اور مسلم ثقافت میں نمایاں اختلافات ہیں ۔
(ب) برصغیر کے مسلمان انگریزوں اور ہندوؤں دونوں سے آزادی چاہتے تھے ۔
(ج) مسلم اکثریت والے علاقے ہندوستان کے مشرق اور مغرب میں ایک ساتھ واقع تھے ۔
(د) مسلمان اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے تھے ۔
(ر) مسلمان اردو کو اپنی قومی زبان سمجھتے تھے ۔

۲- تمہید :

۱- طلبہ جانتے ہیں کہ ہم ہر سال ۱۴- اگست کو یوم استقلال مناتے ہیں کیونکہ اس روز پاکستان کی آزاد اسلامی مملکت وجود میں آئی تھی ۔

۳- سبق کا تعارف :

۲- طلبہ اخبارات میں ہندوستان کے مسلم کش فسادات کے متعلق خبریں پڑھتے رہتے ہیں ۔

اس احساس کے تحت کہ انگریزوں سے آزادی ملنے کے بعد ہندو مسلمانوں سے ان کے ہزار سالہ عہد حکومت کا انتقام لیں گے اور انہیں اپنی خواہشات کے مطابق زندگی بسر نہیں کرنے دیں گے ۔ مسلمانوں نے ہندوؤں اور انگریزوں دونوں سے بیک وقت آزادی حاصل کرنے کے لیے پاکستان کی تحریک شروع کی ۔

۴- استحضار :

تحریک پاکستان کی بنیادی وجہ ۔
مسلمان اسلامی نظریہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے تھے ۔
تحریک پاکستان کی ذیلی وجوہات :

۱- ثقافتی ۔
۲- معاشی ۔
۳- جغرافیائی ۔
۴- تاریخی ۔

۵- سرگرمیاں :

۱- طلبہ مینار پاکستان کا مطالعاتی دورہ کریں اور مینار پر کندہ قرار داد پاکستان کا متن اپنی نوٹ بکس میں نقل کریں ۔

۲- ایسی تصاویر اکٹھی کریں جن سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی اور معاشرتی اختلافات واضح ہوتے ہیں ۔

۳- قائداعظم نے پاکستان کے شاندار مستقبل کے متعلق اپنی تقاریر میں جو کچھ فرمایا ہے اسے اکٹھا کر کے کلاس میں رپورٹ پیش کی جائے ۔

۴- پاکستان کے قیام کا منطقی جواز رپورٹ کی شکل میں کلاس میں پیش کیا جائے ۔

۶- جائزہ :

۱- دو قومی نظریہ سے کیا مراد ہے ؟
۲- مسلمان اپنے آپ کو ہندوؤں سے الگ قوم کیوں سمجھتے تھے ؟
۳- مسلمان پاکستان کیوں حاصل کرنا چاہتے تھے ؟
۴- ہندوستان سے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد مسلمانوں کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا ؟
۵- ہندوستان کے کن صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی ہندوؤں سے زیادہ تھی ؟

۶- قرار داد پاکستان کیوں پاس کی گئی ؟

۷- طلبہ کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے گا اور ان کی کارکردگی کے مطابق انھیں نمبر دیے جائیں گے۔

خاکہ نمبر ۲

عنوان : آبادی میں اضافہ اور اس کے اثرات

جماعت : ہشتم

وقت : ۳۵ منٹ

تدریسی معاونات :

(الف) طبع شدہ :

۱- معاشرتی علوم کی درسی کتاب برائے جماعت ہشتم۔

۲- ۱۹۵۱ء ، ۱۹۶۱ء، ۱۹۷۲ء ۱۹۸۱ء میں پاکستان میں ہونے والی مردم شماری کی رپورٹیں۔

۳- محکمہ خوراک و زراعت کا شائع شدہ زرعی اجناس کی پیداوار کے متعلق لٹریچر۔

۴- تعلیمی سہولتوں کے متعلق محکمہ تعلیم کی طرف سے شائع شدہ اعداد و شمار۔

۵- طبی سہولتوں کے متعلق محکمہ صحت کی طرف سے شائع شدہ اعداد و شمار۔

(ب) سمعی بصری معاونات :

۱- پچھلے دس سالوں کے دوران پاکستان میں فی کس آمدنی میں اضافہ کا چارٹ۔

۲- ایک چارٹ جس میں ۱۹۵۱ء ، ۱۹۶۱ء، ۱۹۷۲ء ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی میں اضافے کے رجحان کو ظاہر کیا گیا ہو۔

۳- ایک چارٹ جس میں پچھلے دس سالوں کے دوران پاکستان میں مندرجہ ذیل اشیاء کی پیداوار اور کھپت دکھائی گئی ہوں۔

گندم ، دالیں ، چاول ، کھانڈ ، گوشت ، دودھ اور انڈے۔

مقاصد تدریس :

عام مقاصد : ۱- طلبہ کو باشعور محب وطن بنانا۔

۲- طلبہ کے اندر تنقیدی انداز فکر پیدا کرنا۔

۳- معاشرتی تبدیلیاں قبول کرنے کے لیے طلبہ کو ذہنی طور پر تیار کرنا۔

خاص مقاصد : (نوٹ) یہ مقاصد کرداری انداز (Behavioural terms) میں بیان کیے گئے ہیں اس یونٹ کی تدریس کے ذریعے حسب ذیل مقاصد حاصل کیے جائیں گے۔

۱- معلوماتی مقاصد (Cognitive) :

اس یونٹ کی تدریس کے بعد طلبہ کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ :

۱- گذشتہ دس سالوں میں پاکستان کی آبادی میں ہونے والے اضافہ کو بیان کر سکیں۔
۲- آبادی میں غیر معمولی اضافے سے پیدا ہونے والے ان مسائل کو بیان کر سکیں:

(الف) فی کس آمدنی میں اضافے کی شرح پر اثر۔
(ب) اشیاء کی قیمتوں پر اثر۔
(ج) تعلیمی سہولتوں پر اثر۔
(د) صحت کی سہولتوں پر اثر۔

۳- وضاحت کر سکیں کہ آبادی میں اضافہ غذائی ضروریات کو متاثر کرتا ہے۔
۴- آبادی میں اضافہ، زرعی پیداوار اور انتقال آبادی کے باہمی تعلق کو بیان کر سکیں۔
۵- آبادی میں اضافہ اور ملک کی مجموعی ترقی کی رفتار کے باہمی تعلق کو بتا سکیں۔

۲- حسیاتی مقاصد (Affective):

اس یونٹ کی تدریس کے بعد طلبہ کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ:

۱- دلائل دے سکیں کہ آبادی کی منصوبہ بندی خاندانی سطح پر اور قومی سطح پر کیوں ضروری ہے۔

۲- دلائل سے ثابت کر سکیں کہ پسماندگی کی ایک وجہ آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہے۔

۳- ملکی ترقی کے لیے ہر شعبہ میں پیداوار میں اضافہ اور استعمال میں کفایت کی اہمیت و ضرورت پر دلائل دے سکیں۔

۴- آبادی میں غیر معمولی اضافہ سے پیدا ہونے والے مسائل پر بحث کر سکیں۔

۵- آبادی کی نوعیت (Composition of Population) اور ملکی ترقی کے لیے اس کے مضمرات پر بحث کر سکیں۔

۳- عملی مقاصد (Psycho-Motor Skills):

اس یونٹ کی تدریس کے بعد طلبہ بارگراف بنا سکیں جن کی مدد سے پچھلے دس سالوں کے دوران پاکستان میں:

۱- آبادی میں اضافے کے رجحان کو ظاہر کیا گیا ہو۔
۲- اشیاء کی پیداوار اور اس کی کھپت دکھائی گئی ہو۔
۳- تعلیمی اور طبی سہولتوں میں اضافے کے رجحان کو دکھایا گیا ہو۔

اقدامات

۱- بنیادی تصورات:

۱- پاکستان کی آبادی میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

۲- آبادی میں اضافہ خوراک کی مقدار اور معیار پر اثر ڈالتا ہے -

۳- آبادی میں اضافہ زرعی پیداوار پر اثر انداز ہوتا ہے جس سے انتقال آبادی کا رجحان بڑھتا ہے -

۴- آبادی میں اضافہ سے لوگوں کے لیے مختلف مسائل پیدا ہو جاتے ہیں -

۵- خوش حالی کے لیے ملکی وسائل کو ترقی دینے اور آبادی کی منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت ہے -

۲- تمہید :

۱- طلبہ جانتے ہیں کہ اکثر اوقات بازار سے ضروریات زندگی مثلاً آٹا ، گھی ، کھانڈ ، مٹی کا تیل وغیرہ آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی ہیں - اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں - ان میں سے ایک اہم وجہ آبادی میں اضافہ ہے -

۲- ہر روز بسوں میں مسافروں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور سڑکوں پر ٹریفک کا بڑھتا ہوا ہجوم طلبہ کے مشاہدہ میں آتا ہے جن کی وجہ سے مسافروں اور پیدل چلنے والوں کے لیے کئی مشکلات پیدا ہوگئی ہیں -

۳- سبق کا تعارف :

پاکستان میں آبادی کے اضافے کی رفتار بڑی تیز ہے - پاکستان نے گذشتہ ۳۵ سالوں میں خاطر خواہ ترقی کی ہے ، لیکن تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی نے ملکی ترقیاتی منصوبوں کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے ، اور ہمارے لیے کئی طرح کے مسائل پیدا کیے ہیں -

۴- استحضار :

۱- ۱۹۵۱ء سے ۱۹۸۱ء تک پاکستان کی آبادی میں فیصد اضافہ -

۲- پاکستان میں فی کس آمدنی -

۳- کثرت آبادی اور غذائی ضروریات -

۴- کثرت آبادی ، ضروریات زندگی اور انتقال آبادی -

۵- آبادی اور اشیاء کی قیمتیں -

۶- آبادی اور تعلیمی سہولتیں -

۷- آبادی اور صحت کی سہولتیں -

۸- کثرت آبادی ، خوراک اور کام کرنے کی صلاحیت -

۵- سرگرمیاں :

۱- مقامی مرکز صحت کے انچارج سے مل کر طلبہ اچھی خوراک اور صحت کے بارے میں معلومات حاصل کریں -

۲- طلبہ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کا چارٹ تیار کر کے آبادی میں اضافہ کے رجحان کو ظاہر کریں۔

۳- خاندانی منصوبہ بندی کے مقامی دفتر کے تعاون سے طلبہ کو فلم دکھائی جائے جو آبادی میں غیر معمولی اضافے سے پیدا ہونے والے مسائل پر روشنی ڈالتی ہو۔

۴- طلبہ اپنے محلہ یا گاؤں میں آبادی میں اضافے سے پیدا شدہ مسائل کا سروے کر کے رپورٹ پیش کریں۔

۵- طلبہ بارگراف کے ذریعے پچھلے دس سالوں میں سکول کی تعداد میں اضافہ کو ظاہر کریں۔

۶- جائزہ :

۱- پاکستان کی موجودہ آبادی کتنی ہے ؟

۲- ۱۹۵۱ء سے ۱۹۸۱ء تک پاکستان کی آبادی میں کتنا اضافہ ہوا ہے ؟

۳- آبادی میں بہت زیادہ اضافے کی شرح سے خوراک کی پیداوار اور اس کے معیار پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں ؟

۴- آبادی اور جسمانی صحت کے نقطہ نظر سے صحت مند قوم پیدا کرنے کے لیے کیا اقدام کرنے ضروری ہیں ؟

۵- دیہات کی بہترین افرادی قوت شہروں میں کیوں منتقل ہونا شروع ہو جاتی ہے ؟

۶- آبادی میں اضافہ مندرجہ ذیل کو کس طرح متاثر کرتا ہے ؟

(الف) تعلیمی سہولتیں۔

(ب) صحت کی سہولتیں۔

(ج) فی کس آمدنی۔

(د) اشیاء کی قیمتیں۔

خاکہ نمبر ۳

عنوان : ذرائع آمد و رفت

جماعت : ششم

وقت : ۳۵ منٹ

تدریسی معاونات :

(الف) طبع شدہ :

۱- معاشرتی علوم کی درسی کتاب برائے جماعت ششم۔

۲- موضوع سے متعلق سکول لائبریری میں موجود کتب۔

(ب) سمعی بصری معاونات

۱- قدیم اور جدید ذرائع آمد و رفت کا تصویری چارٹ۔

۲- پاکستان کا نقشہ جس میں مندرجہ ذیل کو ظاہر کیا گیا ہو۔

(الف) پورٹ محمد بن قاسم اور کراچی کی بندرگاہ۔
(ب) کراچی کو پشاور اور کوئٹہ کے ساتھ ملانے والی سڑک۔
(ج) کراچی کو پشاور اور کوئٹہ کے ساتھ ملانے والی ریلوے لائن۔
(د) اسلام آباد، کراچی، کوئٹہ، لاہور اور ڈیرہ اسماعیل خاں کو ملانے والے ہوائی راستے۔

مقاصد تدریس

(الف) عام مقاصد:

۱- طلبہ کو باشعور محب وطن بنانا۔
۲- طلبہ کے اندر تنقیدی انداز فکر پیدا کرنا۔
۳- معاشرتی تبدیلیاں قبول کرنے کے لیے طلبہ کو ذہنی طور پر تیار کرنا۔

(ب) خاص مقاصد:

یہ مقاصد کرداری انداز (Behavioural terms) میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس یونٹ کی تدریس کے ذریعے حسب ذیل خاص مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۱- معلوماتی مقاصد:

اس یونٹ کی تدریس کے بعد طلبہ کو اس قابل ہو جانا چاہیے کہ وہ

۱- سفر کے لیے استعمال ہونے والے ان ذرائع کو بیان کر سکیں۔

(الف) سواری کے جانور۔ گھوڑا، اونٹ، خچر۔
(ب) تانگہ، بگھی، چھکڑا، بائسیکل۔
(ج) سکوٹر، رکشا، کار، بس، ٹرک۔
(د) ریل گاڑی۔
(ر) ہوائی جہاز۔
(س) دریائی کشتی۔
(ص) بحری جہاز۔

۲- بار برداری کے لیے سست رفتار اور تیز رفتار ذرائع آمد و رفت کو بیان کر سکیں۔

۳- بتا سکیں کہ ملکی ترقی کے لیے ذرائع آمد و رفت میں ترقی کیوں ضروری ہے؟

۲- حسیاتی مقاصد :

اس یونٹ کی تدریس کے بعد طلبہ کو اس قابل ہو جانا چاہیے کہ وہ

۱- ذرائع آمد و رفت کی حفاظت کے لیے دلائل دے سکیں۔
۲- دلائل سے ثابت کر سکیں کہ پسماندگی کی ایک وجہ ذرائع آمد و رفت کی کمی اور سست روی ہے۔
۳- ٹریفک کے آئے دن کے حادثات کی وضاحت کر سکیں۔
۴- ٹریفک قوانین پر پوری طرح عمل کرنے کی ضرورت و اہمیت پر بحث کر سکیں۔

۳- عملی مقاصد :

اس یونٹ کی تدریس کے بعد طلبہ بارگراف بنا سکیں۔ جن کی مدد سے پچھلے دس سالوں کے دوران میں۔

۱- سڑکوں کی لمبائی میں اضافہ کو ظاہر کیا گیا ہو۔
۲- ریل کی پٹڑی کی لمبائی میں اضافہ کو دکھایا گیا ہو۔
۳- ریل کے انجن اور ڈبوں کی تعداد میں اضافہ کو ظاہر کیا گیا ہو۔
۴- بحری جہازوں اور ہوائی جہازوں کی تعداد میں اضافہ کو دکھایا گیا ہو۔

اقدامات :

۱- بنیادی تصورات

۱- سفر کے لیے مختلف ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں۔
۲- ملکی ترقی کے لیے ذرائع آمد و رفت میں ترقی اور اصلاح ضروری ہے۔
۳- ذرائع آمد و رفت کی حفاظت ضروری ہے۔
۴- ٹریفک کے حادثات روکنے کے لیے ٹریفک کے قوانین پر عمل ضروری ہے۔

۲- تمہید

۱- طلبہ پیدل ، سائیکل ، بس یا ریل گاڑی کے ذریعے روزانہ سکول آتے ہیں۔
۲- طلبہ نے اکثر ٹریفک کے حادثات دیکھے ہوں گے یا ان کے متعلق پڑھا یا سنا ہوگا۔

۳- سبق کا تعارف

ملک کی ترقی میں ذرائع آمد و رفت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرائع آمد و رفت کی ترقی ، تیز رفتاری اور بہتر سہولتوں سے کسی ملک کی ترقی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے ذریعے افراد ایک جگہ سے دوسری جگہ بآسانی اور تیزی سے پہنچ جاتے ہیں۔ اشیاء کو بھی ایک مقام سے دوسرے مقام تک آسانی سے پہنچایا جا سکتا ہے۔

۴- استحضار

۱- پرانے زمانے میں استعمال ہونے والے ذرائع آمد و رفت۔

۲- موجودہ زمانے کے تیز رفتار ذرائع آمد و رفت ۔
۳- ملکی ترقی میں ذرائع آمد و رفت کا کردار ۔
۴- پچھلے دس سالوں کے دوران پاکستان میں سڑکوں اور ریلوے لائن کی لمبائی میں اضافہ ۔
۵- ٹریفک کے حادثات اور ان کی روک تھام ۔
۶- ہوائی اور سمندری سفر میں اضافہ ۔
۷- ذرائع آمد و رفت کی حفاظت ۔

۵- سرگرمیاں

۱- طلبہ سے ذرائع آمد و رفت کا تصویری البم تیار کرایا جائے ۔
۲- طلبہ سے قدیم اور جدید ذرائع آمد و رفت کے علیحدہ چارٹ تیار کروائے جائیں ۔
۳- پاکستان کے نقشے کے خاکہ میں

(الف) پشاور سے کراچی تک مین لائن اور اس پر واقع مشہور اسٹیشن دکھائے جائیں ۔

(ب) پشاور کو لاہور اور لاہور کو کوئٹہ سے ملانے والی سڑک اور اس پر مشہور شہر دکھائے جائیں ۔

۴- طلبہ روڈ ٹرانسپورٹ کے مقامی دفتر میں جا کر روڈ ٹرانسپورٹ کے مسائل معلوم کرکے ان کی رپورٹ کلاس میں پیش کریں ۔

۵- طلبہ مقامی اسٹیشن ماسٹر سے مل کر ریلوے کے مسائل معلوم کریں اور مسافروں کو درپیش مشکلات کی رپورٹ کلاس میں پیش کریں ۔

۶- جائزہ

۱- تین پرانے اور تین نئے ذرائع آمد و رفت بیان کریں ۔
۲- نئے ذرائع آمد و رفت پرانے ذرائع آمد و رفت سے کیوں بہتر ہیں ؟
۳- ملکی ترقی میں ذرائع آمد و رفت کیا کردار ادا کرتے ہیں ؟
۴- صحیح جواب پر ( ) کا نشان لگائیں ۔

پاکستان میں حادثات کی وجہ ۔

(الف) کم چوڑی سڑکیں ہیں ۔

(ب) بسوں کی تیز رفتاری ہے ۔

(ج) بس ڈرائیوروں کی نا تجربہ کاری ہے ۔

(د) گنجائش سے زیادہ سواریاں بٹھانا ہے ۔

(ر) ٹریفک کے قوانین پر عمل نہ کرنا ہے ۔

(س) مندرجہ بالا تمام وجوہات ۔

۵- ذرائع آمد و رفت کی حفاظت کیوں ضروری ہے ؟

خاکہ نمبر ۴

عنوان : برصغیر میں مسلمانوں کی آمد

جماعت : ششم

وقت : ۳۵ منٹ

تدریسی معاونات

(الف) طبع شدہ :

۱- معاشرتی علوم کی درسی کتاب برائے جماعت ششم ۔

۲- موضوع سے متعلق لائبریری میں موجود کتب ۔

(ب) سمعی و بصری معاونات :

۱- مشرق وسطیٰ اور برصغیر پاک و ہند کے نقشے کا خاکہ جس میں محمد بن قاسم کی آمد کا راستہ دکھایا گیا ہو ۔

۲- محمد بن قاسم کی تصویر پر مبنی چارٹ ۔

مقاصد تدریس :

عام مقاصد

۱- طلبہ کو باشعور محب وطن بنانا ۔

۲- طلبہ کے اندر تنقیدی انداز فکر پیدا کرنا ۔

۳- معاشرتی تبدیلیاں قبول کرنے کے لیے طلبہ کو ذہنی طور پر تیار کرنا ۔

خاص مقاصد

اس سبق کی تدریس سے حسب ذیل مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی ۔

معلوماتی مقاصد

اس سبق کی تدریس کے بعد طلبہ کو اس قابل ہو جانا چاہیے کہ وہ :

۱- بتا سکیں کہ مسلمانوں نے برصغیر پر حملہ کب اور کیوں کیا ؟

۲- محمد بن قاسم کے برصغیر پر حملہ کے اثرات بیان کر سکیں ۔

۳- بتا سکیں کہ محمد بن قاسم کے حملے کے نتیجہ میں سندھ اور پنجاب میں قائم ہونے والی اسلامی حکومت غیر مسلم حکومت سے بہتر اور عادل تھی ۔

حسیاتی مقاصد

اس سبق کی تدریس کے بعد طلبہ کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ :

۱- دلائل سے ثابت کر سکیں کہ برصغیر پر مسلمانوں کا حملہ لوگوں کو مظالم سے نجات دلانے کے لیے تھا۔

۲- واضح کر سکیں کہ اس حملہ سے برصغیر میں اشاعت اسلام کے لیے راستہ کھل گیا۔

علمی مقاصد

اس سبق کی تدریس کے بعد طلبہ کو اس قابل ہو جانا چاہیے کہ وہ برصغیر کے نقشہ کے خاکہ میں :

۱- محمد بن قاسم کی آمد کا راستہ دکھا سکیں۔

۲- وہ مقامات دکھا سکیں جو محمد بن قاسم نے فتح کیے تھے۔

اقدامات :

۱- بنیادی تصورات :

۱- سندھ کی بندرگاہ دیبل کے قریب مسلمانوں کا جہاز لوٹ کر عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا گیا تھا۔

۲- سندھ کے راجہ داہر نے مسلمان عورتوں اور بچوں کو واپس کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

۳- مسلمان عورتوں اور بچوں کو رہا کرانے اور راجہ داہر کو سزا دینے کے لیے محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا تھا۔

۴- محمد بن قاسم نے سندھ اور ملتان کا علاقہ فتح کر لیا تھا۔

۵- مسلمانوں نے مفتوحہ علاقے میں عادل حکومت قائم کی تھی۔

۲- تمہید :

۱- طلبہ جانتے ہیں کہ آٹھویں صدی عیسوی میں کراچی کے قریب دیبل کی بندرگاہ واقع تھی۔

۲- دیبل کی بندرگاہ راجہ داہر کے بحری قزاقوں کا اڈہ تھی جہاں سے وہ سمندری جہازوں پر حملہ کر کے انھیں لوٹ لیتے تھے۔

۳- سبق کا اعلان :

اپنے شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کرنا ہر مہذب حکومت کا فرض ہوتا ہے۔ اگر کوئی شہری کسی دوسرے ملک میں مصیبت میں پھنس جائے تو متعلقہ حکومت کا فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے شہری کی مصیبت کو دور کرنے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائے۔ حجاز کے گورنر حجاج بن یوسف نے مصیبت میں گرفتار مسلمانوں کی رہائی کے لیے سندھ پر حملہ کے لیے لشکر بھیجا۔

۴- استحضار

۱- سندھ پر مسلمانوں کے حملے کی وجوہات ۔

۲- واقعات ۔

۳- محمد بن قاسم کی فتوحات ۔

۴- محمد بن قاسم کی واپسی اور انجام ۔

۵- سندھ اور ملتان میں اسلامی حکومت کا قیام ۔

۶- سندھ اور ملتان میں مسلمانوں کا نظام حکومت ۔

۵- سرگرمیاں

۱- طلبہ برصغیر ہند و پاک کے خاکہ میں :

(الف) محمد بن قاسم کی آمد کا راستہ ظاہر کریں ۔

(ب) وہ مقامات دکھائیں جن کو محمد بن قاسم نے فتح کیا تھا ۔

۲- دیبل کے قلعہ پر حملہ میں استعمال ہونے والی منجنیق کا تصویری خاکہ حاصل کر کے کلاس کو دکھایا جائے ۔

۳- منجنیق کے تاریخی پس منظر پر رپورٹ لکھ کر کلاس میں پیش کی جائے ۔

۶- جائزہ

۱- مسلمانوں نے سندھ پر کب اور کیوں حملہ کیا ؟

۲- منجنیق کسے کہتے ہیں ؟ لڑائیوں میں اس سے کیا کام لیا جاتا تھا ؟

۳- محمد بن قاسم کو واپس کیوں بلایا گیا ؟ واپس بلا کر اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ؟

۴- مسلمانوں نے سندھ میں کس قسم کا نظام حکومت قائم کیا ؟

۵- ہندو مسلمانوں کے نظام حکومت سے کیوں خوش تھے ۔

۶- سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے کے کیا اثرات مرتب ہوئے ؟

خاکہ نمبر ۵

عنوان : پاکستان اور عالم اسلام

جماعت : ہشتم

وقت : ۳۵ منٹ

تدریسی معاونات

(الف) طبع شدہ :

۱- معاشرتی علوم کی درسی کتاب برائے جماعت ہشتم ۔

۲۔ موضوع سے متعلق سکول لائبریری میں موجود کتب ۔

۳۔ اخبارات اور رسائل میں موضوع سے متعلق چھپے ہوئے مضامین ۔

۴۔ پاکستان میں منعقدہ دوسری سربراہی کانفرس کی رپورٹ ۔

(ب) سمعی و بصری معاونات :

۱۔ دنیا کے نقشے کا خاکہ جس میں عالم اسلام کو سبز رنگ سے ظاہر کیا گیا ہو ۔

۲۔ عالم اسلام کی کل آبادی ، رقبے اور وسائل پر مبنی چارٹ ۔

۳۔ چارٹ جس میں اسلامی ممالک کے جھنڈے دیے ہوئے ہوں ۔

مقاصد تدریس :

عام مقاصد :

۱۔ طلبہ کو باشعور محب وطن شہری بنانا ۔

۲۔ طلبہ کے اندر تنقیدی انداز فکر پیدا کرنا ۔

۳۔ معاشرتی تبدیلیاں قبول کرنے کے لیے طلبہ کو ذہنی طور پر تیار کرنا ۔
(کرداری انداز میں)

خاص مقاصد

اس یونٹ کی تدریس کے ذریعے حسب ذیل خاص مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی ۔

معلوماتی مقاصد

اس یونٹ کی تدریس کے بعد طلبہ اس قابل ہو جانے چاہئیں کہ وہ :

۱۔ امت اسلامیہ کا تصور بیان کر سکیں ۔

۲۔ بتا سکیں کہ قیام پاکستان سے پہلے مسلمانان پاک و ہند امت اسلامیہ کے بارے میں کیا جذبات رکھتے تھے ۔

۳۔ مسئلہ فلسطین کے بارے میں عربوں کے موقف کو بیان کر سکیں ۔

۴۔ پاکستان اور عرب ممالک کے درمیان برادرانہ تعلقات کو بیان کر سکیں ۔

۵۔ عالم اسلام کے درمیان اتحاد کی غرض و غایت بیان کر سکیں ۔

۶۔ علاقائی تعاون برائے ترقی کے معاہدہ کو بیان کر سکیں ۔

حسیاتی مقاصد

اس یونٹ کی تدریس کے بعد طلبہ اس قابل ہو جانے چاہئیں کہ وہ :

۱۔ دفاعی نقطہ نظر سے عالم اسلام کی جغرافیائی اہمیت کو ثابت کر سکیں ۔

۲۔ عالمی امن کے لیے عالم اسلام کے اتحاد کی ضرورت و اہمیت کی وضاحت کر سکیں ۔

۳- دلائل دے سکیں کہ اسلامی ممالک کی علاقائی سالمیت اور تحفظ کے لیے عالم اسلام کا اتحاد ضروری ہے۔

عملی مقاصد

طلبہ عالم اسلام کے متعلق مندرجہ ذیل معلومات اکٹھی کر کے ایک جامع رپورٹ تیار کر سکیں:

۱- آبادی۔
۲- رقبہ۔
۳- زرعی وسائل۔
۴- تیل اور گیس کے وسائل۔
۵- معدنی وسائل۔
۶- صنعتی وسائل۔
۷- فوجی وسائل۔

اقدامات

۱- بنیادی تصورات

۱- امت اسلامیہ کا تصور جدید نہیں قدیم ہے۔
۲- عالم اسلام کے مسائل مشترکہ ہیں۔
۳- ان مسائل کو مشترکہ جد و جہد سے حل کیا جا سکتا ہے۔
۴- اسلامی سربراہی اور وزراء خارجہ کی کانفرنسوں کے دور رس نتائج نکلے ہیں۔
۵- عالم اسلام کے اتحاد میں پاکستان نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

۲- تمہید

۱- طلبہ مسئلہ فلسطین، مسئلہ کشمیر، قبرص اور اریٹیریا کے مسلمانوں کے مسائل کے متعلق جانتے ہیں۔

۲- طلبہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ مسائل آج تک اس لیے حل نہیں ہو سکے کیونکہ عالم اسلام میں اتحاد نہیں تھا۔

۳- سبق کا تعارف

پاکستان نے ہمیشہ ہر اسلامی ملک کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھا ہے۔ پاکستان نے اسلامی ممالک کو آپس میں قریب تر لانے اور ان کے درمیان اتحاد و یگانگت پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے اسلامی ممالک کے ساتھ تعلقات نہایت دوستانہ اور برادرانہ ہیں۔ اس یونٹ میں امت اسلامیہ کے تصور، امت اسلامیہ کے بارے میں برصغیر کے مسلمانوں کے جذبات،

علاقائی تعاون برائے ترقی کا معاہدہ ، پاکستان کے سعودی عرب ، لیبیا ، ایران ، عرب امارات ، انڈونیشیا اور افغانستان سے تعلقات ، مسئلہ فلسطین اور اسلامی سربراہی کانفرنس کے بارے میں بحث کی گئی ہے ۔

٤۔ استحضار

١۔ امت اسلامیہ کا تصور ۔
٢۔ عالم اسلام سے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے تعلقات ۔
٣۔ پان اسلام ازم کی تحریک ۔
٤۔ علاقائی تعاون برائے ترقی ، مقاصد اور انتظامی ڈھانچہ ۔
٥۔ فلسطین کا مسئلہ ، قبرص کا مسئلہ ۔
٦۔ پاکستان اور عرب ممالک ۔
٧۔ پاکستان اور ایران ۔
٨۔ پاکستان اور انڈونیشیا ۔
٩۔ اسلامی سربراہی کانفرنس ۔
١٠۔ پاکستان اور افغانستان ۔

٥۔ سرگرمیاں

١۔ طلبہ دنیا کے نقشے کے خاکے میں اسلامی ممالک دکھائیں ۔

٢۔ طلبہ کو اسلامی سربراہی مینار لاہور کی سیر کرائی جائے ۔ طلبہ مینار پر لکھے ہوئے شریک ممالک کے نام نوٹ کریں اور دنیا کے نقشے میں ان ممالک کو تلاش کریں ۔

٣۔ طلبہ اسلامی سربراہی کانفرنس منعقدہ لاہور میں شریک ممالک کے سربراہوں کی تصاویر کا البم تیار کریں ۔

٤۔ طلبہ اسلامی سربراہی کانفرنس منعقدہ لاہور کے شریک ممالک کے متعلق مندرجہ ذیل معلومات اکٹھی کر کے کلاس میں رپورٹ پیش کریں ۔

آبادی ، رقبہ ، زرعی وسائل ، تیل اور گیس کے وسائل ، صنعتی وسائل ، معدنی وسائل ، فی کس آمدنی اور شرح خواندگی ۔

٥۔ طلبہ علاقائی ترقی برائے تعاون کے معاہدہ کے مقاصد کا چارٹ تیار کریں ۔

٦۔ طلبہ مسئلہ فلسطین کے بارے میں پاکستان کے مؤقف کی رپورٹ کلاس میں پیش کریں ۔

٦۔ جائزہ

١۔ امت اسلامیہ کے تصور کی وضاحت کریں ۔
٢۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے امت اسلامیہ کے متعلق کیا جذبات ہیں ؟

۳- علاقائی تعاون برائے ترقی کے معاہدہ کے مقاصد بیان کریں ۔

۴- پاکستان اور سعودی عرب کے تعلقات پر بحث کریں ۔

۵- مسئلہ فلسطین کے بارے میں پاکستان کے کردار کو بیان کریں ۔

٦- عالم اسلام کے درمیان اتحاد کی ضرورت و اہمیت پر بحث کریں ۔

۷- اسلامی سربراہی کانفرنس منعقدہ لاہور کی اہمیت واضح کریں ۔

صحیح جواب کے سامنے کا نشان لگائیں ۔

۸- علاقائی تعاون برائے ترقی کے معاہدہ میں شامل ہیں ۔

(الف) تمام اسلامی ممالک ۔

(ب) پاکستان ، سعودی عرب اور متحدہ امارات ۔

(ج) پاکستان ، ایران اور افغانستان ۔

(د) ترکی ، ایران اور پاکستان ۔

۹- فلسطین کا مسئلہ ۔

(الف) تمام عالم اسلام کا مسئلہ ہے ۔

(ب) عرب ممالک کا مسئلہ ہے ۔

(ج) مصر اور اسرائیل کا مسئلہ ہے ۔

(د) فلسطین کا مسئلہ ہے ۔

۱۰- پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس ۔

(الف) رباط میں منعقد ہوئی ۔

(ب) بن غازی میں منعقد ہوئی ۔

(ج) لاہور میں منعقد ہوئی ۔

(د) کوالالمپور میں منعقد ہوئی ۔

پانچواں باب

اکتسابی جائزہ
EVALUATION

معاشرتی علوم میں اکتسابی جائزہ کا مقصد طلبہ کی ذہنی ، جسمانی ، معاشرتی اور جذباتی ترقی کو جانچنا ہوتا ہے ۔ جائزہ ہمیشہ یہ دیکھنے کے لیے لیا جاتا ہے کہ تدریسی سرگرمیوں سے تعلیمی مقاصد کہاں تک حاصل ہوئے ہیں ۔ جائزہ ایک مسلسل عمل ہے جس کا کام (Function) تعلیم و تعلم کو بہتر بنانا ، نصاب کی اصلاح کرنا اور طلبہ کی انفرادی ضروریات جان کر انھیں پورا کرنا ہوتا ہے ۔ اسی لیے جائزہ تدریس کا لازمی جز ہے ۔ ایک مؤثر جائزہ کے تین پہلو ہوتے ہیں :

تشخیصی جائزہ (Diagnostic Evaluation)

سبق کا آغاز کرنے سے پہلے طلبہ کو کن تصورات اور مہارتوں کا علم ہونا چاہیے ؟ ان کی انفرادی اور گروہی ضروریات کیا ہیں ؟ ان باتوں کا تعین کرنے کے لیے تشخیصی جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے ۔

تشکیلی جائزہ (Formative Evaluation)

دوران تدریس طلبہ کے مسائل اور مشکلات جاننے اور انھیں دور کرنے کے لیے تشکیلی جائزہ لیا جاتا ہے ۔

کلی جائزہ (Summative Evaluation)

کلی جائزہ سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ کسی تدریسی یونٹ کی تکمیل کے بعد تعلیمی مقاصد کس حد تک پورے ہوئے ہیں ۔

اکتسابی جائزہ کے یہ تینوں پہلو تدریسی عمل کا حصہ ہونا چاہئیں :

جائزہ کے طریقے

جائزہ کا بنیادی کام اس بات کا تعین کرنا ہوتا ہے کہ تعلیمی مقاصد کہاں تک حاصل ہوئے ہیں ۔ اس لیے مقصد کی نوعیت کے مطابق جائزہ کے طریقے اختیار کیے جائیں گے ۔ اگر مقصد یہ ہے کہ طلبہ تصورات کو کہاں تک سمجھ سکے ہیں تو اس کا تعین زبانی سوالات پوچھ کر یا تحریری امتحان کے ذریعے کیا جا سکتا ہے ، لیکن اگر مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ طلبہ کس حد تک تنقیدی انداز فکر

سیکھ سکے ہیں تو اس کے لیے مسائل پر بحث کرائی جا سکتی ہے۔ معاشرتی علوم کے اساتذہ جائزہ کے لیے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کر سکتے ہیں۔

استاد کا مشاہدہ

اساتذہ طلبہ کو کام کرتے یا کھیلتے ہوئے دیکھ کر ان کی ترقی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مثلاً اساتذہ طلبہ کو بحث کرتے ہوئے، پڑھتے ہوئے، ڈراموں میں حصہ لیتے وقت، اشخاص یا چیزوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے، سوالات پوچھتے وقت یا مطالعاتی دوروں کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے وقت ان کی دلچسپیوں، رویوں، مہارتوں، جذباتی ہم آہنگی یا ذمہ داریوں وغیرہ کا مشاہدہ کر سکتے ہیں، جن سے طلبہ کی ذہنی، جسمانی، جذباتی اور معاشرتی ترقی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ معاشرتی علوم کے استاد کو چاہیے کہ وہ طلبہ کی ان ترقیوں کو جامع ریکارڈ فارم میں درج کرتا رہے تاکہ اس بات کا تعین ہو سکے کہ کس طالب علم نے کتنی معلومات حاصل کی ہیں اور اس کے کردار میں کون کون سے اوصاف پیدا ہوئے ہیں۔

گروہی مباحثے:

گروہی مباحثوں کا جائزہ لے کر گروہ کے مسائل اور ضروریات کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ گروہی مباحثوں کا جائزہ لیتے وقت اساتذہ کو طلبہ کی انفرادی اور اجتماعی کارکردگی کو فوقیت دینی چاہیے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ طلبہ کی منفی آراء کو نظر انداز کرتے ہوئے انہیں مثبت تجاویز میں بدل دیں اور اپنی ساری توجہ طلبہ کے کام کا جائزہ لینے، ان میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کی صلاحیت کو پرکھنے اور تعلیمی مقاصد کے حصول کے لیے مزید اقدامات پر مرکوز رکھیں۔ یہ کام اساتذہ طلبہ سے "کیوں" "کیسے" "کب" اور "کہاں" جیسے سوالات پوچھ کر کر سکتے ہیں۔

امتحانات:

عام طور پر جائزہ سے مراد وہ امتحان ہوتا ہے جو مقررہ اوقات پر مناسب وقفوں سے طلبہ کی حاصل کردہ معلومات اور مہارتوں کو جانچنے کے لیے لیا جاتا ہے تاکہ طلبہ کی ترقی کی رفتار اور تعلیمی عمل کی کارکردگی کا اندازہ ہو سکے۔ امتحانات یا تو تحریری ہوتے ہیں یا زبانی یا عملی۔ معاشرتی علوم میں طلبہ کی کارکردگی کا جائزہ لیتے وقت امتحانات کی یہ تینوں قسمیں استعمال کی جا سکتی ہیں لیکن سب سے زیادہ مروجہ قسم تحریری امتحان کی ہے۔

تحریری امتحان:

تحریری امتحان میں طلبہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ مقررہ وقت میں چند سوالات کے جواب تحریر کریں۔ تحریری امتحان کی بھی دو قسمیں ہیں:

(۱) مفروضی امتحان۔ (۲) معروضی امتحان۔

۱۔ مفروضی امتحان :

یہ وہ روائتی امتحان ہیں جن میں طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ چند سوالات کے طویل جوابات لکھیں ۔ مفروضی امتحان میں مندرجہ ذیل خامیاں پائی جاتی ہیں :

۱۔ طلبہ کے جوابات کو جانچنے میں ممتحن کی پسند اور ناپسند کو بڑا دخل حاصل ہوتا ہے ۔ اس لیے یہ امتحان طلبہ کی صحیح کارکردگی کو ظاہر نہیں کرتے ۔

۲۔ اکثر اوقات سوالات سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ ممتحن طلبہ سے کیا پوچھنا چاہتا ہے ۔ مثلاً محمود غزنوی کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں ۔ اس سوال سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ محمود غزنوی کی فتوحات کے متعلق یا اس کی سیرت کے متعلق یا اس کے انتظام حکومت کے متعلق پوچھا گیا ہے ۔

۳۔ سوالوں کو بنانا آسان ہے مگر انہیں جانچنا مشکل اور دقت طلب ہے ۔

۴۔ اگر ایک سے زیادہ ممتحن ہوں تو ان کے نمبر لگانے کے معیار میں بڑا فرق ہوتا ہے ۔ جس کے بعض اوقات ذہین طلبہ کم نمبر حاصل کرتے ہیں ۔ اور درمیانے درجے کے طلبہ اچھے نمبر حاصل کر لیتے ہیں ۔

۵۔ سوالات پورے کورس پر حاوی نہیں ہوتے بلکہ چند منتخب اسباق میں سے پوچھ لیے جاتے ہیں ۔

٦۔ طلبہ آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سوالات کس طرح کے ہوں گے اس لیے جوابات رٹ لیتے ہیں ۔

۲۔ معروضی امتحان :

یہ جدید طرز کے امتحان ہیں جن میں طلبہ عام طور پر مختصر جوابات لکھتے ہیں ۔ سوالات کے سامنے ایک لفظ یا چند الفاظ لکھ کر یا مخصوص نشان لگا کر جوابات دیے جاتے ہیں ۔ سوالات کی تعداد معروضی امتحان میں بہت زیادہ ہوتی ہے ۔ معروضی امتحان میں مندرجہ ذیل خوبیاں ہوتی ہیں :

۱۔ ہر سوال کا ایک ہی صحیح جواب ہوتا ہے اس لیے ممتحن کی پسند یا ناپسند طلبہ کی کارکردگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی ۔

۲۔ ہر سوال واضح اور صاف ہوتا ہے اس لیے طلبہ کو جواب دینے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی ۔

۳۔ چونکہ سوالات کے جوابات مختصر ہوتے ہیں اس لیے بہت تھوڑے وقت میں آسانی سے انہیں جانچا جا سکتا ہے ۔

۴۔ سوالات پورے کورس میں سے پوچھے جاتے ہیں اور طلبہ ان کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے ۔

معروضی امتحان کی قسمیں :

معروضی امتحان میں نمبر لگانے کا عمل سائنسی اور ٹیکنیکل ہوتا ہے اس لیے معروضی

استحانات کو مفروضی امتحان کی خامیاں دور کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے ۔ معروضی امتحانات طلبہ کی صحیح تفہیم ، تحصیل علم اور اس سے طلبہ کی شخصیت اور کردار پر مرتب ہونے والے اثرات ، تعلیمی عمل کی وسعت اور گہرائی کے متعلق صحیح معلومات فراہم کرنے میں مدد دیتے ہیں ۔ معروضی امتحان کی مندرجہ ذیل قسمیں ہیں ۔

۱- "صحیح" یا "غلط" جواب والی آزمائش (True False Items)

اس قسم کی آزمائش (Test) میں کچھ بیانات دیے جاتے ہیں جن میں سے کچھ درست اور کچھ غلط ہوتے ہیں ۔ طلبہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ صحیح بیان کے سامنے "درست" یا "ہاں" لکھیں اور غلط بیان کے سامنے "غلط" یا "نہ" لکھیں ۔ مثلاً

۱- کراچی پاکستان کا دارالخلافہ ہے ۔

۲- قائداعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل تھے ۔

۳- کپاس اور چاول پاکستان کی نقد آور فصلیں (Cash Crops) ہیں ۔

۴- رقبہ کے لحاظ سے پنجاب پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے ۔

صحیح اور غلط والی آزمائش میں بعض اوقات طلبہ قیاس آرائی اور تک بازی سے کام لیتے ہیں ۔ صحیح فکر کی رہنائی اور تک بندی کی حوصلہ شکنی کے لیے غلط نشان لگانے والے کو منفی نمبر دیے جاتے ہیں ۔

۲- تکمیل کرنے کی آزمائش (Completion Type Items)

ایسی آزمائشوں میں چند جملے دیے جاتے ہیں ۔ ہر جملے میں خاص الفاظ کی جگہ خالی چھوڑ دی جاتی ہے ۔ طلبہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ سوچ کر ان خالی جگہوں کو مناسب الفاظ سے پر کریں ۔ مثلاً

۱- قرار داد پاکستان ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو - - - - - - میں منظور کی گئی ۔

۲- پاکستان اسلامی - - - - - جمہوریہ ہے ۔

۳- پاکستان کی بنیاد - - - - - نظریہ پر رکھی گئی ۔

۴- پاکستان کے آخری گورنر جنرل اور پہلے صدر - - - - - تھے ۔

۳- باہمی تقابل کی آزمائش (Matching Items)

اس آزمائش میں دو کالم بنائے جاتے ہیں ۔ کالم "الف" میں بیانات لکھے جاتے ہیں اور کالم "ب" میں ان کے جواب بغیر کسی ترتیب کے دیے ہوتے ہیں ۔ طلبہ سے کہا جاتا ہے کہ ہر بیان کا جواب جوابات والے کالم سے ڈھونڈ کر بیان کے سامنے لکھیں :

کالم "الف"	کالم "ب"
قیام پاکستان - - - -	۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء

قائداعظم کی وفات - - - -	۱۴ اگست ۱۹۴۷ء
علامہ اقبال کی پیدائش - - - -	۱۱ ستمبر ۱۹۴۸
قرار داد پاکستان - - - -	۹ نومبر ۱۸۷۷ء

۴- کئی جوابوں میں سے صحیح جواب منتخب کرنے کی آزمائش

اس آزمائش میں ایک بیان کے آگے کئی جوابات درج ہوتے ہیں ، لیکن ان میں سے صرف ایک جواب صحیح ہوتا ہے - طلبہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ ہر بیان کے صحیح جواب پر دائرہ یا " " کا نشان لگا دیں - مثلاً

(الف) مسلم لیگ کے قیام کا سن ہے :

۱- ۱۹۳۰ء -

۲- ۱۸۵۷ء -

۳- ۱۹۰۲ء -

۴- ۱۹۴۷ء -

(ب) لاہور کے تاریخی جلسہ میں قرار داد پاکستان پیش کرنے والے تھے :

۱- رحمت علی -

۲- علامہ اقبال -

۳- مولوی فضل الحق -

۴- لیاقت علی خان -

(ج) پاکستان سب سے زیادہ زرمبادلہ کماتا ہے -

۱- چاول برآمد کر کے -

۲- کپاس برآمد کر کے -

۳- کھیلوں کا سامان برآمد کر کے -

۴- سوتی دھاگہ برآمد کرکے -

(د) مسلم لیگ کے بانی تھے :

۱- قائداعظم محمد علی جناح -

۲- سرسید احمد خان -

۳- نواب سلیم اللہ خان-

۴- نواب بہادر یار جنگ -

۵- مختصر جواب والی آزمائش (Short Easy Type Test)

اس آزمائش میں ایسے سوالات دیے جاتے ہیں جن کا جواب ایک یا چند جملوں میں دینا ممکن ہوتا ہے ۔ مثلاً

۱- تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو کیا فوائد پہنچے ؟

۲- ہندوؤں نے بنگال کی تقسیم کی مخالفت کیوں کی ؟

۳- پاکستان کے وسائل قوت کیا ہیں ؟

۴- دو قومی نظریہ سے کیا مراد ہے ؟

موثر جائزہ کی خصوصیات

ایک موثر جائزہ کی مندرجہ ذیل خوبیاں ہونی چاہئیں :

۱- جائزہ کو تدریسی مقاصد کے عین مطابق ہونا چاہیے ۔

۲- جائزہ کے سوالات اس قسم کے ہونے چاہئیں جن سے ذہین ، درمیانہ درجے اور غبی طلبہ کی کارکردگی کا اندازہ لگایا جا سکے ۔

۳- جائزہ کو تمام کورس پر محیط ہونا چاہیے ۔

۴- سوالات واضح اور عام فہم ہونے چاہئیں ۔ طلبہ کو سوالات کی زبان سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آنی چاہیے ۔

۵- جائزہ کے متعلق ہدایات اچھی طرح دینی چاہئیں ۔

سوالات

۱- اکتسابی جائزہ کی اہمیت اور مقاصد بیان کیجیے ؟

۲- جائزہ کے کون سے مختلف پہلو ہیں ؟

۳- جائزہ میں مشاہدہ کی کیا اہمیت ہے ؟

۴- مفروضی اور معروضی جائزہ میں کیا فرق ہے ؟

۵ مفروضی جائزہ کی کیا خامیاں ہیں ؟

۶- معروضی جائزہ کی خوبیاں بیان کریں ؟

۷- معروضی جائزہ کی کتنی قسمیں ہیں ؟ آپ کس معروضی آزمائش کو امتحان کے لیے پسند کریں گے اور کیوں ؟

۸- اچھے جائزہ کی کیا خصوصیات ہوتی ہیں ؟

۹- جماعت ہشتم کے لیے ایک مفروضی اور ایک معروضی طرز پر پرچہ بنائیے ؟

ختم شد